امریکی تاریخ کے خفیہ اوراق

THE SECRET HISTORY
of the
AMERICAN EMPIRE

by: John Perkins

مصنف: جان پرکنز

مترجم: محمد احسن

امریکی تاریخ کے خفیہ اوراق

جان پرکنز

مترجم: محمد احسن

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار، کراچی

Ameriki Tariekh Kay Khufiya Auraq

By: John Perkins

نام کتاب : امریکی تاریخ کے خفیہ اوراق

اشاعت اوّل : ۲۰۰۹ء

پیشکش : ساجد رحمٰن فضلی

فضلی بک سپر مارکیٹ

نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، کراچی

فون: 2629724 - 2212991 (92-21)

فیکس: 2633887 (92-21)

e-mail: fazleebook@hotmail.com

Website: www.fazleebooks.com

کتاب سرائے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور۔ فون: 7320318 (92-42)

e-mail: hikmat100@hotmail.com

فہرست

حصہ اوّل: ایشیاء

جکارتہ کی جاسوس خواتین

۱۹۷۱ء میں جب ایشیا روانہ ہوا تو لوٹ کھسوٹ کے لئے بالکل تیار تھا۔ اپنی ۲۶ سالہ زندگی کے تلخ تجربات کے باعث میرا یہ ردعمل تھا۔

آج میں ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ میری نفرت میری ملازمت کے حصول کی اصل وجہ تھی۔ ایجنسیوں کے گھنٹوں طویل نفسیاتی امتحانات نے مجھے ایک سفاک معاشی تباہ کار بنا دیا تھا۔ خفیہ جاسوسی ادارے نے یہ بھانپ لیا تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی نفرت کو سلطنت کے گھناؤنے منصوبے میں بھرپور طریقے سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مجھے بین الاقوامی مشاورتی کمپنی چیس ٹی مین نے تیسری دنیا کو لوٹنے والے کارکن کے طور پر بھرتی کیا تھا تاکہ کارپریٹوکریسی کے ناپاک منصوبوں کو مکمل کیا جا سکے۔

میری نفرت کی تفصیلات میری گزشتہ کتاب میں تفصیلاً بیان کی جا چکی ہیں لیکن میں ان کو اپنے قارئین کے لئے مختصراً دوبارہ بیان کر رہا ہوں۔ میں ایک غریب استاد کا بیٹا تھا جو امیر لڑکوں کے درمیان پروان چڑھا تھا۔ میں عورتوں سے بیک وقت خوفزدہ اور مرعوب بھی رہا کرتا تھا نتیجتاً ان سے کتراتا تھا۔ صرف والدین کی خواہش کے باعث میں نے ایک ایسے کالج میں تعلیم حاصل کی جو مجھے سخت ناپسند تھا۔ میری پہلی باغیانہ حرکت کالج چھوڑنا اور ایک اخبار میں اپنی پسند کی ملازمت اختیار کرنا تھا اور بعد میں بزدلوں کی طرح واپس کالج لوٹنا تھا۔ میں نے انتہائی کم عمری میں شادی کر لی تھی اور وہ بھی محض اس لئے کیونکہ جس لڑکی نے بالآخر مجھے قبول کیا تھا اس کی خواہش تھی کہ ہم جلد سے جلد شادی کر لیں۔ میں نے تین سال امیزون اور انڈیز کے جنگلات میں رضا کار تنظیم کے کارکن کے طور پر گزارے تھے۔

میں اپنے آپ کو ایک سچا اور وفادار امریکی گردانتا تھا اور یہ بھی میری نفرت کی ایک انتہائی اہم وجہ تھی۔ میرے آباؤاجداد انقلاب امریکہ اور کئی اور امریکی جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ میرا خاندان رجحانات کے اعتبار سے قدامت پسند ری پبلکن تھا۔ میں پینی اور جیفرسن جیسے عظیم

کرداروں کے بارے میں مطالعہ کرتا ہوا جوان ہوا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ قدامت پسند ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو ہمارے ملک کے بنیادی تصور یعنی انسان اور مساوات پر کامل یقین رکھتا ہو۔ میں ویتنام میں اپنوں کی غداریوں اور تیل کی کمپنیوں کے ساز باز کے معاملات کو ملکی بربادی کا سبب سمجھتا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ کس طرح امیزون کے جنگلات کو برباد کیا جارہا ہے اور یہاں کے باشندوں کو غلام بنا کر استحصال کی نئی تاریخ رقم کر جارہی ہے۔

میں اپنے ان عقائد کو بالائے طاق رکھ کر معاشی تباہ کار کیوں بنا تھا؟ اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ملازمت میرے تمام ادھورے خواب جیسے کہ دولت، طاقت، خواتین اور خوبصورت مقامات کے اعلیٰ درجے کے سفری تجربوں کو پورا کر سکنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جبکہ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مجھے خلاف قانون کچھ نہیں کرنا ہوگا بلکہ اگر میں اپنا کام مہارت سے انجام دوں گا تو میری تعریف وتوصیف بھی کی جائے گی۔ آئیوی لیگ کے اسکولوں میں خطاب کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا جاتا تھا اور شاہانہ ضیافتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اندر ہی اندر میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ یہ سفر خطروں سے گھرا ہوا ہے، مگر میرا خیال تھا کہ میں ایک مثال بن سکتا ہوں۔ جب میں ایشیا جارہا تھا تو میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ میں اس سارے کھیل سے کچھ عرصے تک فائدہ اٹھاؤں گا اور پھر اس سارے نظام کو بے نقاب کر کے ہیرو بن جاؤں گا۔

مجھے بہت کم عمری میں مہم جوئی سے بھرپور زندگی گزارنے کی آرزو تھی مگر میں نے اس کے برعکس کافی مختلف زندگی گزاری، ہمیشہ دوسروں کی خواہشات کا احترام کرتا رہا۔ مگر اس ملازمت کو حاصل کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ وقت کھیل کھیلنے کا ہے اور انڈونیشیا میرا پہلا شکار تھا۔

سترہ ہزار سے زائد جزائر پر مشتمل انڈونیشیا جنوب مشرقی ایشیاء سے لے کر آسٹریلیا تک پھیلا ہوا دنیا کا سب سے بڑا آرکی پیلاگو (سمندر جس میں جزیروں کا جھنڈ ہو) ہے، ایسا ملک جہاں پر تین سو نسلی گروہ اور ڈھائی سو زیادہ منفرد زبانیں بولنے والے باشندے آباد ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑی مسلمان آبادی (تقریباً ۲۰ کروڑ) کا حامل ملک ہے۔ ۱۹۶۰ء کے اختتام تک ہم یہ بات جان چکے تھے کہ انڈونیشیا تیل سے مالا مال ہے۔

۱۹۶۳ء میں جنوبی ویتنام کے نگوڈین ڈیئم کے خلاف تختہ الٹنے کی سازش میں ملوث ہو کر جان ایف کینیڈی نے ایشیا کو کمیونسٹ مخالف طاقتوں کا گڑھ بنادیا تھا۔ ڈیئم کو بعد میں قتل کردیا گیا

تھا اور کافی لوگوں کو یہ ماننا پڑا تھا کہ وہ سی آئی اے کی کارستانی تھی کیونکہ اس سے پہلے سی آئی اے ایران کے مصدق، عراق کے قاسم، وینزویلا کے اربنیز اور کانگو کے لومبا کے تختے الٹ چکے تھے۔ ڈیئم کی معزولی جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی جنگی قوتوں کی مضبوطی کا آغاز تھا جو بالآخر ویتنام جنگ میں کام آئی تھیں۔

واقعات کا رُخ کینیڈی کی خواہشات کے مطابق روپ نہ دھار سکا تھا۔ کینیڈی کے قتل کے طویل عرصے بعد ویتنام کی جنگ امریکہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں رچرڈ نکسن نے فوجوں کی مرحلہ وار واپسی کا آغاز کردیا تھا، نکسن کی انتظامیہ نے دوسرے ملکوں کو کمیونسٹ جال میں پھنسنے سے بچانے کے لئے خفیہ حکمت عملی ترتیب دی تھی اور انڈونیشیا اس کا کلیدی کردار کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

انڈونیشیا کے صدر حاجی محمد سوہارتو اس کھیل کے مرکزی کردار تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک مضبوط کمیونسٹ مخالف اور اپنی حکمت عملیوں کو انتہائی سفاکیت سے نافذ کرنے والے حکمران کے طور پر تسلیم کروالیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اس نے کمیونسٹ قوتوں کی بغاوت کو شدت سے کچل ڈالا تھا جو صدی کے بدترین قتل عام کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں تین سے پانچ لاکھ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس قتل عام نے ہٹلر، اسٹالن اور ماوزے تنگ کی یاد تازہ کردی تھی۔ ایک اور اندازے کے مطابق قریباً دس لاکھ افراد جیلوں اور عقوبت خانوں میں بند کردیے گئے تھے اور وسیع پیمانے پر قتل عام اور گرفتاریوں کے اس سلسلے کے نتیجے میں ۱۹۶۸ء میں سوہارتو نے اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔

۱۹۷۱ء میں جب میں انڈونیشیا پہنچا تو امریکی خارجہ پالیسی کے مقاصد واضح تھے۔ کمیونزم کو روکو اور غاصب صدر کی حمایت کرو۔ ہم سوہارتو سے شاہ ایران جیسی خدمات کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ یہ دونوں سربراہان لالچی، مغرور اور سفاک تھے۔ انڈونیشیا سے تیل ہتھیانے کے علاوہ ہم اسے باقی ماندہ ایشیا اور مسلم دنیا کے لئے ایک عبرت بنادینا چاہتے تھے۔

میری کمپنی ''مین'' کو ترقیاتی اور بجلی کا مکمل نظام تیار کرنے کا منصوبہ سونپا گیا تھا تاکہ سوہارتو اور اس کے بہی خواہ صنعتی عمل تیز کر کے مزید امیر ہو جائیں اور خطے میں امریکی بالادستی کو طول دے سکیں۔ میرا کام یہ تھا کہ ایسی معاشی تحقیقی رپورٹیں جاری کروں جس کی بنیاد پر عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک اور امریکن ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی سے قرضے حاصل کیے جاسکیں۔

جکارتہ پہنچنے کے چند دن بعد ہی ''مین'' کی جماعت ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں جمع ہوئی۔ ہمارا پروجیکٹ منیجر نے مختصراً ہمارے انڈونیشیا میں قیام کا مقصد بیان کیا کہ ہم یہاں پر اس ملک کو کمیونزم کے شکنجے سے بچانے کے لئے موجود ہیں ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ہمارا اپنا ملک تیل پر کس قدر انحصار کرتا ہے اور انڈونیشیا اس سلسلے میں ہمارا طاقتور حلیف ثابت ہوسکتا ہے۔ جیسے آپ لوگوں نے یہ منصوبہ تیار کیا ہے تو اب آپ لوگوں کو ہر حال میں اس امر کو یقینی بنانا ہوگا کہ تیل کی صنعتیں، بندرگاہیں، پائپ لائنیں اور تعمیراتی کمپنیاں وہ سب کچھ طویل المدت تک کیلئے حاصل کرسکیں جو بجلی کے نظام کے عوض میسر آسکیں۔

ان دنوں جکارتہ کے زیادہ تر سرکاری دفاتر صبح سات بجے کھلتے تھے اور دوپہر دو بجے تک بند ہوجایا کرتے تھے۔ ان کے ملازمین کافی چائے اور دیگر لوازمات کے لئے وقفہ کیا کرتے تھے اور دوپہر کے کھانے کو چھٹی کے بعد تک کے لئے موقوف کردیتے تھے۔ میں نے ان دنوں ہوٹل کے سوئمنگ پول کے کنارے لنچ کرتا، امریکی ملازمین کی بیویوں کی تیراکی سے لطف اندوز ہوتا۔ میں نے جلد ہی ایک ہم عمر ایشیائی امریکی نسل کی خاتون سے جان پہچان بڑھالی تھی جو غیر معمولی طور پر دوستانہ تھی۔ روزانہ چار بجے اس سے ملنے ایک جاپانی آیا کرتا تھا۔ وہ بزنس سوٹ میں ملبوس ہوتا تھا جو ایک ایسے ملک میں کافی خلاف معمول محسوس ہوا کرتا تھا جہاں لوگ رسمی ملاقاتوں کے لئے بھی پینٹ شرٹ پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تک بات چیت کیا کرتے تھے اور پھر اکٹھے کہیں روانہ ہوجایا کرتے تھے۔ اگرچہ میں نے ان کی تلاش میں ہوٹل اور ریستورانوں کو چھان مارا تھا مگر کبھی انہیں ماسوائے پول کے کہیں اور اکیلے یا اکٹھے نہ دیکھ سکا تھا۔ ایک دن میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں آج ہر حال میں اس عورت سے بات کروں گا لیکن مجھے اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب میں تمام تر کوششوں کے باوجود اس کو سوئمنگ پول کے کنارے نہ ڈھونڈ پایا جہاں وہ روز مجھ سے ملا کرتی تھی۔ میں نے بیروں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن میری تمام تر کوششیں رائیگاں ثابت ہوئی تھیں۔ میں نے سہ پہر چار بجے اس جاپانی مرد کی بھی راہ دیکھی جو روز اس سے ملنے آیا کرتا تھا لیکن بے سود۔ میں سخت مایوسی کی حالت میں کمرے میں لوٹ آیا اور نہا دھوکر ہوٹل سے باہر نکل آیا تا کہ اپنے آپ کو مقامی ماحول میں غرق کردوں۔

باب نمبر:۲

کوڑھیوں کو لوٹنا

وہ جکارتہ کی ایک شام تھی گرم اور مرطوب، کالے بادل فضا میں بارش کی نشاندہی کررہے تھے۔ میں اپنی جیپ کے علاوہ ہوٹل سے قدم باہر نہیں نکالا کرتا تھا لیکن اس دن میں پیدل ہی چل پڑا تھا۔ میں جیسے ہی ہوٹل کی پارکنگ سے باہر آرہا تھا تو میں یکا یک تین پہیوں والی بائی سائیکل ٹیکسی سے روندتے روندتے بچا۔ دیواروں پر لگی بڑی بڑی تصویروں کو جب میں دفتری کاموں کے دوران جاتے ہوئے دیکھتا تھا تو میرے ذہن میں انڈونیشیا کا ایک خاص خاکہ ابھرتا تھا کہ انڈونیشیا فنکاروں کی سرزمین ہے مگر اچانک اس ٹیکسی کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس ملک کا ایک دوسرا پہلو میرے سامنے آیا جس میں' میں نے ٹیکسی کے نہایت مفلس ڈرائیوروں کو گاہکوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے جھڑپ کرتے پایا۔ وہ میری طرف سائیکل کی گھنٹیاں بجاتے چلے آرہے تھے تاکہ میری توجہ حاصل کرسکیں۔ ان سے بچنے کی کوشش میں' میں قریب ہی ایک گٹر میں گرتے گرتے بچا۔

جکارتہ کے گٹر ان نہروں میں جاگرتے ہیں جو ولندیزیوں نے نوآبادیاتی دور میں تعمیر کئے تھے لیکن اب وہ نہریں کائی سے ڈھکی ہوئی ہیں اور ان سے اٹھنے والی بو ناقابل برداشت ہے۔ عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے کہ وہ ذہین لوگ جنہوں نے دریا کو کھیتوں میں بدل دیا تھا انڈونیشیا کے اس شدید گرم خطے میں ایمسٹرڈیم بنانے کی کوشش کیسے کرسکتے ہیں۔

میں ٹیکسی کے ہجوم میں بچتا بچاتا چلتا رہا۔ مرکزی سڑک پر گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا جم غفیر موجود تھا۔ شور مچاتے ہارن، گڑگڑاتے انجن اور گلا پھاڑتی گاڑیاں اور مرطوب فضا میں گٹر سے اٹھتے بھبکے میرے حواسوں پر سوار ہورہے تھے۔

میں ایک لمحے کے لئے ہار مان کے بیٹھ گیا تھا۔ میں گھبرا کر اپنے ہوٹل کے آرام دہ ماحول میں واپس لوٹنا چاہتا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں ایمیزون کے جنگلات برداشت کرچکا تھا اور آنڈیز کے کسانوں کے ساتھ ان کی تنگ جھونپڑیوں میں وقت گزار چکا تھا جو اپنا پورا دن ایک آلو اور پھلی کے چند دانوں پر گزارہ کرتے تھے۔ میں اپنے باقی ماندہ امریکیوں کے بارے میں سوچا

کرتا تھا جو ان ملکوں کو ان کی غربت کی وجہ سے سیاحت کے لئے ناموزوں سمجھا کرتے تھے اور حسین اور امیر ملکوں کے سفر پر روانہ ہوا کرتے تھے۔ جب میں امن مشن میں رضا کار کی حیثیت سے ان غریب لوگوں کے درمیان تھا تو کس طرح انہوں نے اپنے دل میرے لئے کھولے تھے، کس طرح وہ اپنے محدود وسائل میرے ساتھ خوش دلی سے بانٹا کرتے تھے اور کس طرح مجھ پر پیار لٹایا کرتے تھے۔ ان تمام یادوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں جکارتہ کی ڈھلتی رات میں سر راہ اکیلا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا میں واقعی ایک لٹیرا بن کر رہ گیا ہوں۔ کیا میں واقعی ان ٹیکسی ڈرائیور، ان مردوں اور عورتوں کو لوٹ سکتا تھا جو دن رات اس عالیشان ہوٹل میں میری خدمت پر مامور رہتے تھے؟ ان کسانوں، مچھیروں کو دھوکہ دے سکتا تھا جن کے ساتھ میں نے ان کے کھیتوں میں کاشت کی تھی؟ رابن ہڈ کی طرح امیروں کو لوٹنا الگ بات ہے۔ اور غریبوں کو ہوس کا نشانہ بنانا ایک بالکل مختلف بات ہے لیکن مجھے ایسا ہی کرنے کے احکامات ملے تھے کہ میں غریبوں کو لوٹوں اور امیروں کو نوازوں اور اس ساری بددیانتی کے عوض بھاری کمیشن وصول کروں؟ کیا میں یہ کرسکتا تھا؟ میری کمپنی کا منیجر اور باقی تمام ارکان کیسے اپنے ضمیر کو مطمئن کر پاتے ہوں گے؟

اس ایک لمحے میں مجھے اپنی ذاتی ذمہ داری کا احساس ہوا تھا۔ ایکواڈور میں گزارے چند سالوں نے مجھے ایک مختلف نقطہ نظر عطا کیا تھا جو ملازمت پیشہ اور ٹیکس جمع کرانے والے عام شہریوں کو عموماً نہیں مل پاتا۔ نہ جانے یہ خیالات نعمت تھے یا زحمت جو صرف کچھ خوش قسمت امریکیوں کے حصے میں آئے تھے۔ سب نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے بہانے تراش لیے تھے۔ کچھ لوگ کیمونسٹوں سے لڑ رہے تھے، کچھ لوگ نفع کھا رہے تھے۔ اور کچھ کے نزدیک ان کے بیوی بچے ہی سب سے پہلے ہیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ باقی تمام انسانی نسلیں اور گروہ اتنے پسماندہ ہیں کہ یہ بدقسمتی ہی ان کا مقدر ہونا چاہیے۔ کچھ معصوم یہ بھی مانتے ہیں کہ بجلی کے وسیع منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے دنیا کے مسائل کا خاتمہ ہوجائے گا مگر نہیں۔ میرا ضمیر کیسے اطمینان حاصل کرتا؟ میں ایک ایسا جوان آدمی تھا جو یکدم بوڑھا ہو گیا تھا۔

میں اس بدبودار نہر کو گھور رہا تھا۔ کاش میرے پاس اس وقت ٹام پینی کی مشہور زمانہ کتاب ''کامن سینس'' (Common Sense) کا ایک نسخہ ہوتا تو میں اسے ان گندے پانیوں میں دے مارتا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک بڑا اور خستہ حال گتے کا بوسیدہ ڈبہ تھا۔ میں نے غور سے

دیکھا تو وہ مجھے کوئی شدید زخمی جانور لگا۔ میں نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا مگر اس سے پہلے کہ مڑتا مجھے ایک بازو کی جھلک دکھائی دی جو بالکل زخمی تھا اور اس گتے کے ڈبے میں سے نکل رہا تھا۔ پھر مجھے ایک کوڑھی عورت نظر آئی جس کا جسم میری آنکھوں کے سامنے گلتا سڑتا محسوس ہوا۔ میں کانپنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے عجیب عجیب چیزیں اپنے اردگرد گھومتی محسوس ہونے لگیں۔ میں اپنے آپ کو بے حد کمزور اور نحیف محسوس کر رہا تھا۔ مجھے مستقل اس کے کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ آواز میرے اندر سے آ رہی تھی۔ میری ٹانگیں ہل رہی تھیں، میں بھاگ کر ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہ کر پایا۔ دراصل مجھے اس کوڑھی عورت کی تکلیف کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میں اس منظر سے بھاگ نہیں سکتا تھا، یہ کوڑھی عورت جانے اس اذیت سے دن میں کتنی بار دوچار ہوتی تھی اور نہ جانے کتنی اور تنہا روحیں اس عذاب سے یہاں جکارتہ، انڈیا اور افریقہ میں روز گزرتی ہوں گی۔

وہ کوڑھی ڈبے کے اندر سے گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ہونٹ غائب تھے اور بدنما پھوڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے اس کی ڈوبتی آنکھوں کا تعاقب کیا۔ ڈبے سے ذرا ہٹ کر ایک بچے کا سر نمودار ہوا۔ میں اس خوفناک منظر سے نظریں پھیرنا چاہ رہا تھا لیکن میں اس شخص کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا جو کسی کو قتل ہوتا دیکھ لیتا ہے۔ وہ بچہ اس کوڑھی عورت کی طرف رینگ رہا تھا۔ وہ کوڑھی سے ذرا دور بیٹھ کر گلا پھاڑ کر رونے لگا۔ مجھے اس کے رونے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی یا تو اس بچے کی آواز بہت کمزور تھی یا پھر ٹریفک کا شور بہت زیادہ تھا مگر میں صرف ایک روتا چیختا بچہ دیکھ رہا تھا۔

اچانک وہ کوڑھی عورت اٹھی۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اس نے زمین پر تھوکا، اپنا خونی جسم کو زور سے جھٹکا اس بچے کو بازوؤں میں تھاما اور تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی اور میں اس مقام کو کھڑا گھورتا رہا جہاں کچھ دیر پہلے وہ کوڑھی تھی۔

میں نے اس گتے کے ڈبے پر دوبارہ نظر ڈالی۔ وہ وہیں ساکت پڑا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر جاؤں اور اپنے بٹوے میں موجود تمام پیسے اس کے ہاتھ میں تھمادوں مگر مجھے وہاں پڑا کپڑے کا ایک چیتھڑا دکھائی دیا جو وہ کوڑھی عورت مجھ سے دور بھاگنے کی جلدی میں وہاں گرا گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ نجانے وہ کس حالت میں ہے اس لیے اسے تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں جلدی سے سامنے والے پل پر چڑھ گیا تھا بغیر یہ سوچے کہ یہ مجھے کہاں لے جائے گا۔

سورج اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ڈوب رہا تھا۔ گہرے بادل عجیب سا ماحول بنا رہے تھے میں جب پل کے اوپر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ سامنے بڑے سے نیون سائن پر انگریزی میں ''ریسٹورنٹ'' لکھا ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں اترنے لگا۔ پل کی سیڑھیوں پر ایک کال گرل مجھے اپنی طرف متوجہ کرانے کے لئے بھدے اور نازیبا حربے استعمال کر رہی تھی میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

بہت سی اسٹریٹ لائٹس پھڑ پھڑا کر جل رہی تھیں۔ پیلی روشنی نے پوری جگہ کو دھندلا سا کر دیا تھا۔ میں ان میں سے ایک کھمبے کے کنارے رک گیا اور سوچنے لگا کہ بجلی کی طلب کے حوالے سے رپورٹ مرتب کرنے کے لئے مجھے ایسے تمام عوامل کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ سیمنٹ کا ستون جا بجا اکھڑا ہوا تھا اور ٹوٹ پھوٹ کا بھی شکار تھا۔

میں اپنے پیروں پر نظریں جمائے چلا جا رہا تھا۔ پل بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ میں پل کے بارے میں سوچنے لگا اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کو کس نے بنایا ہوگا اور پھر میرا ذہن اس طرح کے کئی سوالات سے الجھ گیا۔ پھر میں سوئمنگ پول کے کنارے والی خوبصورت عورت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنی ساری بدصورتوں کے درمیان اس کے خیال نے مجھے تھوڑی سی راحت دی۔ میں اس کے خیال کو جھٹک نہیں سکا مجھے بار بار یہ خیال تنگ کرتا تھا کہ مجھے کسی سے محبت ہوئی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس حماقت بھرے خیال سے آزاد کیا۔

میں نے نظر اٹھائی تو احساس ہوا کہ میں چلتا چلتا پل کی دوسری جانب آ گیا تھا۔ ''ریسٹورنٹ'' کا سائن بالکل میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے نیچے چائنیز کھانوں کا بورڈ آویزاں تھا۔ اچانک کہیں سے ایک کالی سیڈان نمودار ہوئی جو امریکی سفارت خانے میں استعمال ہوا کرتی ہے۔ وہ ریسٹورنٹ کے عین سامنے آ کر رک گئی۔ اس رش والے متوسط علاقے میں ایسی شاندار گاڑی کافی عجیب معلوم ہو رہی تھی۔

باب نمبر:۳

جاپانی رقاصائیں

میں پل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ سیڈان دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ وہ کچھ دیر وہاں رکی رہی اور پھر اس کا انجن آن ہوا۔ میرے خیال میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس علاقے کا ماحول پسند نہ آیا تھا یا شاید وہ جس شخص کو ڈھونڈ رہے تھے وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر ریسٹورنٹ کے نیون سائن کے عکس کی وجہ سے کچھ دیکھ نہ پایا اور اچانک ڈرائیور نے گاڑی وہاں سے تیزی سے ہٹا لی۔

جب میں ریسٹورنٹ کے پاس پہنچا تو اندرونی ماحول مہین پردوں سے دھندلایا ہوا تھا میں نے شیشے سے چہرہ لگا کر جھانکا تو اندھیرا چھایا ہوا تھا ماسوائے چند جلتی بجھتی روشنیوں کے جو موم بتیاں تھیں۔ میں اندر داخل ہونے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تو اندھیرے کمرے میں ہر میز پر موم بتیاں روشن تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہاں ایشن، یورپین اور امریکی نسل کے مہمان موجود ہیں۔

ایک چائنیز خاتون نے جھک کر میرا استقبال کیا اور مجھ سے کھانے کا دریافت کیا۔ اس کے لب و لہجے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے انگریزی انگریز استاد سے سیکھی ہے۔ وہ مجھے اندر کے کمرے میں لے گئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گیا۔ اندر وہی سوئمنگ پول والی خاتون ایک اور ایشیائی خاتون کے ساتھ میز پر بیٹھی ہوئی مجھے گھور رہی تھی۔ پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ویٹرس مجھے اس کی میز پر لے گئی اور وہاں جا کر اس سے پوچھنے لگی ''کیا آپ لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں؟''

سوئمنگ پول والی خاتون نے بغیر جھجکے کہا ''جی ہاں! کیا آپ ہمارے ساتھ بیٹھنا پسند کریں گے؟'' ویٹرس نے میرے لئے خالی کرسی کھسکائی، جھک کر سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ میں نے پوچھا ''آپ کے شوہر کہاں ہیں؟''

دونوں خواتین ایک دوسرے کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں اور پھر سوئمنگ پول والی خاتون نے قہقہہ لگا کر کہا ''میں شادی شدہ نہیں ہوں۔''

میں نے یکدم پوچھا ''مگر وہ جو پول پر آپ سے ملنے آتے تھے۔''

''وہ میرے کاروباری معاملات دیکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا ''تشریف رکھئے، ہم نے آرڈر دے دیا ہے، ہم تینوں کے لئے کافی ہوگا یا آپ نے اکیلے کھانا کھانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟'' وہ نہایت شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

میں بیٹھ گیا، میں دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر کافی پرمسرت تھا لیکن ایک اور احساس یہ بھی تھا کہ جیسے میں کچھ غلط کررہا ہوں۔ ایک بیرا آیا اور میرے سامنے ایک کپ لاکر رکھ دیا۔

پول والی خاتون نے چینی سے بنے برتن کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اوہ! ہم کافی شراب پی چکے ہیں۔ ہم آج رات خوب تفریح کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میرا کپ بھی بھر دیا اور ہم تینوں نے اپنے کپ ٹکرائے اور اور وہ اپنے ہونٹ پونچھنے لگی اور پھر وہ مخاطب ہوئی ''کس قدر بدتمیزی ہے؟ ہم نے اپنا تعارف بھی نہیں کروایا۔ میں نینسی ہوں اور یہ میری۔''

''اور میں جان!'' یہ کہہ کر میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''جان! میں نے آپ کو پول پر دیکھا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپ اپنا تعارف کروانے میں پہل کریں گے۔ آپ کافی تنہا محسوس ہوتے تھے لیکن پھر میں نے سوچا کہ شاید آپ بے حد شرمیلے ہیں یا پھر ......'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی اور پھر بولی ''اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔''

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا ''طلاق بھی تو ہوسکتی ہے۔''

میری بولی ''یہ جام ٹوٹتے رشتوں کے نام ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا۔ وہ بھی نینسی کے انداز میں بات کررہی تھی لیکن آواز قدرے بھاری تھی۔

اتنی دیر میں بیرا کھانوں سے لبالب پلیٹیں لے کر آگیا۔ کھانے کے دوران ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ نینسی اور میری نے مجھے یہ بتا کر حیران کردیا کہ وہ دونوں رقاصائیں ہیں۔ میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں سوچتا تھا کہ وہ زمانہ گزرے کافی وقت ہوچکا جب یہ کام ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ غلطی پر ہیں، میری نے بتایا ''تیل نے اس گزرے دور کی یاد تازہ کردی ہے، اب اس فن کی طرز کچھ بدل گئی ہے مگر یہ فن اب بھی زندہ ہے۔''

ان دونوں کی تائیوان نژاد ماؤں کو ان کے باپوں نے چھوڑ دیا تھا جو امریکی فوجی تھے جو یہاں جنگ عظیم دوئم کے دور میں تعینات تھے۔ ان کی ماؤں نے دونوں نومولود بچیوں کو ایک جاپانی

تاجر کو دے دیا تھا جس نے ان کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ لیا تھا اور اسی نے انہیں انگریزی، امریکی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں سکھایا تھا۔ جب یہ دونوں بالغ ہوگئیں تو انہوں نے اس تاجر کے لئے کام شروع کردیا تھا۔

نینسی نے باہر پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''تم نے ان کال گرلز کو باہر سڑک پر یقیناً دیکھا ہوگا۔ وہ ہم بھی ہوسکتی تھیں لیکن ہم خوش نصیب نکلیں۔'' انہوں نے مجھے مزید بتایا کہ جاپانی تاجر انہیں ان کے کام کے عوض اچھی رقم دیتے ہیں اور بہت ہی کم انہیں احکامات جاری کئے جاتے ہیں۔ وہ پھر بولی ''وہ صرف من پسند نتائج دیکھنا چاہتے ہیں، بس اب باقی ہم پر ذمہ داری ہوتی ہے کہ ہم وہ کیسے حاصل کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مزید شراب انڈیل لی۔

میں نے پوچھا ''کس طرح کے نتائج؟''

میری بولی ''کتنے معصوم ہیں آپ؟ لگتا ہے نئے آئے ہیں؟''

میں نے اعتراف کیا کہ یہ میرا پہلا دورہ ہے اور میں بہت کچھ سیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔ نینسی نے دعویٰ کیا ''ہمیں آپ کو نئی چیزیں سکھا کر کافی خوشی ہوگی۔ آپ ہماری اس بدصورت دنیا میں قدرے بہتر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

جب وہ دونوں مجھے بتا رہی تھیں کہ طاقتور لوگ کس طرح اپنی دولت کے ذریعے دنیا کے وسائل اور اقتدار پر قبضے کی کوششیں کرتے ہیں وہ رقاصائیں کم اور کالج پروفیسرز زیادہ معلوم ہورہی تھیں۔ میں ان کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوا تھا یا پھر وہ شراب کے نشے میں سچ بول رہی تھیں لیکن تمام باتیں ہوش وحواس میں کی گئی معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے مجھے یورپی سیاحوں کے دور میں مرچوں کی تجارت اور صدیوں سے ہونے والے سونے کے کاروبار کی اہمیت سے آگاہ کیا۔

نینسی نے واضح کرتے ہوئے کہا ''آج ان دونوں چیزوں کی جگہ تیل نے لے لی ہے۔ دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ۔ آج کل ہر چیز کا انحصار اس پر ہے۔ تو کیا یہ کوئی حیران کن بات ہے کہ طاقتور لوگ اس کی ہوس میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں؟ وہ دھوکہ دیتے ہیں، چوری کرتے ہیں، جہاز اور میزائل بناتے ہیں اور ہزاروں لاکھوں فوجیوں کو تیل کے لئے مرنے مارنے کے لئے جنگوں میں جھونک دیتے ہیں۔''

میں نے دریافت کیا ''کیا یہ سب کچھ آپ لوگوں نے تاریخ کی کتابوں سے سیکھا ہے؟''

وہ بناوٹی انداز میں ہنس پڑیں اور بولیں ''جی نہیں! یہ ہمیں تلخ زندگی نے سکھایا ہے۔''

مگر میں منیجر اور اس کی تقریر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے پہلی رات ہوٹل میں کی تھی جس میں اس نے بتایا تھا کہ ہمارے انڈونیشیا آنے کا مقصد اس کو کمیونزم سے بچانا اور امریکہ کے لئے تیل حاصل کرنا ہے۔ پھر میری سوچ کا رخ بوسٹن کی کلاڈین کی طرف مڑ گیا تھا جس نے مجھے ''معاشی تباہ کار'' کی حیثیت سے تربیت دی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ بھی بالکل ایسی ہی تھی جیسے میرے سامنے بیٹھی یہ خواتین ہیں۔

میں نے نینسی سے پوچھا ''آپ کا کردار کیا ہے؟''

وہ بولی ''ہم ان فوجیوں کی طرح ہیں جو بے حد ضروری ہیں مگر ضائع بھی کئے جا سکتے ہیں۔ ہم بادشاہ کی خدمت کرتے ہیں۔'' میں نے پوچھا ''بادشاہ کون ہے؟''

نینسی نے میری کی طرف دیکھ کر کہا ''ہمیں نہیں پتہ! لیکن جو بھی ہمارے مالک کو زیادہ قیمت ادا کردے۔'' ''جیسے وہ پول والا آدمی۔'' وہ صرف رابطے بنانے والا ہے، اصل مالک نہیں۔ ''صرف گاہکوں سے ملواتا ہے۔''

میں نے دفعتاً پوچھا ''کہاں؟۔''

کنٹری کلبس، کروز جہاز، ہالی ووڈ، ہانگ کانگ، لاس ویگاس، تیل کے سوداگران اور سیاستدان جہاں کہتے ہیں ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں۔''

میں دونوں کو دیکھنے لگا دونوں بہت کم عمر اور مادیت سے بھرپور محسوس ہو رہی تھیں۔ میں چھبیس سال کا تھا۔ ان کی کہانیوں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندازاً بیس سال کی ہوں گی۔ میں نے پوچھا ''آپ کے گاہک کون لوگ ہیں؟''

نینسی نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا ''نہیں دوبارہ کبھی یہ سوال نہیں پوچھنا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بالکل اس خوفزدہ خرگوش کی مانند لگ رہی تھیں جو دور بھونکتے کتوں سے ڈر جایا کرتے ہیں۔

باب نمبر:۴

ایک بگی

میں اگلے چند سالوں میں تواتر سے انڈونیشیا آتا جاتا رہا۔ عالمی بینک اور دیگر مالیاتی ادارے، انڈونیشیا کے لئے بھاری قرضوں کے حصول میں مین کی کارکردگی سے بے حد خوش تھے۔ حکومتی ذمہ داران کو اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ یہ قرضے ملک کو کس قدر مقروض کر دیں گے۔ جہاں تک سوہارتو کا تعلق تھا وہ سمندر پار اپنی خوش نصیبی کا بیج بو کر اپنے آپ کو محفوظ بنا رہا تھا۔

نئی ذمہ داریاں مجھے جاوا کے پہاڑوں، دور دراز ساحلوں اور حسین جزیروں تک لے گئیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد ماہرین لسانیات نے ایک زبان، بہاسا انڈونیشیا ایجاد کی، جس کا مقصد ان پھیلے ہوئے جزیروں کو متحد رکھنا تھا۔ رضا کار تنظیم نے مجھے کسانوں، مچھیروں، طالب علموں، دکانداروں اور سڑکوں پر کھیلتے لڑکوں سے ملنے کی ترغیب دی اور اسی وجہ سے مستقل اس احساس جرم میں مبتلا رہا جو میرے جیسے لوگوں کی وجہ سے انڈونیشیا کی اکثریتی آبادی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

جب میں جکارتہ میں تھا تو اپنا زیادہ تر وقت ہوٹل کے سوئمنگ پول پر گزارتا تھا۔ اور بہت سی خواتین کو پول کے اردگرد دیکھتا تھا ان میں سے ایک تھائی خاتون سے میری اچھی بات چیت تھی تھائی خاتون نے مجھ سے دوستی کچھ حاصل کرنے کے لئے نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی اور نے مجھے استعمال کرنے کے لئے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اسی نے مجھے اعلیٰ درجے کی بین الاقوامی تجارت اور سفارتکاری کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ جب آپ خواتین کے ساتھ تنہا موجود ہوں تو ہمیشہ خفیہ کیمروں اور ٹیپ ریکارڈز کے لئے تیار رہنا کیونکہ جو نظر آتا ہے وہ ہمیشہ ویسا ہوتا نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ دنیا کے بڑے بڑے کاروباری معاملات طے کرنے میں اس کی جیسی عورتیں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔

اپنا پہلا مشن مکمل کرنے کے دو سال بعد مجھے انڈونیشیا کے صوبے بورنیو کے دور دراز جزیرے سولاویسی پر تین ماہ کے لئے بھیجا گیا۔ اس جزیرے کو دیہی ترقی کے نمونے کے طور پر پیش کرنے کے لئے چنا گیا۔ ہم امریکی اس کو معدنی ذخائر، جنگلات اور زرعی صنعتوں کی آماجگاہ

کے طور پر دیکھ رہے تھے۔قومی الجثہ کارپوریشنز اس علاقے کے سونے، تانبے کے ذخائر اور جنگلات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ایک امریکن کمپنی نے ہزاروں ایکڑ پر مشتمل جنگلات خریدے، کاٹے اور بیچ دیے۔سولاویسی کو حکومت نقل مکانی کے بنیادی منصوبے کے طور پر اہمیت دیتی ہے۔اس منصوبے کا مقصد جاوا کی شہری آبادی (جو اس وقت کا سب سے کثیر آبادی کا علاقہ ہے) کو کم آبادی والے علاقوں میں منتقل کرنا ہے۔اس منصوبے کو بھی بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی سرپرستی حاصل تھی کیونکہ اس کے ذریعے وہ پکی آبادی کے رہنے والوں کو غیر آباد علاقوں میں پھیلا دیتے ہیں تاکہ ان علاقوں میں اٹھنے والی باغی قوتوں کی شدت کم کی جاسکے۔ماہرین کی اس تحقیق کے باوجود ایسے منصوبے ناکام ہو چکے ہیں

جب میں سولاویسی پہنچا تھا تو مجھے مکاسار (اجنگ پینڈاگ) میں سرکاری مکان دیا گیا۔حسب معمول میرا کام ان تمام علاقوں کا سفر کرنا تھا جو وسائل سے مالا مال ہوں تاکہ ملٹی نیشنل ادارے ان کا بھرپور استحصال کرسکیں۔اس کے علاوہ مجھے مقامی لیڈروں سے ملنا ہوتا تھا تاکہ ضروری معلومات جمع کی جائے اور ایک خوشنما رپورٹ لکھی جائے جو یہ ثابت کرے کہ بھاری قرضے بجلی کے نظام اور دیگر انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

بیٹس ویلے جو کہ ٹیکساس بڈنگ مویشی خانہ کے پاس واقع ہے اس کو بجلی کے پلانٹ کی جگہ کے طور پر چنا گیا تھا۔ایک دن علی الصبح میرا ڈرائیور مجھے اجنگ پینڈاگ سے باہر ایک خوبصورت ساحل سے ہوتا ہوا بندرگاہی شہر پارے پارے کی طرف لے گیا۔وہاں سے ہم لوگ بہت احتیاط کے ساتھ دور دراز کے اندرونی پہاڑوں کی طرف روانہ ہوئے۔وہاں کی سڑک جنگل کا ریتیلا راستہ کاٹ کر بنائے ہوئے پگڈنڈی سے کچھ زیادہ نہ تھی۔مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ایمیزون واپس لوٹ آیا ہوں۔جب ہماری جیپ گاؤں پن رانگ پہنچی تو ڈرائیور نے اعلان کیا ''لو آ گیا بیٹس ویلے''

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، گاؤں کے نام نے میری دلچسپی کو کافی بڑھا دیا تھا۔میں نے گاؤں کے نام کی مناسبت سے چمگادڑوں کو ڈھونڈنا چاہا مگر کچھ خاص دیکھ نہ پایا۔ڈرائیور آہستہ آہستہ ایک کھلی جگہ کے درمیان سے گزرا۔وہاں پر کچھ بیٹھنے کی جگہیں بنی ہوئی تھیں اور کئی درخت تھے جن کی ٹہنیوں سے بڑے بڑے ناریل جیسے گچھے لٹک رہے تھے اچانک ان میں سے ایک گچھا کھلا اور ایک بڑی سی چمگادڑ اپنے پر پھیلاتی ہوئی نظر آئی تو میرا کلیجہ حلق میں آ گیا۔وہ حیرت انگیز

جانور عین ہمارے اوپر ہل رہا تھا اس کے لچھے دار پر آہستگی سے کھل رہے تھے۔میں نے افواہیں سنی تھیں کہ یہ چمگادڑیں بجلی کی کئی لائنیں جلا چکی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پروں کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ ہوگی۔بہر حال میں اپنے بدترین تصور میں بھی اس منظر کی توقع نہیں کرسکتا تھا جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔

کچھ دیر بعد میں پن رانگ کے میئر سے ملا۔میں نے اس سے مقامی وسائل بجلی کے پلانٹ کے تعمیر اور یہاں پر غیر ملکیوں کی صنعتوں کی خریداری کے حوالے سے معلومات اکٹھی کیں مگر چمگادڑیں میرے حواسوں پر سوار تھیں۔میں نے میئر سے پوچھا کہ یہ چمگادڑیں انہیں تنگ کرتی ہیں تو اس نے کہا ''نہیں یہ شام کو اڑ جاتی ہیں اور قصبہ سے باہر جاکر پھل وغیرہ کھاتی ہیں اور صبح میں لوٹ آتی ہیں۔ہمارے پھلوں کو کبھی نہیں چھیڑتی ہیں جیسے آپ کی کارپوریشنز یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

میں نے اس طرح کی کہانیاں پہلے بھی سنی ہیں۔اگرچہ زیادہ تر امریکیوں کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ ان کے شاہانہ طرز زندگی استحصال کے نظام پر قائم ہے مگر دوسرے ملکوں کے لوگ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور ۱۹۷۰ء میں ہماری فوج کو وہ جمہوریت کا دفاع کرنے والی نہیں بلکہ استحصالی کمپنیوں کے مسلح محافظ کے طور پر دیکھتے ہیں۔

سولا دیسی بدنام زمانہ بگی قبیلے کا ٹھکانہ تھا۔مرچوں کے یورپی تاجر صدیوں پہلے ان کی درندگی سے بے حد خوفزدہ تھے۔۱۹۷۰ء میں بھی بگی بالکل ویسے ہی رہتے تھے جیسے صدیوں سے رہتے آئے تھے۔میں ایک بڑی عمر کے جہاز تعمیر کرنے والے بگی کا دوست بن گیا تھا۔جس کا نام بگی تھا۔وہ اب بھی اپنا کام اپنے باپ دادا کی طرح کیا کرتا تھا۔ایک دن جب میں اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا تو اس نے بتایا کہ اس کے لوگ کبھی بھی قزاقوں کی طرح پیش نہیں آتے تھے بلکہ وہ صرف اپنے وطن کو قابضوں کی گرفت سے بچانے کے لئے لڑتے تھے۔وہ مجھے ایک لذیذ پھل کا ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ ''لیکن اب ہم مارے جائیں گے، کہاں تک لکڑی کے جہازوں میں سوار چند مٹھی بھر لوگ امریکی آبدوزوں، ہوائی جہازوں، بموں اور میزائلوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟'' اس کے سوال نے مجھے بے حد پریشان کر دیا تھا اور آخر کار اسی طرح کے سوالوں نے مجھے اپنے راستے بدلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

ایک بدنصیب ملک

جہاز بنانے والے اس بگی سے بات چیت کے کچھ سالوں بعد میں نے معاشی تباہ کار کی حیثیت سے اپنی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ یہ فیصلہ میں نے کیریبیئن جزائر کے سمندری سفر پر گزارے جانے والی تعطیلات کے دوران کیا تھا۔ یہ جزیرے کسی دور میں ان قذاقوں کا گڑھ ہوا کرتے تھے جنہوں نے اسپین کے سونے کے بیڑے کو لوٹا تھا۔ ایک دوپہر جب میں قدیم دور کے گنے کے کھیت کی تباہ حال دیوار پر بیٹھا ان مظالم کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ان کے تعمیر کرنے والے افریقی غلاموں پر روا رکھے گئے ہوں گے تو مجھے ایسا لگا کہ میں بھی غلاموں کی طرح ہوں۔ کئی سالوں سے شدید جذباتی تناؤ کے بعد میں نے اس گندگی سے باہر آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بوسٹن واپس لوٹ کر میں نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا مگر ان بدصورت حقیقتوں کو عریاں نہیں کرپایا تھا جو اس سلطنت کا پس منظر تھی۔ میں دھمکیوں اور رشوتوں سے مرعوب ہوگیا تھا میں اپنے ضمیر کی آواز کو مسلسل دبا رہا تھا۔ اگلے کئی سال تک میرا ماضی مجھے کچوکے مارتا رہا تھا۔ مجھے ان تمام گھناؤنی بدکاریوں سے زندہ رہنا تھا جو میں نے اپنے ہاتھوں سرانجام دی تھیں اور پھر 9/11 کے کچھ عرصے بعد جب میں اس دھوئیں سے بھرے گڑھے کے کنارے کھڑا تھا جو کبھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر ہوا کرتا تھا میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ مجھے ہمت کرنی ہوگی اور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کی اشاعت کے بعد جب ۲۰۰۴ء میں ریڈیو پر انٹرویوز کرنے والوں کے سوالوں کے جوابات دیا کرتا تھا تب مجھے کچھ اندازہ ہوا تھا کہ بطور معاشی تباہ کار ان ممالک پر اثرات جہاں میں نے اپنے فرائض انجام دیے کہیں زیادہ مہیب تھے۔ ہم نے روس کو شکست دے کر دنیا کی پہلی صحیح معنوں میں عالمی سلطنت قائم کرنے کی بنیاد رکھ دی تھی جس کو للکارنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم نے تیسری دنیا کے اعلیٰ لوگوں کا ایک نیا گروہ تشکیل دے دیا جو کارپوریٹوکریسی کے نوکر تھے اور جن پر ہم حکومت کرتے ہیں؟ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں ان تمام خطوں کا ازسرنو جائزہ لوں گا اور اس تجزیے کا آغاز میں نے اس ملک سے کیا جہاں سے میں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔

میں انڈونیشیا کے عمومی حالات کے بارے میں اخبار، رسائل، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے آگاہ رہا کرتا تھا لیکن اب میں نے ان تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کرنا شروع کردیا۔ میں اس مفید معلومات کے لئے این جی اوز اور تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ان بین الاقوامی اداروں سے بھی استفادہ کرتا تھا جن کے لئے میں نے کبھی کام کیا تھا، جب مجھے ۱۹۹۷ء کے ایشیائی معاشی بحران کا علم ہوا جس کو لوگ آئی ایم ایف کے بحران کے نام سے یاد کرتے ہیں تو میرے تجسس میں حد درجہ اضافہ ہوگیا۔ اس بحران نے کروڑوں لوگوں کی زندگیاں متاثر کی اور جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں نے اپنی زندگیاں بیماریوں، فاقوں، خودکشیوں کے ہاتھ کھودیں۔ اس بحران نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے گھناؤ مقاصد کے حوالے سے اس میں ایک واضح پیغام موجود تھا کہ کس طرح معیشت کو غیر منظم کرکے کارپوریٹوکریسی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔

۱۹۷۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق انڈونیشیا ہماری خدمات کے بدولت ایک لائق تحسین معاشی ملک بنا۔ کم از کم ۱۹۹۷ء تک تو یہ صورتحال برقرار رہی۔ یہ اعداد و شمار کم افراطِ زر دکھا رہے تھے، بیرونی کرنسی کے ذخائر ۲۰ بلین ڈالرز سے تجاوز کر گئے تھے، تجارتی منافع ۹۰۰ ملین سے زیادہ تھا اور اس سب کے علاوہ بینکاری کا مضبوط نظام وجود میں آ گیا تھا۔ انڈونیشیا کی معاشی ترقی ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء کے دوران اوسطاً ۹ فیصد سالانہ کے حساب سے ترقی کررہی تھی۔ اگرچہ یہ تمام اعداد و شمار اتنے اچھے نہ تھے جتنا مجھے اپنی رپورٹس میں ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا تھا لیکن پھر بھی کافی حد تک متاثر کن تھے۔ ماہر معاشیات ان اعداد و شمار کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ معاشی تباہ کاروں کے وضع کردہ ترقیاتی منصوبے کمال کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

لیکن مجھے اس حقیقت کا علم تھا کہ یہ اعداد و شمار اس بھاری قیمت کی طرف قطعاً نشاندہی نہیں کررہے جو عوام نے اس معاشی معجزہ کے لئے ادا کی تھیں۔ کثیر فائدے صرف امراء تک محدود تھے۔ قومی آمدنی میں تیز رفتار اضافہ، مزدور طبقے کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا گیا۔ ان کو بدترین کارخانوں (Sweat Shops) میں کام لے کر پیسا گیا۔ غیر ملکی کارپوریشنز کو ان تمام کارروائیوں کی اجازت تھی جو لاطینی امریکہ اور ترقی یافتہ ممالک میں قانوناً ممنوع ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں ایک اندازے کے مطابق ۵۲ فیصد آبادی دو ڈالرز یومیہ پر گزربسر کررہی تھی۔

انڈونیشیا کے حکمران ان تمام پالیسیوں پر خاموش رہے جو ان کے عوام کے لئے بوجھ کا

باعث بن رہی تھیں۔ ملک کے اعلیٰ طبقے کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے ان اندوہناک قرضوں کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بین الاقوامی شماریات کی رپورٹ کے مطابق انڈونیشیا مستقل بنیادوں پر ایشیاء کے تمام ممالک میں اوسطاً سب سے زیادہ غیر ملکی قرضے تلے دبا ہوا تھا۔ ۹۶-۱۹۹۰ء کے نازک دور کے درمیان یہ عدد لگ بھگ ۶۰ فیصد کے آس پاس تھا (جبکہ نسبتاً یہ عدد تھائی لینڈ کے لئے ۳۵ فیصد، چین اور ہانگ کانگ کے لئے ۱۵ فیصد اور سنگاپور اور تائیوان کے لئے ۱۰ فیصد تھا)۔ ۹۶-۱۹۹۰ء کے دوران اس کے قرضوں کی ادائیگی اور مختصر دورانیے کے قرضے، بیرونی ذخائر کی شرح کے مقابلے میں ۳۰۰ فیصد تھے (جو کہ تھائی لینڈ کے لئے ۱۲۰ فیصد، چین کے لئے ۶۰ فیصد، ہانگ کانگ اور تائیوان کے لئے ۲۵ فیصد تھی) ان اعداد وشمار سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ہم نے اس ملک کو اتنے بڑے قرضوں سے دوچار کر دیا تھا کہ شاید وہ کبھی ان قرضوں سے نجات نہ پا سکے اور پھر اس غریب ملک کے عوام کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کیا گیا تھا جس سے ہماری کارپوریشنز کی خواہشات پوری کی جاسکیں اور اس طرح معاشی تباہ کاروں نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے تھے۔

ایک بار پھر لوگ معاشی ترقی کے فریب میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے کہ اس طرح کے معاملات میں ہوتا ہے کہ پرکشش غیر ملکی قرضے، تجارت کا موافق توازن، کم افراطِ زر اور متاثر کن کُل قومی پیداوار امراء کی آسودگی کا سبب بنتا ہے اور بقایا آبادی کے لئے کربناک عذاب۔

دنیا میں شاید ہی کہیں کارپوریٹ استحصال اتنا واضح نظر آتا ہو جتنا انڈونیشیا کے سویٹ شاپس میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ غیر ملکی ادارے مقامی فیکٹریاں خرید لیتے ہیں جہاں مزدوروں کی تنخواہیں پہلے ہی بہت قلیل ہوتی ہیں اور احتجاج کی صورت میں ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا موت کے گھاٹ اتار دیے جاتا ہے۔ ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی زندگیاں گزاریں تاکہ بہترین مصنوعات ترقی پذیر ممالک کی شاندار دکانوں پر سستے داموں میں بیچی جاسکیں۔

جب میں اپنی کتاب ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کی تشہیر کے سلسلے میں امریکہ کے مختلف حصوں کے دورے پر تھا تو کئی لوگوں نے مجھ سے مل کر نائیک، ایڈیڈاس، رالف لارین، وال مارٹ اور دی گیپ جیسی کمپنیوں کے بارے میں بتایا جو غلامانہ اصولوں کے تحت مزدوری کروایا کرتے تھے اور ایک دلیر جوڑے نے انڈونیشیا میں خود پر گزرے اذیت ناک مصائب کی روداد مجھے سنائی تھی۔

باب نمبر:۶

عقوبت خانے

۲۰۰۵ء میں مجھ سے دو فلمساز جم کیڈی اور لیسلی کریٹز و نے رابطہ کیا۔ انہوں نے میرا انٹرویو فلم بند کرنے کی درخواست کی۔ ان کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ معاشی تباہ کاروں کے سخت مخالف تھے۔

انہوں نے ملاقات کے دوران بتایا ''ہم چاہتے ہیں کہ آپ انڈونیشیا کے عقوبت خانے کے بارے میں جان لیں۔'' اس نے مختصر مجھے بتایا کہ ۲۰۰۰ء میں وہ انڈونیشیا میں قائم نائیک کی فیکٹری میں مزدوروں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔

لیسلی نے بتایا کہ اس نے جیسوٹ رضا کارانہ مشن میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ جیسوٹ کا نعرہ تھا ''جیسوٹ رضا کارانہ مشن زندگی بھر کی بربادی''۔ پھر اس نے مدر ٹریسا کے ساتھیوں کے ساتھ بھارت میں بھی کام کیا۔

جم نے بتایا کہ وہ ۱۹۹۳ء میں میں دنیا کی سیر کو نکلا۔ اس وقت وہ اکیس برس کا تھا۔ اس نے پہلی بار ترقی پذیر ممالک کا دورہ کیا۔ انڈونیشیا، لاؤس، ویتنام، برما اور نیپال جیسے ممالک کے دورے کے دوران اس نے اصل غربت دیکھی۔ اس سفر میں اس نے سولہ سال کیتھولک اسکول کا مقصد پالیا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ پیغمبران کس وجہ سے زمین پر بھیجے گئے۔ درحقیقت دنیا کے تمام اہم مذاہب کا مرکزی نکتہ معاشی انصاف ہی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنی کہانی لکھ کر دیں۔

۱۹۹۸ء میں جم نے نائیک کے مزدوروں پر روا رکھے جانے والے غیر مناسب رویے کی طرف توجہ اس وقت دی جب وہ سینٹ جان یونیورسٹی میں فٹ بال کے کوچ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس دوران اس نے کیتھولک اسکول کی تعلیمات کی روشنی میں نائیک کے مزدوروں پر تحقیقی پرچہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے اپنی تحقیق کا آغاز کیا تو عین اسی وقت یونیورسٹی کے شعبۂ ایتھلیٹکس نے نائیک کے ساتھ ۳۰۵ ملین ڈالرز کے معاہدے کے معاملے پر بات چیت شروع کی، جس کے تحت تمام کوچز اور کھلاڑیوں کو نائیک کی مصنوعات کو زیب تن اور مشتہر کرنا لازم تھا۔ اس نے کھلے عام یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی ضمیر کی آواز کو دبا کر ایک ایسے ادارے کا چلتا

پھر تا اشتہار نہیں بننا چاہتا جس پر الزامات ہوں کہ وہ اپنے مزدوروں کو عقوبت خانوں میں کام کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ ایک بڑی کیتھولک یونیورسٹی نے جم کو دھمکی جاری کی یا تو نائیک کی مصنوعات کو زیب تن کرو اور معاہدے پر اعتراضات کرنا بند کرو یا پھر استعفیٰ دینے کے لئے تیار رہو۔ جون ۱۹۹۸ء میں جم سے جبراً استعفیٰ لے لیا گیا۔

جم کو اپنے موقف پر اعتماد تھا اور اس کے لئے اس نے نائیک سے ان کی کسی ایک کارخانے میں ایک ماہ کے لئے کام کرنے کی اجازت مانگی تا کہ وہ وہاں کے حالات جان سکے۔ نائیک کمپنی نے جواباً بتایا کہ ایک ماہ کافی طویل عرصہ نہیں ہوتا اور اس کو کسی جنوبی ایشیائی زبان سے واقفیت نہیں ہے اور اس کے لئے انہیں کسی مزدور کو برطرف کرنا پڑے گا۔ جم نے جواباً کہا اگر ایک ماہ ناکافی ہے تو پھر وہ چھ ماہ یا سال کے لئے کسی کارخانے میں کام کرنا چاہتا ہے اور اسے ان حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ جم نے ہسپانوی زبان جاننے کی وجہ سے وسطی امریکہ جانے کی درخواست کی۔ نائیک نے جواب بھیجا کہ وہ جم کی پیش کش میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اب چونکہ جم نائیک کے کارخانے میں کام نہیں کر سکتا تھا تو پھر ہم نے اس کا متبادل طریقہ یہ نکالا کہ ہم ان کارخانوں کے مزدوروں کے ساتھ جا کر ان کے گاؤں میں رہیں گے اور اپنا گزارہ اتنی رقم پر کرینگے جس پر ایک مزدور گزر بسر کرتا ہے۔

ایک ماہ کے اندر لیسلی کا ۱۵ پاؤنڈ اور جم کا ۲۵ پاؤنڈ وزن کم ہو گیا۔ ہم بالکل نائیک کے مزدوروں کی طرح گاؤں میں ۹×۹ کے سیمنٹ کے کواٹر میں بغیر فرنیچر اور ایئر کنڈیشنز کے رہ رہے تھے۔ ہم غیر ہموار فرش پر پتلی چٹائیوں پر سوتے تھے جن پر جا بجا جلے ہوئے کوڑے، فیکٹری کی آلودگی اور گاڑیوں کے جلے ہوئے دھوئیں کی راکھ بکھری رہتی تھی۔ غسل خانوں کی نجاست سڑک کے دونوں جانب کھلے گٹروں میں گرا کرتی تھی۔ انہیں کھلے گٹروں کی وجہ سے ہتھیلی کے برابر لال بیگ اور عفریت نما چوہوں نے پورے گاؤں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انڈونیشیا جیسی جگہ پر ۲۵ء۱ ڈالرز یومیہ پر آپ بادشاہوں جیسی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسے بیانات گمراہ کن معلومات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایسے دعوے کرنے والے زیادہ تر لوگ کبھی انڈونیشیا گئے ہی نہیں ہوتے۔ ۲۵ء۱ ڈالرز میں ہم چاول اور سبزیوں پر مبنی دو وقت کا کھانا اور دو کیلے خرید پاتے تھے۔ اگر ہمیں صابن یا ٹوتھ پیسٹ خریدنا ہوتا تھا تو ہمیں کھانے میں کمی کرنی پڑتی تھی۔ ایک دن اپنا سفری چولہا صاف کرتے ہوئے جم سے کیروسین

گر پڑا تو اسے صاف کرنے کے لئے ہمیں کپڑے دھونے کا صابن استعمال کرنا پڑا۔ معاشی طور پر اس تنگی کی وجہ سے ہم جذباتی تھکن محسوس کرنے لگے۔

کبھی سوچ کر دیکھیں کہ آپ بیس سال کے بالغ نوجوان ہیں جو صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کام کرتا ہے۔ یہ سلسلہ پیر سے ہفتے تک جاری رہتا ہے اور کبھی کبھار اتوار کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کام پر پہنچنے کے لئے طے کیے جانے والے سفر کا دورانیہ کام میں شامل نہیں ہے۔ دو سال میں آپ نے اپنے لئے کوئی نیا کپڑا نہیں خریدا۔ رات کو جب آپ تھکے ہارے گھر پہنچتے ہیں تو آپ کو اپنے کپڑے ہاتھوں سے دھونے میں ۳۰ سے ۴۵ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس نہایت معمولی کپڑے ہیں اور وہ بھی دن بھر کے خاتمے کے بعد نہایت گندے لگ رہے ہیں۔ آپ تھکن سے چور ہو چکے ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی ہڈیاں تھکاوٹ سے ٹوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ آپ کو ڈر ہوتا ہے کہ اگر آپ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے تو آپ کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور جس ملٹی نیشنل ادارے کے لئے آپ کام کرتے ہیں وہ دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ وہ ان حالات میں تبدیلی لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے اور صارفین کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ سن کر سب خوش اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے یہ صورتحال اور اس طرح کی تنخواہیں صرف نائیک کے ملازمین کی قسمت میں نہیں تھی بلکہ ہم نے دیگر بڑی کمپنیوں کا بھی یہی حال دیکھا۔

جب میں معاشی تباہ کاری کی ملازمت کرتا تھا تو جکارتا میں انٹر کانٹی نینٹل واحد فائیو اسٹار ہوٹل تھا لیکن اب وہاں کئی اور اعلیٰ اور معیاری فائیو اسٹار ہوٹل بن چکے ہیں۔ یہ تمام ہوٹل امریکی اعلیٰ عہدیداروں کے لئے گھر کی آسائش سے دور دوسرے گھر کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں پر وہ اپنے خوشامدیوں، حواریوں اور گاہکوں کے ساتھ عیاشی میں وقت صرف کرتے ہیں۔ وہ اپنے کمروں سے ٹینگیر ینگ اور دوسرے دور دراز علاقوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکتے ہیں جہاں پر ان کے مزدور جانوروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ضرور یہ کہہ کر اس احساس گناہ سے اپنا دامن چھڑا سکتے ہیں کہ وہ ان کارخانوں کے مالک نہیں ہیں مگر اندر ہی اندر اس اذیت سے دوچار ہوتے ہوں گے کہ وہ اس سب کے ذمہ دار ہیں۔

جم نے مزید بتایا ''نائیک ان کارخانوں کے مالکوں کو بے رحمی سے نچوڑتی ہے۔ نائیک کے ذمہ داران جوتے کے تسمے اور سول بنانے کی قیمت سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ

کارخانوں کے مالکوں پر مصنوعات تیار کرنے کی لاگت کم سے کم رکھنے کے لئے دباؤ ڈالتے ہیں جس کے نتیجے میں کارخانوں کے مالک کم سے کم منافع قبول کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں''۔

لیسلی نے بتایا''مالکان مزدوروں سے کافی بہتر حالات میں زندگیاں گزارتے ہیں مگر وہ بھی استحصال کا شکار رہتے ہیں۔ نائیک صرف فیصلے کرتی ہے اور بے تحاشہ منافع ہڑپ کرتی ہے۔''

جم نے واضح کیا''ہم نے ساری توجہ نائیک پر مرکوز کر رکھی تھی کیونکہ وہ اس صنعت کے سب سے بڑے کھلاڑی ہیں اور اگر ہم اس کے رویے پر دباؤ ڈالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر ان دیگر کمپنیوں کو بھی راہِ راست پر لایا جاسکتا ہے۔''

۱۹۹۴ میں سائیکل ٹیکسیوں کے بجائے پیٹرول کی تین پہیوں والی ٹیکسیاں متعارف ہوئیں۔ سائیکل ٹیکسی کے بہت سے مالکان نئی ٹیکسیاں خریدنے کی سکت نہ رکھنے کی وجہ سے عقوبت خانوں میں کام کرنے پر مجبور ہوگئے۔

ہر امریکی حکومت سوہارتو کی حمایت کرتی رہیں۔ جبکہ این جی اوز بین الاقوامی اور مقامی قوانین کی خلاف ورزیوں، انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف احتجاج کرتی رہیں۔ نیویارک ٹائمز نے لکھا''بین الاقوامی سروے رپورٹوں کے مطابق انڈونیشیا دنیا کے بدعنوان ترین ملکوں کی صف میں باقاعدگی سے جگہ بنانے میں کامیاب رہا ہے۔''

سی آئی اے کے سابقہ ملازم نیل نے مجھے بتایا''مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ حالات اتنے خراب ہوچکے ہیں۔''نیل جو کہ چینی نژاد امریکن ہے اپنے والدین کی ماؤ سے شدید نفرت کی وجہ سے سی آئی اے میں شامل ہوا۔ نیل نے بتایا''جب میں جکارتہ بھیجا گیا تو میں بے حد اصول پسند ہوا کرتا تھا۔ یہ ۸۱ء کا دور تھا ہمیں انڈونیشیا کو کمیونزم کے ماننے والوں سے پاک کرنا تھا۔''لیکن ۱۹۸۹ میں پانامہ پر امریکی حملے نے اس کی غلط فہمی ختم دور کردی اس کا خیال تھا کہ یہ حملہ ساری دنیا میں امریکہ کے خلاف نفرت کا باعث بنے گا۔ ۲۰۰۵ء میں سونامی سے تباہ ہونے والے صوبے آچے کی از سرِ نو تعمیر کے سلسلے میں تشکیل دی جانے والی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے انڈونیشیا لوٹا۔ مجھے جکارتہ ایک جدید شہر کی طرح نظر آرہا تھا، لیکن حالات کافی دگرگوں تھے۔ ہر طرف بدعنوانی کا راج تھا۔''

نمبر: ۷

امریکی ایماء پر ہونے والا قتل عام

میں نے اجنگ پینڈانگ میں قیام کے دوران انڈونیشیا کے صوبے مشرقی تیمور میں بدترین انسانی حقوق اور ماحولیاتی قوانین کی خلاف ورزیاں دیکھیں۔ مشرقی تیمور بھی سولاویسی کی طرح سونے، مینگانیز، تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ سولاویسی انڈونیشیا کا حصہ تھا جبکہ مشرقی تیمور پر پچھلی چار صدیوں سے پرتگالیوں کا نظم ونسق رہا۔ اگرچہ انڈونیشیا کی ۹۰ فیصد آبادی مسلمان تھی لیکن اس کے برخلاف مشرقی تیمور کی اکثریت آبادی رومن کیتھولک پر مشتمل تھی۔

مشرقی تیمور نے پرتگال سے آزادی ۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء میں حاصل کی۔ آزادی کے نو دن بعد انڈونیشیا نے حملہ کردیا۔ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے مشرقی تیمور کے سابق گورنر کے بھائی نے اس حملے کے پینتیس سال بعد''ڈیموکریسی ناؤ'' کی صحافی کو بتایا کہ مشرقی تیمور پر حملہ امریکی حکومت کی ایماء پر کیا گیا اور اس حملے میں دو لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

یونیورسٹی آف میری لینڈ میں تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر نے بتایا کہ مشرقی تیمور پر حملہ باقاعدہ سازش کے تحت کروایا گیا اور اس کو عوامی حلقوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ مشرقی تیمور میں ۱۹۸۰ء کے عشرے کے درمیانی حصے میں روا رکھے جانے والے قتل عام کو منظر عام پر لانے والی مستند رپورٹوں کو بھرپور طاقت کے ذریعے دبایا گیا اور اس تمام فوجی نظام پر کانفرنس کی طرف سے لگنے والی ممکنہ پابندی کو باقاعدہ جعلسازی کے ذریعے روکا گیا تاکہ اسلحے کی ترسیل جاری رہے۔

اس حملے کے بیس سال بعد انڈونیشیا سے دو نہایت ممتاز ناقدین کا ظہور ہوا۔ مشرقی تیمور کے سرگرم کارکن بشپ کارلوس فلپ زیمینس بیلو اور دوسرے جوز راموس ہورٹا تھے جن کو ۱۹۹۶ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس اعزاز نے جکارتہ، واشنگٹن اور وال اسٹریٹ کے ایوانوں کو ہلا دیا۔

مشرقی تیمور میں آبادی کا قتل عام سوہارتو کی سرپرستی میں حکومت اور پولیس کے گٹھ جوڑ سے کی جانے والی کئی اور زیادتیوں میں سے ایک تھا۔ ان آزاد خیال علاقوں میں فوج کو بھیجنے کے عمل کو یہ کہہ کر واجب قرار دیا گیا کہ ۷۰ء کی دہائی میں ان علاقوں میں کمیونزم بڑھ رہا تھا۔ سوہارتو کی

جابرانہ حکومت کے خاتمے کے لئے بے چین باغی عناصر نے عسکری اور طبّی امداد کے لئے چین کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی مگر امریکی پریس نے ان تمام خبروں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ میڈیا کی طرف سے اس پردہ پوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سوہارتو کی مخالفت دراصل کارپریٹوکریسی کے مقاصد کی مخالفت کرنے کے مترادف تھا۔ کارپوریشنز اس بات کو تسلیم کرتی تھیں کہ غاصب آمر کے متحدہ انڈونیشیا کے خواب کی بھرپور حمایت کرنا نہایت ضروری تھا وہ ان تمام علاقوں کو اپنے زیر تسلط علاقوں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے تھے جہاں پر وہ تمام نایاب وسائل موجود تھے جس کی ان کو ہوس تھی۔

انڈونیشیا میں میرے قیام کے دوران سماٹرا کے شمالی کونے پر واقع تیل اور گیس سے مالا مال آچے صوبہ میں فوج نے دس ہزار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اسی طرح مولوکا جزائر، مغربی کالی مینسٹن (بورنیو) اور ریان جایا (نیوگنی) میں مختلف جھڑپوں میں ہزاروں لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان تمام معاملات سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ فوجوں کے استعمال کی اصل وجہ ملٹی نیشنل اداروں کے مفادات کا خیال رکھنا تھا۔ انڈونیشیا بین الاقوامی بینکوں اور تجارتی طبقے کے تعاون اور قرضوں سے تعمیر کی جانے والی معیشت کی مثال تھا۔ یہ تمام قرضے انڈونیشیا اپنے قدرتی وسائل سے ادا کرنے کے وعدہ کی وجہ سے مزید قرضوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ اپنے انفرااسٹرکچر کے منصوبے کے لئے سرمایہ کی تلاش میں انہیں مزید قرضے لینے پڑ رہے تھے۔ ان تمام قرضوں اور انفرااسٹرکچر کی تعمیر کے نتیجے میں ہوٹلوں، ریستورانوں اور شاپنگ مال کی طلب بڑھتی جا رہی تھی اور اس طلب کے نتیجے میں تعمیراتی، بینکاری اور نقل و حمل کی سرگرمیاں زور پکڑ رہی تھیں۔ ان سرگرمیوں کی کثرت کی وجہ سے امیر انڈونیشین اور غیر ملکی بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے جبکہ باقی ماندہ اکثریت مصائب سے دوچار تھی۔ ان قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنے والی مزاحمتی قوتوں کو فوج کے ذریعے کچلا جا رہا تھا۔

لوگوں کی طرح انڈونیشیا کی ماحولیات بھی بربادی کا شکار تھیں۔ کانیں، کاغذ بنانے والے کارخانے اور قدرتی وسائل کا استحصال کرنے والے دیگر اداروں نے دنیا کے چند بڑے بارانی جنگلات کے بیشتر حصے کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ دریا زہریلے مادوں سے بھرے پڑے تھے۔ صنعتی مقامات اور شہروں کی ہوا آلودگی سے کثیف ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں جنوب مشرقی ایشیاء تمام دنیا کے میڈیا کی سرخیوں پر چھایا ہوا تھا جب انڈونیشیا کے جنگلات میں لگی آگ کے زہریلے

دھوئیں نے اس کی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جو دراصل معاشی تباہ کاروں کی بدعنوانیوں کا ثمر تھی۔

اس ''معاشی معجزے'' کے دیگر شکاروں میں بگی، ڈائیک، میلانیسیاس اور کئی دیگر مقامی ثقافتیں بھی شامل تھیں۔ ان کی زمینوں کو ہتھیا لیا گیا تھا اور ان کی زندگیوں اور روایات کو پامال کیا جا رہا تھا۔ اس جدید نسل کشی کے اثرات صرف انسانی تکلیف کی صورت میں ناپے جا سکتے تھے۔ یہ انسانیت کی روح پر براہِ راست حملہ تھا اور انسانی تاریخ کی دیگر نسل کشیوں کے مقابلے میں زیادہ خوفناک تھی۔ بشمول ان نسل کشیوں کے جو امریکہ ماضی میں اپنی مقامی آبادیوں پر روا رکھ چکا تھا۔ اگرچہ ماضی کی ہولناک کارروائیوں کی تو مذمت تو کی جاتی ہے لیکن ان تمام کارروائیوں کو اسی قدر بے دردی سے امریکی حکومتوں اور اداروں کی ایماء اور مالی تعاون سے دہرایا جاتا ہے۔

سوہارتو نے آئی ایم ایف کا اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پیکیج اس وقت متعارف کروایا تھا جب بڑھتے ہوئے معاشی بحران نے اس کے ملک پر شدید منفی اثرات مرتب کئے تھے۔ آئی ایم ایف نے سوہارتو کو تجویز دی تھی کہ وہ تیل اور خوراک پر دی جانے والی سبسڈی اور دیگر معاشی منصوبوں پر خرچ کی جانے والی رقوم میں کمی کر دے کیونکہ یہ تمام تجاویز امیروں کو فائدہ پہنچاتی تھیں اس لئے ان کے نتیجے میں فاقہ کشی، بیماریاں اور نفرتیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔

انڈونیشیا کی اکثریتی آبادی سڑکوں پر آ گئی۔ بحران کو مزید خطرناک ہونے سے بچانے کے لئے امیر طبقہ بھی تبدیلی کے نعرے لگانے لگا۔ مجبوراً سوہارتو کو مئی ۱۹۹۸ء میں استعفیٰ دینا پڑا اور اس کے ساتھ اس کا بتیس سالہ آمرانہ دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ ستمبر ۱۹۹۹ء میں کلنٹن انتظامیہ نے انڈونیشیا کی فوج سے تمام عسکری رابطے منقطع کر لئے تھے۔

اگرچہ یہ تمام واقعات کسی بھی طرح کارپریٹوکریسی کے اختتام کا باعث نہ بن سکے تھے اس کے برعکس یہ اس کی استحکام کی وجہ بن رہے تھے جن عناصر نے آمر کو بے دخل کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عوام کے دوست کے طور پر پیش کرنے لگے تھے۔ امریکی حکومت اور دیگر ملٹی نیشنل اداروں نے سوہارتو کی معزولی کو سراہا اور نئی حکومت کی حمایت کا اعلان کر دیا اور پھر ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء میں ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے کارپریٹوکریسی کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی نئی وجوہات فراہم کر دی تھیں۔ کرسمس کے اگلے روز سونامی نے خطے کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ قریباً ڈھائی لاکھ لوگ ان مہیب لہروں کی نذر ہو گئے۔ دوسری طرف از سر نو تعمیر میں حصہ لینے والی کمپنیاں جن میں اکثریت

امریکیوں کی تھی اس تمام صورتحال کو منافع کمانے کا ایک سنہری موقع گردانتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ سونامی جیسی قدرتی آفات ہزاروں، لاکھوں زندگیوں اور جائیدادوں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں لیکن کل قومی پیداوار میں مثبت اثرات مرتب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اموات اور تباہیاں معاشی اعدادوشمار کی کتابوں میں جگہ نہیں بنا پاتے مگر پھر بھی تعمیراتی منصوبوں پر خرچ کیے جانے والے کروڑوں ڈالرز جعلی اور مثبت اثرات ظاہر کرتے ہیں۔

اکثریتی امریکی آبادی اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ ایسی قدرتی آفات جنگوں جیسی ہوتی ہیں۔ بڑے تجارتی اداروں کے لئے یہ انتہائی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ تباہیوں کے بعد ازسرنو تعمیر پر خرچ کئے جانے والے پیسے کو امریکی انجینئرنگ کمپنیاں، ملٹی نیشنل ادارے ہوٹلوں، ریستورانوں، مواصلات کے نیٹ ورک، بینکوں، انشورنس کمپنیوں کی تعمیر کی بہتری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کسانوں، مچھیروں، غریبوں، مقامی تاجروں کو اس ریلیف فنڈز میں سے کچھ نہیں ملتا بلکہ سلطنت کی تعمیر میں سرکردہ عناصر کی ہوس پوری کی جاتی ہے۔

باب نمبر: ۸

سونامی کے فوائد

۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء ایک یوم سیاہ کی حیثیت رکھتا ہے جو نہ صرف اس کے براہِ راست شکار بننے والوں کے لئے کربناک تھا بلکہ ان سب کے لئے بھی جو کہ کرۂ ارض پر رہنے والے تمام لوگوں کے لئے ہمدردی، خیرخواہی اور نیک دلی کے جذبوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اس خطے میں شرمناک استحصال کی دردناک کہانی سونامی جیسی قدرتی آفت رونما ہونے سے مہینوں پہلے شروع ہوگئی تھی۔

انڈونیشیا نے ۲۰۰۴ء میں ایک اور فوجی کو صدارت کے عہدے کے لئے منتخب کرلیا تھا۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق جنرل سوسیلو بمبانگ یودھویونو، سوہارتو کے غاصبانہ دورِحکومت میں تیزی سے ترقی کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا۔ اس کو ۱۹۷۶ء میں فورٹ بیننگ، جارجیا میں فوجی تربیت کے لئے چنا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے بین الاقوامی ادارہ برائے فوجی تعلیم وتربیت پروگرام کے تحت امریکہ کے دو دورے کئے۔ سونامی کے بعد آچے صوبے میں جدوجہد آزادی کی تحریک کو دبانے کے لئے وہ سب سے موزوں رہنما کے طور پر سامنے آیا۔

اس خطے میں پھیلی آزادی کی تمام تحریکوں کی طرح آچے صوبے کی تحریک بھی استحصال کرنے والی ظالم حکومت سے آزادی کے حصول کیلئے تھی۔ ان کا ماحول اور ثقافت غیر ملکی اداروں کی لالچ کی وجہ سے برباد ہو رہا تھا۔ آچے صوبے میں مائع گیس بنانے کا منصوبہ تھا لیکن اس منصوبے سے حاصل ہونے والے منافع کی قلیل شرح ہی عوام کے زیر استعمال مقامی اسکولوں، ہسپتالوں اور سرمایہ کاری کے دیگر منصوبوں میں استعمال ہوا کرتی تھی۔

ایوارڈ یافتہ صحافی میلیسا راسی جو نیوز ویک اور اس جیسے بڑے بڑے اشاعتی اداروں کے لئے لکھتی ہیں اور مجھے اکثر دنیا کے چند حساس خطوں سے ذاتی ای میل بھیجتی رہتی ہے اس کے مطابق ''قدرتی وسائل سے مالا مال آچے صوبہ انڈونیشیا سے آزادی حاصل کرنے کے لئے پچھلی پانچ دہائیوں سے جدوجہد کررہا ہے۔'' تیل کے کنوؤں کی قطاریں ساحل تک جاتی ہیں اور اسی وجہ سے انڈونیشین حکومت آچے سے جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔'' اس حوالے سے کچھ دستاویزات بھی منظر عام پر لائی گئی تھیں جس کے مطابق سونامی آنے سے تیس سال پہلے سے جاری جدوجہد

میں تقریباً دس سے پندرہ ہزار لوگ اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔

حکومت اور آزاد آچے تحریک کے درمیان خفیہ بات چیت ۲۰۰۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ آزاد آچے تحریک نے عوام کے لئے گیس، تیل اور دیگر مقامی وسائل سے حاصل ہونے والے منافع اور مقامی حکومت میں اختیارات اور کئی عشرے پرانے کچھ مطالبات منوا لئے تھے لیکن سونامی نے سب کچھ بدل ڈالا۔ کیونکہ آزاد آچے تحریک ایک مقامی تنظیم ہے جو سونامی سے سے متاثرہ علاقے کے عین وسط کے علاقے میں زیادہ پراثر تھی اس لئے وہ شدید تباہی سے دوچار ہوگئی تھی۔ حکومت اس ساری صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے فوری حرکت میں آ گئی۔ جاوا اور دوسرے غیر متاثرہ علاقوں سے تازہ کمک منگوالی گئی، ان دستوں کو امریکی فوج کی بھرپور مدد حاصل تھی جو وہاں مقیم امریکی ٹھیکیداروں کے تحفظ کے لئے تعینات تھے۔ مزید برآں یہ فوجی دستے اندر ہی اندر وہ تحریک کو کچلنے کا منصوبے پر بھی عمل کر رہے تھے۔

بش انتظامیہ نے وہ وقت بالکل بھی ضائع نہ کیا۔ کلنٹن انتظامیہ نے ۱۹۹۹ء میں انڈونیشیا سے جو عسکری رابطے منقطع کر لیے تھے اس کو سونامی کے ٹھیک ایک ماہ کے اندر اندر واشنگٹن نے جنوری ۲۰۰۵ء میں بحال کر لیے۔ وائٹ ہاؤس نے فوراً ایک ملین ڈالر کا فوجی ساز و سامان جکارتہ روانہ کر دیا تھا۔ نیویارک ٹائمز نے ۷ فروری ۲۰۰۵ء میں لکھا ''واشنگٹن سونامی سے پیدا ہونے والے موقع کو فوراً اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔'' سیکرٹری آف اسٹیٹ کونڈو لیزا رائس انڈونیشین افسروں کی امریکی تربیت کے لئے بے حد کوشاں تھی۔ انڈونیشین فوجی جو سونامی سے پہلے آچے میں جاری ۳۰ سال سے جاری علیحدگی پسند تحریک سے لڑنے میں کوشاں تھے اب ان کا اوّلین مقصد آچے تحریک کے مضبوط گڑھ کو اپنے شکنجے میں جکڑنا تھا۔'' نومبر ۲۰۰۵ء میں واشنگٹن نے انڈونیشیا کی بندرگاہوں پر اسلحہ کی نقل و حمل پر پابندی اٹھالی اور انڈونیشیا کی فوج سے تمام رابطے بحال کر لیے۔ از سرِ نو تعمیر کی کارروائیوں کی وجہ سے آچے تحریک نے حکومت کے ساتھ یکطرفہ امن معاہدے پر دستخط کر دیے اور کارپریٹوکریسی ایک بار پھر فاتح بن گئی۔

کارپریٹوکریسی قدرتی آفات سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے اس کی جیتی جاگتی مثال آچے کی لیوزر ایکوسسٹم *Leuser Ecosystem* نے پیش کر دی۔ پچھلے تین دہائیوں سے جاری مقامی مزاحمتی تحریکوں نے تیل نکالنے اور جنگلات کاٹنے کی کمپنیوں کو دنیا کے بہترین بارانی جنگلات سے دور رکھا ہوا تھا لیکن آزاد آچے تحریک کچلی جا چکی تھی۔ اس لئے استحصال کا پرانا سلسلہ

دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

تیل کی کمپنی کے سابق افسر مائیک گریفتھس نے ۱۹۸۰ء میں اپنی ملازمت ترک کر کے ماحولیاتی تحفظ کے مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اسی نے ۱۹۹۴ء میں بین الاقوامی لیوزر فاؤنڈیشن *Leuser Foundation* کی بنیاد رکھنے میں مدد کی تھی اور اسی نے ۲۰۰۶ء میں این پی آر کے ''ریڈیو ایکسپیڈیشنز'' *Radio Expeditions* نامی پروگرام کو آچے میں شروع کرنے کے لئے رہنمائی فراہم کی تھی۔ ریڈیو ایکسپیڈیشنز کے میزبان مائیکل سلیوان نے رپورٹنگ کے دوران بتایا تھا ''امن بحال ہوتے ہی جنگلات پر دباؤ بڑھنے لگا ہے۔ گرم علاقوں کے قیمتی جنگلات اور کھجوروں کے درختوں کی کٹائی سے بھی سنگین مسئلہ سڑکوں کی تعمیر ہے۔'' ریڈیو پروگرام میں مزید بتایا گیا کہ سونامی کے فوراً بعد امریکی انجینئرنگ اور تعمیراتی کمپنیوں نے ورلڈ بینک اور دیگر امدادی اداروں میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے تیل اور لکڑی کی ترسیل اور سڑکوں کی تعمیر کے لئے بھاری رقوم حاصل کر لی تھیں جو دراصل تیل اور لکڑی کا کاروبار کرنے والے اداروں کا بہت بڑا مسئلہ حل کرنے میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ مائیکل گریفتھس نے این پی آر کو ایک انٹرویو کے دوران بتایا ''اگر آپ لیوزر کے ماحولیاتی تحفظ کے نظام کی حفاظت نہ کر سکے تو پھر آپ اس علاقے میں شیروں، ہاتھیوں، گینڈوں اور بن مانسوں کو بچانے کا خیال دل سے نکال دیں اور ساتھ ہی ہمیں ان چار ملین لوگوں کی بھلائی کے بنیادی اصول بھی فراموش کرنے ہوں گے اور تقریباً اتنی ہی تعداد اس علاقے میں پانی کی فراہمی، سیلاب اور زمین کے کٹاؤ سے بچاؤ کے طریقوں کے اجزا پر نظریں جمائے بیٹھی ہے۔''

انڈونیشین حکومت، امریکی حکومت اور دیگر بین الاقوامی اداروں کا گٹھ جوڑ ان تمام طریقوں کی نشاندہی کرتا ہے جو کارپریٹوکریسی جنگ عظیم دوئم کے دوران پوری دنیا میں استعمال کیا کرتی تھی۔ سلطنت کی تعمیر پوشیدہ طور پر جاری تھی۔ دراصل جمہوریت کی کامیابی کا راز باشعور رائے عامہ ہے اس لئے اس طرح کے حربے امریکہ کے بنیادی نظریات کے لئے ایک خطرے کا درجہ رکھتے ہیں۔

میرے کام کی گھناؤنی فطرت کو میرے لئے تین الگ الگ واقعات نے بے نقاب کر دیا تھا۔ یہ تمام واقعات ۲۰۰۴ء کے سونامی کے بعد رونما ہوئے تھے مگر ان کی جڑیں میری ملازمت کے ابتدائی حصے میں پیوستہ تھیں۔

باب نمبر:۹

بدعنوانی کے ثمرات

اپنی پچھلی کتاب ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' میں اپنے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے اوائل میں اس وقت ملک کی چند بڑی تعمیراتی اور مشاورتی اداروں میں سے ایک اسٹون اینڈ ویبسٹر انجینئرنگ کمپنی سے اپنے روابط کی تفصیلات درج کی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ بطور معاشی تباہ کار اپنی زندگی اور اپنی ملازمت کے بارے میں کتاب لکھنے سے روکنے کے لئے اسٹون اینڈ ویبسٹر نے مجھے نصف ملین ڈالر ادا کئے تھے اس کے علاوہ کمپنی بعض اوقات میری خدمات اور دیگر معاملات میں مشاورت لیتی رہتی تھی۔

۱۹۹۵ء میں ایک دن اسٹون اینڈ ویبسٹر کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے مجھ سے ملنے کی درخواست کی۔ دوپہر کے کھانے کے دوران اس نے انڈونیشیا میں کیمیکل پراسیسنگ کمپلیکس بنانے کے منصوبے کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ منصوبہ کمپنی کی سوسالہ تاریخ کی چند بڑے منصوبوں میں سے ایک ہوگا جس کی لاگت ایک بلین کے لگ بھگ ہوگی۔ اور اس کے لئے سوہارتو کے خاندان کے کسی فرد کو ڈیڑھ سو ملین ڈالر بطور رشوت کے ادا کرنے کے تیار ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ میں کسی شخص کو قانونی انداز میں رشوت دینے کے چار طریقوں سے واقف ہوں۔ ہماری کمپنی، سوہارتو یا اس کے حواریوں کی کمپنیوں سے صنعتی ساز وسامان لیز کرائے اور پھر اس کی قسط اضافی رقم کے ساتھ ملا کر جمع کرادی جائے، اس کے علاوہ ہماری کمپنی اس منصوبے کے ذیلی معاہدے اسی کے دوستوں کی کمپنیوں کو کم قیمتوں پر جاری کردے، اسی طرح اسٹون اینڈ ویبسٹر خوراک، رہائش، گاڑیوں، ایندھن اور دیگر قیمتی اشیاء بھی معاہدے پر فروخت کر سکتی ہے اور آخری طریقہ یہ ہے کہ انڈونیشیا کی حکومت کے قریبی ساتھیوں کے بیٹے اور بیٹیوں کی تعلیم کے اخراجات کسی امریکی کالج میں برداشت کرنے کی پیش کش کی جائے اور جب تک ان کی اولادیں تعلیم حاصل کریں ان کو بطور مشیر یا انٹرن کی تنخواہیں بھی دی جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اتنی بڑی رقوم کی ادائیگی کے لئے اسے چاروں طریقے استعمال کرنے پڑیں گے اور

اس کے لئے کئی سالوں کا عرصہ درکار ہے مگر میں نے اسے یقین دلایا کہ ''میں نے یہ تمام تراکیب نہایت کامیابی سے استعمال کر کے دیکھ چکا ہوں اور میرے علم کے مطابق کبھی کوئی امریکی افسران تراکیب کے استعمال کے نتیجے میں قانونی کارروائی سے دوچار نہیں ہوا۔'' میں نے اسے معاہدوں کو کامیابی سے پایہ تکمیل ہونے کے لئے رقاصاؤں کے استعمال کا بھی مشورہ دیا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ اس سلسلے میں مجھ سے کبھی رابطہ نہ کیا۔

پھر ۱۵ مارچ ۲۰۰۶ء کو بوسٹن گلوب کے تجارتی صفحے کے سرورق پر میں نے یہ سرخی دیکھی ''رشوت کی دستاویزات اور اسٹون اینڈ ویبسٹر کا زوال'' اس مضمون میں ان دردناک تفصیلات کا ذکر تھا کہ کس طرح ۱۸۸۹ء سے قائم شاندار تاریخ رکھنے والی یہ کمپنی ۲۰۰۰ء میں دیوالیہ کا شکار ہوگئی اور پھر اسے شاہ گروپ (Shaw Group) نے خرید لیا۔ گلوب کے مطابق ''ایک ہزار سے زائد ملازمین اسٹون اینڈ ویبسٹر'' کے حصص میں لگائی جانے والی رقوم کے ساتھ اپنی ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔'' گلوب کے رپورٹر نے یہ لکھ کر مضمون کا اختتام کیا کہ کمپنی کے زوال کی اصل وجوہات تک ان سطروں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ ''انتہائی اہم دستاویزات ملی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ کمپنی نے انڈونیشیا کے صدر سوہارتو کے ایک رشتہ دار کو غیر قانونی طور پر ۲۷ ملین ڈالرز دینے کی خود یہ کوشش کی تھی تاکہ وہ اسٹون اینڈ ویبسٹر کی تاریخ کا سب سے بڑا معاہدہ حاصل کر سکیں۔''

دوسرے واقعہ کا آغاز انڈونیشیا کے سرکاری عہدیدار کے بیٹے کی ای میل سے ہوا تھا جس کے ساتھ میں ۱۹۷۰ء کے عشرے کے دوران کام کر چکا تھا اور اس نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ایمل (فرضی نام) نیویارک کے مغربی علاقے میں ایک پرسکون تھائی ریسٹورنٹ میں مجھ سے ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' نے اس کو بے حد متاثر کیا۔ اس کے والد نے اس کی مجھ سے اس وقت ملاقات کروائی تھی جب وہ صرف دس سال کا تھا۔ وہ میرا نام اکثر مختلف حوالوں سے سنتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ ان بدعنوان افسران میں سے تھا جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب میں کیا تھا اور میری طرف بغور دیکھتے ہوئے اعتراف کرنے لگا کہ وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل پڑا تھا۔ اس نے ساتھ یہ بھی کہا ''میں صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتا ہوں اور آپ کی طرح اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں مگر میرا ایک خاندان بھی ہے جو میں کھو سکتا ہوں مجھے یقین ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا

چاہتا ہوں۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اس کا نام افشاں نہیں کروں گا اور نہ ہی اس کی شناخت منظر عام پر لاؤں گا۔

ایمل کی کہانی کافی رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ اس نے نشاندہی کی کہ انڈونیشیا کی فوج نجی شعبے سے غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھنے کے عوض پیسے لیتی ہے۔ یہ تیسری دنیا کے ممالک میں ایک عام سی بات ہے۔ لیکن ''۱۹۹۸ء میں سوہارتو کی معزولی کے بعد سے چیزیں مزید ابتر ہوگئیں۔ اس کے دور حکومت کے اختتام کے ساتھ ہی اکثر انڈونیشین باشندوں نے قوانین میں ترامیم کرنے کی کوشش کیں تاکہ عوامی طبقے فوج کو قابو میں رکھ سکیں۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ دفاعی بجٹ میں تخفیف کر کے وہ اپنے مقاصد حاصل کر پائیں گے لیکن جنرلوں کو معلوم تھا کہ انہیں کن سے مدد مانگنی ہے، غیر ملکی کان کن اور توانائی کی کمپنیاں۔''

میں نے ایمل کو بتایا کہ اس کے الفاظ نے کولمبیا، نائیجیریا، نکاراگوا اور کئی ممالک میں رواں ایسے حالات کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے میری تائید کرتے ہوئے کہا ''بالکل، انڈونیشیا میں کرائے کے قاتل بہتات سے ہیں مگر میں جس حوالے سے بات کر رہا ہوں وہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں ہماری فوج کو غیر ملکی کارپوریشنز نے خرید لیا ہے اور اب یہ کمپنیاں فوج کی مالک بن گئی ہیں۔''

جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ تمام معلومات کیوں عیاں کر رہے ہو تو وہ پھر بولا ''میں اس طرح کے تمام سلسلوں میں شریک رہا ہوں،، میں نے اپنے باپ کی بے ایمانی کو مزید قوت بخشی ہے، میں ان خاص لوگوں میں سے ہوں جو تمام انتظام کیا کرتے ہیں، کمپنیوں سے پیسے لے کر فوج تک پہنچایا کرتے ہیں۔ میں شرمندہ ہوں، میں کم سے کم یہ سب کچھ آپ کو بتا سکتا ہوں تاکہ آپ ساری دنیا کو ان حقائق سے آگاہ کر سکیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔''

ایمل سے میری ملاقات کے چند ہفتوں بعد میری نظر ایک مضمون پر پڑی جب میں نیویارک ٹائمز کی ویب سائٹ کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس مضمون میں نیواورلینز کی کمپنی کی ان سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا تھا جس میں اس نے ایک علاقے پاپوا میں فوجی کمانڈروں اور دستوں کو اپنے کارخانوں اور دیگر سہولیات کے تحفظ کے عوض پچھلے سات سالوں میں بیس ملین ڈالر ادا کئے تھے۔ مضمون میں آگے یہ بھی درج تھا ''انڈونیشیا کی فوج کے اخراجات کا صرف ایک تہائی حصہ

حکومتی بجٹ سے آتا ہے جبکہ باقی تمام ضروریات کے لئے پیسہ غیر قانونی سرگرمیوں سے کمایا جاتا ہے۔ اس طرح فوج حکومت کے مالیاتی وسائل پر انحصار نہ کرتے ہوئے آزادانہ کام کرتی ہے۔''

اس مضمون کے بعد نیویارک ٹائمز کی ہی ویب سائٹ پر ستمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہونے والے دو اور مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان مضامین میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے دنیا میں سونا نکالنے والی سب سے بڑی کمپنی ڈینور کی نیومونٹ مائننگ کارپوریشن نے میرے دیکھے بھالے علاقے سولاویسی میں غیر قانونی طور پر زہریلے مادے آرسینک اور تابنے کو خلیج بویات میں انڈیلنے کی حرکت کی۔ میں جب ان مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ہم معاشی تباہ کاروں نے جن سڑکوں، بندرگاہوں، بجلی کے نظام اور دیگر انفرااسٹرکچر کی تعمیر کے لئے پیسہ فراہم کیا تھا ان سب کی موجودگی نے ان علاقوں میں ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے نیومونٹ کو اتنی ہمت ہوئی کہ وہ کانیں کھودے اور سمندر کو ان کانوں سے نکلنے والے فاضل مادے سے زیادہ آلودہ کرتی رہے۔ جیسے کہ میرے پراجیکٹ منیجر نے ہمارے پہلے دورے کے دوران بیان کیا تھا کہ ہمیں انڈونیشیا اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ ہم تیل نکالنے والی کمپنیوں کو وہ سب فراہم کر سکیں جس کی وہ خواہش ظاہر کریں۔ مجھے اس وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا منصوبہ صرف تیل کی کمپنیوں تک محدود نہیں ہوگا۔

نیویارک ٹائمز کا مضمون واضح طور پر نشاندہی کر رہا تھا ''نیومونٹ کے معاملے سے اس تاثر کو مزید تقویت ملتی ہے کہ کانیں کھودنے اور توانائی فراہم کرنے والی کمپنیوں کی انڈونیشیا کے کمزور انتظامی اداروں پر کڑی گرفت ہے۔ بہت سے حلقے بدعنوانی، اقرباء پروری اور غیر مستحکم عدالتی نظام جو سوہارتو کے دور میں پنپ نہ سکا کو ان تمام تباہیوں کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ سوہارتو نے منہ مانگی قیمت کے عوض ان تمام سرمایہ داروں پر اپنے ملک کے دروازے کھول دیے تھے۔

جب میں ان مضامین پر نظریں جمائے بیٹھا تو مجھے بیٹس ویلے کے میسز اور بگی قبیلے کے جہاز بنانے والے کے الزامات واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ امریکہ نے واقعتاً اپنی چمگادڑوں کو ان علاقوں سے فائدہ اٹھانے اور آلودہ کرنے کے لئے روانہ کیا تھا۔ لکڑی کے بنے قدیم جہازوں پر سوار بندوقیں سنبھالے ملاحوں کے لئے اپنی سرزمین کی حفاظت کے لئے پنٹاگون کی طاقت سے ٹکرانا ناممکن تھا۔

باب نمبر:۱۰

انڈونیشیا میں تشدد کا شکار بننا

میری تقریر کے دوران سامعین اکثر یہ نکتہ اٹھاتے تھے کہ نائیک اور اس جیسی دوسری کمپنیاں اپنے رویوں میں تبدیلی لا رہی ہیں۔ میں بشمول ان لوگوں کے جن سے میری اس سلسلے میں بات چیت ہوئی امید کرتے ہیں کہ نائیک کے بانی فل نائیٹ اور دیگر عہدیدار اپنی ذمہ داریاں بہترین طور پر ادا کر کے ان اداروں کی ساکھ میں بہتری پیدا کر سکیں۔ میں نے اس سلسلے میں لیسلی اور جم سے رابطہ کیا مگر ان کا جواب زیادہ اطمینان بخش نہ تھا انہوں نے بتایا ۲۰۰۰ء کے بعد ہم وہاں دوبار جا چکے ہیں اور وہاں کے مزدوروں اور مزدور تنظیموں سے بھی رابطہ میں ہیں لیکن ان کے مطابق بہت معمولی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں مگر قلیل تنخواہیں اور آزاد یونین بنانے کے اختیارات جیسے مسئلے اپنی جگہ پر ہی موجود ہیں۔

انڈونیشیا میں کم سے کم سرکاری تنخواہ کی حد بڑھا دی گئی ہے مگر پانی، خوراک، کھانا پکانے کا تیل، کپڑے، رہائش اور دیگر بنیادی ضروریات کی قیمتیں بھی اسی حساب سے بڑھ رہی ہیں۔ مزدوروں کو اب بھی یہ مشکل فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ خود کھائیں یا اپنے بچوں کو کھلائیں۔ آخری دفعہ جب ہم انڈونیشیا گئے تو نائیک کارخانے کا ایک مزدور ہم سب سے نہایت بے تکلفی سے ملا اور مسکرا کر کہنے لگا کہ سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ بھی نہیں بدلا۔

جس چیز میں واقعی تبدیلی رونما ہوئی وہ ہے تیل کی قیمتیں جس سے کام پر آنے اور جانے کے اخراجات مزید بڑھ گئے ہیں۔ اب مزدوروں کی قلیل تنخواہوں کا ۳۰ فیصد صرف دفتر تک پہنچنے اور واپس آنے کے کرائے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ وہ مرد اور عورتیں جو کئی کروڑ ڈالرز مالیت کی کارپوریشنز میں ہفتے کے چھ سات دن کام کرتے ہیں ان کو دو وقت کے کھانے میں چاول اور نمک ملتا ہے۔

۱۹۹۰ء کے اوائل میں نائیکی نے سویٹ شاپس میں حالات پر ہونے والی تنقید کے جواب میں بیان جاری کیا تھا کہ ناقدین جانتے ہی نہیں ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور جن کارخانوں سے ہمارے ٹھیکے ہوئے ہیں وہ ہماری ملکیت نہیں ہیں اس لئے ہم وہاں کے ماحول میں تبدیلی پیدا

کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ ہمیں اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ ۲۰۰۰ء میں نائیکی نے موقف اپنایا تھا ''جائز مسائل مگر غلط کمپنی'' ۲۰۰۲ء میں نائیکی کے عہدیدار امریکہ کے ان تمام کالجوں میں ہمارا تعاقب کیا کرتے تھے جہاں اس نازک مسئلے کی طرف نشاندہی کرنے کے لئے ہم تقاریب کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے خطاب سے پہلے ان کالجوں میں ایسا تحریری مواد تقسیم کیا کرتے تھے جو ان تمام حقائق کو جھٹلاتے تھے جس کے بارے میں ہم بات کیا کرتے تھے اور پھر ان کالجوں اور ہائی اسکولوں کے اخبارات کے اداریہ میں ہمیں ناقص معلومات رکھنے والوں کے طور پر پیش کیا جاتا تھا لیکن اب نائیکی کی حکمت عملی میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور وہ سماجی ذمہ داری کے حوالے سے منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہاں کچھ مسائل موجود ضرور ہیں مگر ان کا حل کمپنی میں حصص رکھنے والوں کے باہمی رضامندی سے ممکن ہے۔ (لیکن وہ سب بھی نائیکی کی شرائط کے مطابق ہی ہوگا)

اس دوران ۱۹۹۰ء کے عشرے میں رونما ہونے والے کچھ اور واقعات منظر عام پر آئے ہیں جیسے کہ فاقے پر مجبور کر دینے والی قلیل تنخواہیں، پورے دن میں صرف دو دفعہ غسل خانے جانے کی اجازت اور یونین بنانے اور چلانے والوں کے ساتھ زبانی، جسمانی اور جنسی زیادتیوں کے علاوہ جسمانی تشدد بھی روا رکھا جاتا ہے اور یہ واقعات پوری دنیا میں پھیلے نائیکی کے کارخانوں میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے تھے۔

''اگر نائیکی صرف انڈونیشیا کے مزدوروں کی تنخواہیں دگنی کر دے جو اس کے کل مزدور طاقت کا ۶/۱ فیصد حصہ ہیں اور ان کی کل مالیت ان کے ۱ء۶۳ بلین ڈالرز کے اشتہاری بجٹ کا صرف ۷ فیصد حصے کے برابر ہوگی۔ اگر نائیکی اپنے اشتہاری بجٹ کا کچھ حصہ کارخانے میں بننے والی ہر تیار شدہ شے پر زیادہ بہتر آمدنی کے طور پر دینے لگے تو پھر سویٹ شاپس کی ایسی دگرگوں حالت ختم ہو سکتی ہے۔''

لیسلی اور جم معاشی تباہ کاروں کے نظریاتی دشمن تو ہو سکتے ہیں لیکن کرائے کے قاتلوں کی پہنچ سے باہر ہرگز نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے ایک اندھیری رات کا ذکر کیا تھا جب انہیں ان کے کیمرہ مین جوئیل، ان کے انڈونیشین ڈرائیور اور مترجم کا کچھ بدمعاشوں نے تعاقب کیا تھا۔

جم نے بتایا ''انہوں نے ہماری گاڑیوں کو موٹر سائیکلوں سے گھیر لیا تھا۔ ہمارے ڈرائیور نے گاڑی قریبی چیک پوسٹ کی طرف بھگا لی مگر وہاں موجود فوجی نے ہمیں وہاں سے بھگا دیا تھا۔''

لیسلی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا" ہمارے ڈرائیور کو مجبوراً گاڑی روکنا پڑی۔ ہمیں دھکیل کر گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمیں قتل کر دیا جائے گا اور ہمارا نام "لاپتہ افراد" کی فہرست میں ڈال دیا جائے گا۔"

وہ لوگ تو بچ گئے تھے لیکن ڈرائیور کو بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا جوئیل جو وہیں بیٹھا تھا بڑبڑایا" وہ ہمیں دھمکانے کے لئے کیا گیا تھا۔"

میں نے پوچھا تو کیا تم لوگوں کو سمجھ میں آ گیا کہ اب کیسے پیش آنا ہے؟

جم بولا" اب ہم مستقبل میں زیادہ محتاط رہیں گے، کسی جگہ جانے سے پہلے اطمینان کر لیا کریں گے اور دیرات کا بھی خیال رکھا کریں گے مگر ہم واپس ضرور جائیں گے اور یہ دستاویزی فلم ضرور مکمل کر کے دنیا کو دکھائیں گے۔"

اسٹون اینڈ وبسٹر، فری پورٹ میک موران، نیومونٹ کے بارے میں مضامین پڑھ کر اور لیسلی، جم اور جوئیل کے تجربات سن کر میں دوبارہ اپنے ماضی میں کی گئی غلطیوں پر کڑھ رہا تھا۔ مجھے ان تمام لوگوں پر شدید غصہ آ رہا تھا جو سویٹ شاپس میں تیار کردہ مصنوعات کو خریدتے اور استعمال کرتے ہیں۔ انڈونیشیا کی کہانی ایک ایسی کہانی ہے جو بار بار دہرائی جا چکی ہے دراصل یہ امریکی سلطنت کی خفیہ تاریخ ہے۔

بدقسمتی سے اس سلطنت نے تمام تر ناکامیوں کے باوجود ایسا نمونہ تیار کر دیا ہے جس کی بار بار تقلید کی جائے گی۔ ۲۰۰۴ء میں تبت کے دورے کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ چین نے اپنی پسند کے اعتبار سے معاشی تباہ کار اور کرائے کے قاتل پال رکھے ہیں جو بالآخر ہم سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔

باب نمبر:۱۱

بدھ مت کے پیروکار نہ بنو

تبت دلائی لامہ کی سرزمین کے طور پر پہچانا جاتا ہے جو ایک ایسے روحانی پیشوا ہیں جو اس وقت کرۂ ارض پر عدم تشدد کی علامت سمجھے جاتے ہیں مگر تبت ایسی اچھی شہرت کا حامل نہیں ہے۔ ۶۰۹ عیسوی سے لے کر ۶۴۹ عیسوی کے درمیانی حصے میں تبت کے بادشاہ سونگسین گیمپو نے جنگجو سرداروں سے اتحاد بنایا تھا تاکہ وہ اردگرد کی جاگیروں پر قبضہ کر سکے۔ نتیجتاً بادشاہ ایک مصنوعی سلطنت تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا بعد میں اس علاقے پر چنگیز خان نے حملہ کر دیا تھا اور پھر یہ علاقہ ایک ایسی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا جو تاریخ میں بدترین بربریت کی مثال کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔

میں جون ۲۰۰۴ء میں ۱۳۴ افراد پر مشتمل ایک گروپ لے کر تبت گیا تھا۔

دیہاتی علاقے میں گاڑی چلاتے ہوئے جب ہم اپنے پہلے پڑاؤ سیڈانگ کے شہر پہنچا تھا تو ہم پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ خاتون گائیڈوں میں سے ایک تبت اور اس کی زبان سے قطعی ناواقف تھا بلکہ سوزی کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی اس کی تبتی سے حد درجہ بہتر ہو گی۔ جلد ہی یہ بات پھیل گئی کہ وہ چینی جاسوس ہے۔ ہمیں اپنی بات چیت میں احتیاط برتنی ہو گی۔ ہمارے نیپالی گائیڈ نے جلد ہی اس افواہ کی صداقت کی تصدیق کر دی تھی اور ہمیں یہ ہدایت کی کہ یہ بات سب کو بتا دی جائے۔ ایک دفعہ جب سوزی بس سے اتر کر ایک پڑاؤ پر اتری تو اس نیپالی گائیڈ نے ہمیں آگاہ کیا کہ ہم سب کو ایسے پیش آنا ہو گا جیسے ہمیں کوئی مستقل سن رہا ہو۔

ایک خاتون نے پوچھا" کیا خانقاہوں اور مندروں میں بھی احتیاط برتنی ہو گی؟"

گائیڈ نے جواب دیا" ان جگہوں پر زیادہ احتیاط کرنا ہو گی۔"

سیڈانگ تبت کی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں کے سائے تلے یہ علاقہ اس خطے کی تہذیب کے چند قدیم مراکز میں سے ایک ہے۔ ہم ایک سنسان چینی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں کمرے میں سامان رکھتے ہی باہر نکل پڑا تھا۔ میں اپنے گروپ سے الگ تھلگ رہ کر کچھ وقت اس بلند مقام سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ سفری تھکاوٹ بھی جھٹکنا چاہتا تھا تاکہ تبت سے

پوری طرح لطف اندوز ہوسکوں۔ اگرچہ میں دوپہر کے آخری حصے میں مٹر گشت کر رہا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے مجھے جادوئی قالین پر بٹھا کر سیڈانگ کی سڑکوں پر چھوڑ دیا ہو۔ میں اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ میں پرانے تبت میں تھا بلکہ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں چینی فوج کی چھاؤنی میں اتر گیا ہوں۔

وردیوں میں ملبوس چینی فوجی نئے تعمیر شدہ پکے راستوں پر بھاگتے پھر رہے تھے۔ چھتوں سے عاری بازار اور پرانی دکانوں میں چینی مصنوعات فروخت کی جارہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے چھابڑی والے بھڑکیلے رنگوں کے برتن، کھلونے اور دودھ رکھنے کے گگرے بیچ رہے تھے۔ کچھ قدیم عمارتیں اب بھی موجود تھیں لیکن زیادہ تر کی جگہ اب چینی فوج کے لئے سیاہی مائل مضبوط عمارات کھڑی ہوگئی تھیں۔ تبت کے لوگ اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ پندرہویں صدی کے فر کے کوٹوں، جوتوں اور ٹوپیوں جیسے عجائبات کی طرح وہ خود بھی اپنے ہی سرزمین پر اجنبی محسوس ہو رہے تھے۔ فوجی ان سے بے عزتی سے پیش آرہے تھے جیسے کہ وہ پاگل فقیروں کے درمیان موجود ہوں۔ بے چینی ہمالیہ کی فضاؤں میں واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے ہر قدم کے ساتھ میری تھکن شدید ہوتی جارہی تھی۔ شروع میں میں اس کے لئے آنڈیز اور کشمیر کی بلندی کو ذمہ دار سمجھا۔ تھکاوٹ غنودگی میں بدلنے لگی تھی اور پھر میری طبیعت متلانے لگی۔ میں قریب میں بنی بینچ پر بیٹھ گیا۔ ''آزاد تبت'' کا نعرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا اور مجھے احساس ہوا کہ میں جذباتی اور نفسیاتی طور پر شل ہو رہا تھا۔ میں اپنے اردگرد کے ماحول پر توجہ مرکوز کرنے لگا۔ لوگ چلے جارہے تھے۔ بہت سے چینی اور کچھ تبتی لوگوں نے مجھے خاص توجہ نہ دی۔ میں کمزوری محسوس کر رہا تھا مگر کسی نے شاید مجھے دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ میں بالکل پاگل فقیر لگ رہا تھا۔

جب میری طبیعت بحال ہوئی تو مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں دلائی لامہ کی تصویر تھی۔ میں نے احتیاطاً جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ صرف ان کی تصویر رکھنے پر مجھے گرفتار کیا جاسکتا تھا کیونکہ جدید تبت میں ان کی تصویر رکھنا غیر قانونی تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ لاکھوں لوگ ان کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ میں اس تصویر کو احتجاجاً چینی ایئرپورٹ پر چینی محافظوں سے چھپا کر یہاں تک لایا تھا کیونکہ ایک تو یہ تصویر میں ان کے کسی ماننے والے کو تحفتاً دے سکتا تھا اور دوسرا میں اس وقت کو عزت دینا چاہتا تھا جو میں نے اس عظیم ہستی کے ساتھ پانچ سال پہلے

گزارے تھے۔

اس دورے کا انتظام کرنے والی شینا سنگھ نے ۱۹۹۹ء میں ایک اور دورہ طے کیا تھا۔ اس وقت ہم لوگ سفر کرتے ہوئے بھارت سے ملحقہ لداخ کے راستے کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔ جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان واقع ہے۔ آج کل اس علاقے میں ہزاروں تبتی مہاجرین آباد ہیں جو اس علاقے میں ان روایتوں کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں جن پر ان کے اپنے ملک چین میں پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت دلائی لامہ لداخ ہی میں موجود تھے۔ شینا کو معلوم تھا کہ وہ مقامی ثقافتوں میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور اسی لئے اس نے میری ایک کتاب جو اس مضمون سے متعلق تھی ان کو اس درخواست کے ساتھ بھجوادی کہ وہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ہمارے لئے بھی نکال لیں اپیل کر دی تھی۔ ایک روز بعد ان کے عملے کے کچھ حضرات ان کا جواب لے کر ہمارے ہوٹل آئے تھے اور ہمیں آگاہ کیا تھا کہ وہ آج کل بے حد مصروف ہیں اور ہمیں ان کے دستخط کردہ کتابوں کا ڈبہ تحفتاً دے کر روانہ ہوگئے۔

تبت میں ہماری آخری صبح کے موقع پر جب ہم شمالی ہندوستان جانے کے لئے فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے تو ہم حیران رہ گئے کہ دلائی لامہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چھوٹے سے ایئرپورٹ میں داخل ہوئے۔ شینا فوراً ان کے سیکرٹری کی طرف بڑھی تھی۔ جہاز پر چڑھنے کا عمل شروع ہوگیا تھا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا مجھے جہاز کی سیڑھیوں پر کسی نے دھکا دیا اور ہمارا انڈین گائیڈ پروٹوکول توڑتا ہوا دلائی لامہ کے جوتوں کو چومتا ہوا بوئنگ ۷۳۷ کی پہلی قطار میں جا پہنچا۔ دلائی لامہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اپنی برابر والی نشست میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے جوتوں کو چومنے کا خیال کافی عجیب تھا مگر مقامی روایات کی عزت کرنے کی اہمیت سے میں واقف تھا۔ اس لئے بے چارگی کے عالم میں ان کے پیروں کی طرف جھکا۔

دلائی لامہ مجھے اس طرح دیکھ کر ہنس پڑے اور میری تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے میرے سر کو اوپر اٹھا کر بولے ''ایسا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے'' انہوں نے یہ بات اتنی نرم اور کھلکھلاتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہی کہ ایسا لگا جیسے ساری دنیا پر محبت چھا گئی ہو۔ انہوں نے برابر والی نشست پر ہاتھ تھپک کر کہا ''بیٹھو'' جو کتاب ان کی گود میں رکھی تھی اس کا کونا وہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر مار رہے تھے۔ میری کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''یہ کافی اچھی کتاب ہے، میں اس بارے میں مزید جاننا چاہتا ہوں۔''

ہم نے مقامی لوگوں اور زندگی میں توازن رکھنے کے رویے سے ان کی محبت کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ امیزون کے رہنے والے شوار قبائل کے باشندے کیوں انسانوں کو قتل کرنے لگے تھے اور جنگوں میں مشغول ہو گئے تھے کیونکہ ان کی قدیم داستانوں کے مطابق ان کی اپنی آبادی قابو سے باہر ہو گئی تھی اور اس وجہ سے اور زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا نتیجتاً ان کے خدا نے انہیں ذمہ داری سنبھالنے کا حکم دیا تھا جس کے مطابق ضرورت پڑنے پر چاہے انہیں اپنا ہی باغ کیوں نہ اجاڑنا پڑے (اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو مارنا)

اس کہانی نے دلائی لامہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگرچہ وہ تشدد کے حامی نہیں ہیں مگر امن صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب انسان تمام جانداروں کا خیال رکھے اور جب ہم انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس زمین کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ معاشی ترقی عام طور پر دوسری حیاتی صورتوں یعنی جانداروں کو نقصان پہنچاتی ہے اور عدم توازن کا باعث بنتی ہے جس سے امیر امیر ہوتا ہے اور غریب غربت کے اندھیروں میں کھو جاتا ہے۔ ہم نے تفصیلاً ایسے اقدام اٹھانے کی اہمیت پر زور دیا جس سے دنیا میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ صرف باتیں کرنے اور دعا سے مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔

اس فلائٹ کے بعد دلائی لامہ نے مجھے اور میرے گروپ کو اپنے گھر دھرم شالہ، ہندوستان مدعو کیا۔ رسمی بات چیت کے بعد انہوں نے ہمیں کچھ ایسا کہا جو ہمیں بہت عجیب محسوس ہوا تھا خصوصاً جبکہ وہ ایک روحانی پیشوا بھی تھے۔ انہوں نے کہا "بدھسٹ نہ بنئے، دنیا کو مزید بدھ مت کے ماننے والوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمدردی کے رویے کو اپنایئے دنیا کو ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

سیڈانگ کی اس بنچ پر بیٹھے ان کی تصویر ہاتھ میں تھامے میرے ذہن میں ان کے الفاظ گونج رہے تھے۔ میں ایک مذہبی رہنما سے اس طرح کے پیغام کی امید نہیں رکھتا تھا اور اس طرح کے الفاظ کی امید میں نہ تو چین کے صدر سے کرتا ہوں اور نہ ہی امریکہ کے صدر سے۔ یہ الفاظ کسی بھی مذہب کی تبلیغ کے عین منافی تھے اور اسی طرح کسی سلطنت کے قیام کو بھی جھٹلاتے تھے۔ میں دلائی لامہ کی تصویر کو گھور رہا تھا اور ان کی اس ہدایت پر غور کر رہا تھا کہ ان کے ماننے والے کسی طرح کے تشدد کا حصہ نہ بنیں جو آئندہ آنے والی نسلوں کو نقصان پہنچائے۔ مجھے اپنے نااہل ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے چین کے رویے پر شدید غصہ آ رہا تھا مگر ایک ایسے شہر میں بیٹھ کر غصہ کرنا جو

کہ نوآبادیاتی سلطنتوں کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت تھا کچھ احمقانہ سی حرکت معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے اس وقت عزم کیا تھا کہ میں اپنی باقی زندگی ان بدصورت رویوں کو بدلنے میں وقف کر دوں گا جو دنیا کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں اس دنیا کو درپیش مسائل کے بارے میں لکھوں گا اور بات کروں گا جو استحصالی، خوف اور تشدد کی وجہ سے وجود میں آئے تھے۔ میں اصل حل کی تلاش کروں گا اور لوگوں کو ٹھوس اور مثبت اقدام اٹھانے کی ترغیب دوں گا اور دوسری طرف اپنے رویوں میں بہتری لانے کی کوشش کروں گا۔ میں جان گیا تھا کہ ایک سلطنت کو دوسری سلطنت سے بدلنا یا خوف کا علاج خوف سے کرنا غلط ہے۔ ہمیں اس سلسلے کو روکنا ہو گا۔

باب نمبر:۱۲

حیاتیاتی ضروریات

ہم نے تبت کا دورہ آٹھ ٹویوٹا لینڈ کروزر میں کیا تھا۔ جب ہم بھاری بوجھ کے نیچے دبے ہوئے مزدوروں کو اپنی شاندار گاڑیوں میں بیٹھے برابر سے گزرتے ہوئے دیکھتے تھے تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ پاتا تھا کہ ہم ان لوگوں کو آسمان سے اتری ہوئی برتر اور اعلیٰ مخلوق کے طور پر نظر آتے ہوں گے جیسے کہ ہم خدا کے منتخب بندے ہیں، پہاڑوں کے درمیان واقع ایک سرائے میں ہم ستانے کے لئے رکے تھے تو میں نے اپنے گروپ کے کچھ لوگوں کو طنزاً یہ کہتے ہوئے پایا کہ ان غریبوں کو ہمارا قافلہ بادشاہوں کے قافلہ جیسا لگا ہوگا۔

ان میں سے ایک آدمی نے ہنستے ہوئے کہا ''کیا مذاق کر رہے ہو؟ یہ سفر تو جہنم میں سفر کرنے کے مترادف ہے۔ ہمارے پاس گاڑیاں ضرور ہیں مگر میری گاڑی کے ڈرائیور کو تو گیئر بدلنا بھی نہیں آتا ہے اور ہمارے آگے والی کروزر سے تیل مستقل ٹپک رہا ہے اور یہ والی گاڑی باقی گاڑیوں کے ساتھ رفتار برقرار نہیں رکھ پا رہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ بادشاہ اس طرح کی بے مقصد چیزیں پسند کرتے ہوں گے۔''

وہ سچ کہہ رہا تھا، امریکی معیار سے یہ سفر کافی کٹھن تھا۔ قدیم زمانے کی تعمیر شدہ بہترین سڑکوں پر ہمیں آج ایسی دقت پیش آ رہی تھی جیسے ہم سمندر کی سطح میں پڑے بڑے بڑے گہرے گڑھوں میں سفر کر رہا ہوں۔ ہمالیہ کی فضا گاڑیوں اور مسافروں دونوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ایک پڑاؤ میں ہم پر کیڑوں نے حملہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف مناظر تصور سے بھی زیادہ دلکش اور دلفریب تھے اور سب لوگ صاف ستھرے بستروں اور لذیذ کھانوں سے بہت خوش تھے۔ ہم بنجاروں سے بات چیت کا کوئی موقع نہ جانے دیتے، وہ ہم غیر ملکیوں سے بات نہ کرنے کے چینی احکامات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہمارے گائیڈز نے ہمیں انتہائی خوش دلی سے پنچین لاما کا گھر دکھایا تھا جس کو ۶ سال کی عمر میں چینیوں نے اس کو متبادل کے طور پر چنا تھا جسے پہلے دلائی لامہ نے خود منتخب کیا تھا لیکن وہ غائب ہو گیا تھا کیونکہ یہ پنچین لامہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اگلا دلائی لامہ کا انتخاب کرے تو بدھ مت راہب اور ہم خیال شہری احتجاجاً سڑکوں پر آ گئے تھے۔ لاتعداد افراد کو قید،

جلاوطن اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے ہم نے ان تمام خانقاہوں پر حاضری دی جو ثقافتی انقلاب کے دوران برباد کر دی گئی تھیں۔

تبت کے سفر کے دوران ہم نے چینی مظالم کو کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان مظالم کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ یہ مظالم بار بار اس زخم کو تازہ کر دیتے تھے کہ تبت ایک مقبوضہ علاقہ ہے، اس کے عوام غلام ہیں اور اس کی قدرتی ذخائر کی دولت کو بے دردی سے لوٹا جا رہا تھا۔ ہم نے یہاں مشاہدہ کیا کہ امریکی کارپوریشنز جن ممالک کے وسائل کو ہڑپنا چاہتا ہے وہاں ایسے ہی دردناک انداز کی کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔ اس گروپ کے کئی اراکین میرے ساتھ امیزون بھی جا چکے تھے۔ وہ سب امریکی کارپوریشنز کے ہاتھوں وہاں کے بارانی جنگلات اور ثقافتوں کی تباہی کے چشم دید گواہان تھے۔ ان تمام لوگوں نے ان علاقوں میں بڑھتی مادہ پرستی سے اپنی اولاد کے تحفظ کے لئے مقامی لوگوں کو آخری سانس تک لڑنے کا عزم کرتے دیکھا تھا۔ انہوں نے امریکی فوجوں کو امیزون کے قصبوں میں ایسے دندناتے ہوئے پھرتے دیکھا تھا جیسے چینی فوجی آج تبت میں پھرتے ہیں۔ ہمارے گروپ کے اکثر اراکین تبت میں چینی موجودگی کو امریکی حکومت اور ہماری تیل، لکڑی، گوشت، دوائیاں اور دیگر تیار شدہ اشیاء کی کمپنیوں کی امیزون، وسطی ایشیا، افریقہ، ایشیا، عراق اور افغانستان میں موجودگی سے موازنہ کیا کرتے تھے۔

ہاسا سے واپسی پر ہمیں یہ معلوم تھا کہ ہم اگلی صبح نیپال روانہ ہو جائیں گے اور اسی لئے ہم نہایت شاندار درہ کارولا اور کھمبالا دیکھنے گئے تھے۔ ۱۷ ہزار فٹ کی بلندی پر ہمارا قافلہ گلیشیئر دیکھنے رک گیا تھا۔ ہمارے ایک گائیڈ نے بتایا کہ دو عشرے پہلے تک برف سڑک کے کنارے تک آتی تھی مگر ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے ایک چوتھائی میل یا اس سے بھی زیادہ سکڑ گئی ہے۔ بھیڑیں اور یاک ہماری گاڑیوں کے برابر گھاس چر رہی تھیں۔ ان کے اور گلیشیئر کے درمیان کئی کالے خیمے تنے ہوئے تھے۔ کندھے تک آئے ہوئے بارہ سے پندرہ فٹ چوڑے خیمے زمین میں بھاری رسوں سے گڑھے ہوئے تھے جو مضبوط بانسوں کی پشت میں آڑھے ترچھے انداز میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کی چھتوں سے دھواں اٹھ رہا تھا ان خیموں کے عقب میں لال، نیلے، پیلے، ہرے اور سفید عبارتی جھنڈے اونچے ڈنڈوں سے ڈوریوں کے جال کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے گلیشیئر سے ہو کر گزرتی ہوئی برفانی ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔

ہم جیسے ہی اپنی گاڑیوں سے باہر آئے تبتی بھی اپنے خیموں سے باہر آ گئے تھے۔ مردوں

نے اونی پتلونیں، بھاری جیکٹیں اور ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں جبکہ عورتوں نے لمبے لباس پر شوخ رنگ کے ایپرن پہنے ہوئے تھے۔ گائیڈز نے ہمیں بتایا یہ وہ خانہ بدوش ہیں جو یہاں بالکل ویسے ہی رہتے ہیں جیسے ان کے باپ دادا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے یہاں رہا کرتے تھے۔ ہمارے مترجم کے ذریعے خانہ بدوشوں نے ہمیں بتایا کہ ''ییٹس'' Yetis (قابل نفرت برفانی لوگ) گلیشیئر پر رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں آگاہ کیا کچھ عرصے پہلے تک وہ انہیں سال میں کئی بار دیکھا کرتے تھے مگر پچھلے دس سالوں میں گلیشئر کے سکڑنے کے ساتھ ییٹس بھی غائب ہو گئے ہیں۔

جب ہم بیٹھے گلیشیئرز پر عالمی حدت میں اضافہ سے ہونے والے اثرات کے متعلق بات چیت کر رہے تھے تو کسی نے ہماری توجہ خانہ بدوشوں کی بنائی ہوئی دکان کی طرف کرائی اور پھر ہمارے گروپ کی ایک ایسی خاتون جو سستی چیزوں کی بہت شوقین تھی ہماری طرف بھاگی چلی آرہی تھی۔ اس نے ہمیں آکر بتایا کہ خانہ بدوش شفاف شیشے جیسے پتھر فروخت کر رہے ہیں جو انہیں گلیشئر پگھلنے سے خالی ہو جانے والی زمین سے ملے تھے۔ ہمارے گروپ کی اکثریت اس دکان کی طرف لپکے کیونکہ یہ مقامی لوگوں سے کچھ خریداری کرنے کا آخری موقع تھا کیونکہ ہاسا میں قائم دکانوں سے تو مقامی باشندوں کو اس طرح کی سرگرمیوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

جب میں نے گائیڈ سے چمکتے پتھروں کے اصلی ہونے کی بابت دریافت کیا تو وہ بڑبڑایا کہ وہ خانہ بدوشوں کی کمائی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ پھر کہنے لگا کہ اس نے سن رکھا ہے کہ چین کے ایک کارخانے میں اس طرح کی اشیاء تیار ہوتی ہیں۔ میں اور چند لوگ خرید و فروخت کے اس سلسلے کو کھڑے دیکھ رہے تھے۔

میرا ایک ساتھی بولا ''عالمی حدت میں اضافہ کی وجہ سے اتنا خرچہ۔''

تو کسی اور نے کہا ''یہاں یہ عظیم الشان گلیشئر ہے، خیمے ہیں، یہ مقامی لوگ ہیں، یاک ہیں مگر ہمارا گروپ ان پتھروں پر فریفتہ ہیں جو شیشوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں۔''

مترجم کو اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر میں قریب بیٹھے ایک مرد، عورت اور لڑکی کی جانب بڑھا۔ بوڑھی عورت یاک کی رسی تھامے بیٹھی تھی۔ اس جانور کی کھردری پشت پر ایک خوبصورت کمبل سجا ہوا تھا جس پر کتھئی اور خاکی رنگ کے مثلث بنے ہوئے تھے اور اس کی کمر پر چھوٹی زین رکھی ہوئی تھی جو شاید کم عمر لڑکی کے لئے تھی۔ تینوں میری طرف والہانہ مسکراہٹ سجائے دیکھ رہے تھے۔

بوڑھی عورت کھڑی ہوئی اور یاک کو میری طرف پیار کرنے کے لئے لے کر آئی اور پھر وہیں بیٹھ گئی اور مجھے اور مترجم کو ان کے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔

تعارف کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں چینی کیسے لگتے ہیں؟ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھر انگلیوں سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ پہلے وہ ناراض نظر آئی اور پھر یکدم ہنس پڑی اور پھر بوڑھا بولا۔

اس نے اپنے بغیر دانتوں والے منہ سے کہا ''ہمیں دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے حکمرانوں کی عادت ہے۔ ہمارے دادا کے دادا سے پہلے سے ہمارے یہاں ان بادشاہوں کی کہانی سنی جاتی ہے جنہوں نے علاقوں پر قبضہ کیا تھا ہم ان کے فوجیوں کو ''خانہ بدوشوں کے قاتل'' کے نام سے پکارتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکی کے کندھے پر تھپکنے لگا، پھر اس نے کہا ''تو اب اس بیچاری کی زندگی میں چیزیں کیسے مختلف ہو سکتی ہیں؟''

بوڑھی عورت بولی ''مسئلے اس وقت جڑ پکڑتے ہیں جب ان چیزوں کی باگ ڈور مرد سنبھال لیتے ہیں۔'' میں نے حیران ہو کہ اس کا مطلب پوچھا تو وہ بولی ''آج کل ہر طرف دیکھو ہر چیز مرد چلا رہے ہیں، میں کبھی شہر میں رہا کرتی تھی۔ جب میں نے بدھ مت اپنانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے وہاں دیکھا کہ سرکاری ملازمتوں کی طرح تمام اہم کام مرد کرتے تھے۔'' بوڑھا شخص بولا ''ہاں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ماضی میں عورتیں ہم مردوں کو قابو میں رکھتی تھیں۔'' پھر مسکرا کر بتانے لگا ''ہم مرد کافی جنگلی ہوتے ہیں، شکار کرنا اور جنگلوں کو کاٹنا جیسے کام کرتے رہتے ہیں، عورتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ہم کافی تباہی مچا چکے ہیں۔''

اس بات چیت نے مجھے امیزون کے شوار قبیلے کی یاد دلائی تھی۔ وہ مانتے تھے کہ مرد اور عورت برابر ہیں صرف ان کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔ مرد جانوروں کو خوراک کے لئے شکار کرتا ہے، درختوں کو آگ حاصل کرنے کے لئے کاٹتے ہیں اور جنگیں لڑتے ہیں جبکہ عورتیں بچے پالتی ہیں، فصلیں اگاتی ہیں، گھر کی دیکھ بھال اور آگ وغیرہ جلاتی ہیں اور سب سے اہم کام مردوں کو حیوانیت سے باز آنے کا درست وقت بتا دیتی ہیں۔ شوار وضاحت کرتے تھے کہ مرد کافی مقدار میں گوشت اور لکڑی اکٹھا کرنے کے بعد بھی جانوروں کو شکار اور درختوں کو کاٹتے رہتے ہیں اگر عورتیں انہیں نہ روکیں۔ شوار قبائل کے ارکان جب امریکہ آئے تھے تو وہ حیران ہوتے تھے کہ قدرت کس طرح تباہ کی جا رہی ہے اور اس کی جگہ شاہراہیں، شہر اور شاپنگ پلازہ بنائے جا رہے

ہیں۔ وہ اکثر پوچھا کرتے تھے ''عورتوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ مردوں کو کیوں نہیں روکتی ہیں؟ آپ لوگوں کی عورتیں ہمیشہ اور چیزیں خریدنے کی خواہش مند کیوں رہتی ہیں؟''

امیزون کے قبائل اور ہمالیہ کی چوٹیوں میں آباد بنجاروں کے اس طرح ملتے جلتے جذبات دیکھنا کافی حیران کن تھا، ہاسا سے واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ دونوں گروہ سچی انسانی اقدار کی ترجمانی کر رہے ہوں اور اس دنیا میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے شاید ہمیں مرد وزن کے توازن کو درست کرنا ہوگا۔ کارپریٹوکریسی کے مزاج کا جارحانہ پن اور زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے رجحانات کو تقویت دینے کی کوششوں کو روکنے کے لئے شاید مرد اور عورت دونوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ کم از کم اس طرح کے رویے سے یہ کام کچھ آسان ہو جائے۔ سچ یہ ہے کہ کارپریٹوکریسی کی بنیادی ساخت مردانہ درجہ بندی پر رکھی گئی ہے اور اس کی اصل قوت اس خواہش کو قبول کر لینے کے گرد گھومتی ہے کہ مادہ پرستی کی شدید تر شکل کو بھی معمولی نوعیت کا جان کر دل سے قبول کر لیا جائے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمیں اشیاء جمع کرنے اور خریدنے کی لت سے دونوں جنسوں کو بچانا ہوگا۔ اس بات کی نشاندہی اس بات سے ہوتی ہے کہ ۱۱/۹ کے بعد امریکی صدر نے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے کی تلقین کی تھی تا کہ وہ پریشانی سے پیچھا چھڑا سکیں اور ذہنی تناؤ سے باہر آ سکیں اور اس خریداری کے ذریعے معیشت کو سہارا دیں اور دہشت گردی کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔ یہاں تک کہ تبت میں بیٹھے یہ مویشی چرانے والے جو چکا چوند کر دینے والے شاپنگ مالز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہیں اس پیغام سے نہ بچ سکے اور اپنی قناعت پسند رویوں کے باوجود ہمیں یہ اشیاء بیچ رہے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر جوڈیتھ ہینڈ کی کتاب ''عورت، طاقت اور امن کی حیاتیات'' یاد آ رہی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے نشاندہی کی تھی کہ جنگیں لڑنے کے کام نے تاریخی طور پر مرد کو اپنی حیاتیاتی ذمہ داری جو اولاد پیدا کرنا ہے اٹھانے کا راستہ فراہم کیا ہے جبکہ معاشی توازن عورت کی ذمہ داری ہے جو دیکھ بھال، پرورش اور اولاد پانے جیسے جذبات سے آراستہ ہے۔ انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ پرامن معاشرے تشکیل دینے کے لئے خواتین کو فیصلہ سازی کے عمل میں زیادہ اہم کردار نبھانا ہوگا۔ خانہ بدوشوں کی باتیں سننے کے بعد مجھے ڈاکٹر ہینڈ کے نتائج کی تصدیق ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ کیونکہ آج کل کے جدید خاندانوں میں خواتین اصل خریدار ہیں اس لئے ان کا سمجھنا ضروری ہے کہ آج کی عالمی جدوجہد کارپریٹوکریسی کا استحکام ہے اور امن

کو تقویت دینے کے لئے انہیں مادہ پرستی کی طرف اپنے رجحانات بدلنے ہوں گے۔ انہیں یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ جن اداروں کی بنائی ہوئی اشیاء خریدتے ہیں ان کو اپنے مزدوروں کو چاہے وہ کہیں کے بھی رہنے والے ہوں ان کے برابری کے حقوق دینے ہوں گا۔

دلائی لامہ کے آبائی شہر میں آج میں نے نہایت مختلف بات سیکھی تھی۔

سرمائے کے آمرانہ پہلو

اس دورہ کے دوران ہم جن شہروں میں گئے تھے ان میں سب سے زیادہ تبّتی ہاسا اچھا لگا تھا۔ بوٹالا کا وہ محل جہاں دلائی لامہ نے پرورش پائی تھی اس کی چکردار گلیاں، کئی کئی چھتوں والے بدھسٹ مندر، دیونما تکون شکل کے اسٹوپا اور سجے سجائے مزارات دیکھ کر اس سکون کا احساس ہوتا تھا جو میں نے پانچ سال پہلے لداخ اور تبت کے دیہی علاقوں میں محسوس کیا تھا مگر ایسا ماحول سیڈانگ اور دوسرے شہروں میں نہیں پایا جاتا تھا مگر چینی فوجی ہر جگہ موجود ہوتے تھے۔ ادھر ادھر اکڑے پھرتے تھے، چینی کردار بینروں اور اشتہاروں پر چھائے ہوئے تھے اور جدید صنعتی معاشروں کی پہچان پلاسٹک سے تیار شدہ مصنوعات ہر طرف نظر آتی تھیں۔

ہم ایک نہایت خوبصورت ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس کا نقشہ، ملکیت اور نظام میں تبّتی باشندوں کی محنت کا ثمر تھا۔ میں اپنے بستر پر جب جا کر لیٹا تو اردگرد رنگ برنگے تکیوں کا انبار لگا ہوا تھا اور میں اپنے جیبی کمپیوٹر پر کچھ دستاویزات کا جائزہ لینے لگا جس کو میں اپنے سفر وغیرہ کے دوران ساتھ رکھتا تھا۔ میں مادہ پرستی، تجارت پسندی اور ایشیاء کے لئے تباہ کن ثابت ہونے والے ۱۹۹۷ کے معاشی بحران میں بین الاقوامی اداروں کے کردار کے بارے میں تازہ ترین صورتحال جاننا چاہتا تھا۔ انڈونیشیا پر اثر انداز ہونے والے حالات جو اس بحران کے بعد پیدا ہوئے تھے ان کے بارے میں میں پہلے کافی تحقیق کر چکا تھا مگر تبت میں موجود ہونے اور یہاں پر چینی استحصال کا مشاہدہ کرنے کے بعد ۱۹۹۷ء کے المیے کو میں ایک مختلف پہلو سے دیکھ رہا تھا۔

آئی ایم ایف بحران جو عام طور پر شمالی کوریا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کے لئے زیادہ تباہ کن سمجھا جاتا ہے مگر اس نے لاؤس اور فلپائن کے غریب طبقے کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ یہ تمام ممالک آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے نظریات کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

بحران کے بعد ہونے والی تنقید اور تجزیوں میں زیادہ تر ماہر معاشیات نے آئی ایم ایف کو ''تیز تر سرمایہ دارانہ نظام عمل میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا جیسے کہ سرمائے کی ترسیل پر پابندیوں کا خاتمہ، نجکاری کی حوصلہ افزائی، بیرونی سرمایہ کاروں کو سرمایہ داری کی ترغیب دینے کے

لئے پرکشش شرح سود اور اچھے شرح سود کے بل پر بینکوں کے سرمائے کو حصص بازار میں منتقل کرنے کا نظام، کرنسی، خطرے سے بچنے کے لئے مقامی کرنسیوں کو ڈالر سے پابند کرنے کی کوششیں جس سے ڈالر کو مضبوط کیا جا رہا تھا اسی دوران آئی ایم ایف کی نافذ کردہ شرح افراط زر اور بلند شرح سود کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا اور صورتحال قابو سے باہر ہو رہی تھی جیسے جیسے ایک کے بعد دوسرا ملک اس بحران کا شکار بن رہا تھا مقامی کاروباری ادارے اور قومی حکومتوں کے لئے ان قرضوں کی واپسی مشکل ہوتی جا رہی تھی جو انہوں نے ڈالر کی صورت میں لئے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر یہ انکشاف بھی ہو رہا تھا کہ ان کی کمائی ہوئی رقوم مستقل گھٹ رہی تھیں کیونکہ وہ مقامی کرنسی کی صورت میں ادا کی جاتی تھیں اور ڈالر کے مقابلے میں اپنی اصل قیمت کھو چکی تھیں۔ آئی ایم ایف نے ان ملکوں اور ان کے مقامی اداروں کو ٹیکس کی صورت میں بھاری رقوم ادا کرنے کے لئے پھنسا لیا تھا اور اس صورتحال کا سارا فائدہ بین الاقوامی کارپوریشنز کو پہنچ رہا تھا۔

جب صورتحال مستقل خراب ہوتی گئی تو آئی ایم ایف اس بحران سے نجات کے منصوبے کے ساتھ میدان میں آئی۔ اس منصوبے کے ذریعے قوموں کو مزید نئے قرضے جاری کرنے تھے تاکہ یہ اقوام دیوالیہ نہ ہوں مگر اس منصوبے کی لازمی شرط یہ تھی کہ ہر ملک ''اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پیکیج'' SAP کو منظور کرے جو بالکل ویسا ہی منصوبہ تھا جیسا پہلے انڈونیشیا پر مسلط کیا گیا تھا۔ جس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ہر ملک مقامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو تباہ ہونے دے، حکومتی اخراجات کو انتہائی حد تک کم کر دیا جائے، خوراک، تیل اور غریبوں کے لئے دیگر خدمات پر جاری کی جانے والی سبسڈیز پر کٹوتی کی جائے اور شرح سود میں اضافہ کیا جائے۔ کئی اور معاملوں میں حکومتوں کو اپنے اثاثوں کی نجکاری کرنے کی تاکید کی گئی تاکہ ملٹی نیشنل ادارے ان کو خرید سکیں جس کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ لاتعداد افراد بالخصوص بچے غذائیت کی کمی، فاقے اور بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح کہیں بڑی تعداد علاج، تعلیم، رہائش اور دیگر سماجی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے کئی سالوں تک ابتر حالات کا شکار رہے تھے۔

جو بحران ایشیاء میں پروان چڑھا تھا اس کے نتائج پوری دنیا میں دیکھنے میں آئے تھے۔ یورپ، جنوبی امریکہ اور امریکہ بھی معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ ایک سبق تھا کہ اگر مقامی لوگوں اور معیشتوں کی مدد کرنا اصل مقصد تو بڑے اداروں کی تجویز کردہ پالیسیوں سے اجتناب برتا

جائے۔ یہ صورتحال آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی مکروہ حقیقت واضح کر دینے کے لئے کافی تھی۔

بعد میں کئے جانے والے تجزیوں نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ جن ممالک نے آئی ایم ایف کے مطالبات ٹھکرا دیے تھے وہ اس بحران سے بہتر انداز میں نبرد آزما ہو سکے تھے۔ ان میں سے ایک چین بھی تھا اگرچہ اس نے بھی بیرونی سرمایہ داروں کی سرمایہ داری کرنے کی حوصلہ افزائی جیسی حکمت عملی اختیار کی تھی مگر آئی ایم ایف کی تجویز کردہ طریقوں کے برعکس دوسری صورتیں اختیار کی تھیں۔ بیرونی سرمایہ کاری کا حصص بازاروں میں لگانے کے بجائے کارخانوں میں لگایا گیا تھا تاکہ ملک کو مستقبل میں سرمائے کی کمی سے محفوظ رکھا جا سکے اور ساتھ ہی روزگار کے دیگر مواقع پیدا کیے گئے تھے۔ اسی طرح ہندوستان، تائیوان اور سنگاپور نے بھی آئی ایم کی تجاویز ٹھکرا دی تھیں اور نتیجتاً ان کی معیشتیں توانا ہوتی گئیں۔ ملائیشیا جال میں پھنس گیا تھا اور اسے معاشی بدحالی برداشت کرنا پڑی تھیں اس کے بعد اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پیکیج سے جان چھڑائی تو صورتحال بہتر ہوئی۔

آئی ایم ایف کے چند بڑے ناقدین میں سے ایک معاشیات میں نوبل انعام یافتہ اور عالمی بینک کے سابق سربراہ جوزف اسٹگ لٹز تھے۔

میں اسٹگ لٹز کی کتاب ''گلوبلائزیشن اور اس کے غیر اطمینان بخش پہلو'' کو تبت کے دورے پر مطالعے کے لئے لے گیا تھا۔ ایک دوپہر جب میں ہاسا کی سڑکوں پر چہل قدمی کر رہا تھا تو میں ایک جگہ پہنچ گیا جو پیدل چلنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں سے کچھ دور میں ایک پارک میں لکڑی کی بنچ پر بیٹھ گیا اور ڈھلتے سورج کی کم ہوتی روشنی کو دیکھنے لگا۔

وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے اسٹگ لٹز کی کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' میں میری اور اسٹگ لٹز کی تنقید کافی معاملات میں ملتی جلتی تھی۔ اس نے کتاب تعلیمی نقطہ نظر سے لکھی تھی جبکہ میری کتاب ذاتی تجربات پر محیط تھی اور اس کے باوجود ہمارے دلائل اور مشاہدات یکساں تھے۔ مثلاً میں نے بیان کیا تھا کہ کس طرح میں نے ترقی پذیر ممالک کے لئے خوش کن معاشی اندازے ترتیب دیے تھے جبکہ اس نے لکھا

''آئی ایم ایف کے منصوبوں کو چلتے رہنے اور ان کے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے معاشی اندازوں میں ردوبدل کرنا پڑتا ہے۔ ان کے استعمال کرنے والے بہت سے لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ یہ عام اندازے

نہیں ہوتے۔ اس طرح کے معاملوں میں کل معاشی پیداوار کے متعلق لگائے جانے والے اندازے معیاری شماریاتی قواعد کے مطابق نہیں ترتیب دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماہرین کے اندازوں کو بھی ان کی بنیاد نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ صرف ایسے اعداد و شمار ہوتے ہیں جو آئی ایم ایف کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لئے بات چیت کے ذریعے طے کیے جاتے ہیں۔''

میں کتاب کو کھلا چھوڑ کر وہاں سے گزرتے چینی فوجیوں کو دیکھنے لگا۔ اسٹگ لٹز نے بعض جگہ پر ''قومی اور اعلیٰ طبقے داروں کی روایتی آمریت'' کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کے خیالات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ تبت پر چینی قبضہ طاقت کے حصول سے کہیں زیادہ تھا جس کو اسٹگ لٹز نے ''بین الاقوامی مالیات کی نئی آمریت'' کی صورت میں بیان کیا تھا۔ چینیوں سے پہلے تبت پر رومیوں، ہسپانیوں اور انگریزوں نے قبضہ کیا تھا۔ وہ بھی کوئی آسان دور نہ تھا۔ روایتی سلطنتیں دلفریب انداز میں اپنی گھناؤنی حرکتوں کو بیان کرتی ہیں جیسے کہ تہذیب کی ترقی، معاشی پیداوار میں اضافہ یا ترقی کے لئے نئے راستوں کا تعین جیسے دلفریب الفاظ اور تراکیب مگر درپردہ وہ جس تسلط کے لئے نئی بستیاں بنا رہی ہوتی ہیں۔ دوسری طرف کارپوریٹوکریسی آئی ایم ایف اور عالمی بینک جن کو سی آئی اے اور کرائے کے قاتلوں کا ساتھ میسر ہوتا ہے ان بہانوں کے ذریعے ایک نئی طرح کی شہنشاہیت قائم کر رہی ہوتی ہیں۔ جب آپ فوجوں کے ذریعے کسی علاقے پر قابض ہوتے ہیں تو ساری دنیا یہ بات جان لیتی ہے مگر جب آپ معاشی تباہ کاروں کے ذریعے مسلط ہوتے ہیں تو آپ چھپ کر اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہ سارے معاملات مجھے اپنے آپ سے یہ سوال کرنے پر اکساتے ہیں کہ اس طرح کی خفیہ کارروائیاں جمہوریت جس کی بنیاد ہی باشعور ووٹ دینے والے ہیں پر کتنے گہرے ہوتے ہیں اور اگر ووٹ دینے والے اپنے رہنماؤں کے اہم اور خفیہ ہتھیاروں سے ناواقف ہوں تو کیا وہ ملک جمہوری کہلا سکتا ہے۔

باب نمبر:۱۴

خاموش دیو

۲۲ جون ۲۰۰۴ء کو ہم تبت سے اپنے اگلے پڑاؤ نیپال کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ تبت روانہ ہونا میرے لئے کافی باعث اطمینان تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آئینہ بھدی یا بدصورت شکل میں میرا عکس دکھا رہا تھا۔ چینی تبت اس دنیا کا مسخ شدہ عکس تھا جہاں میں معاشی تباہ کار کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکا تھا۔ مسخ شدہ ہی سہی لیکن عکس تو تھا۔

وہ ایک بہترین دن تھا۔ پائلٹ جہاز کو ماؤنٹ ایورسٹ کے اتنے قریب لے گیا تھا کہ میں اپنے آپ کو جہاز کی نالیوں میں گھومتا ہوا دیکھ رہا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ایک طوفان دو بڑے برفانی سطح کے درمیان ہو کر گزرتا ہو۔ یہ منظر مجھے بالکل ہماری قسمت کی طرح محسوس ہوا۔ دنیا کی واحد ہندو ریاست، ایک ادنیٰ ملک دو قوی ہیکل ملک بھارت اور چین کے درمیان تن تنہا اور دونوں ممالک اس ملک یعنی نیپال کے پانی اور اس پانی سے بجلی پیدا کرنے کے امکانات پر نظر جمائے بیٹھے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ ملک اضطراب کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ ماؤ کے باغیوں نے ۱۹۹۶ء میں ''عوامی جمہوریہ نیپال'' کی بنیاد رکھنے کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ بادشاہ نے ردعمل کے طور پر کمیونسٹوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ ولی عہد دیپندرا نے جون ۲۰۰۱ء میں اپنے باپ بادشاہ برندرا اور خاندان کے کئی اور افراد کو گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اگرچہ اس نے اپنے آپ کو بھی گولی ماری تھی لیکن افواہیں یہ تھیں کہ وہ ایک چینی ایجنٹ تھا عوامی بغاوت نے سر اٹھا لیا اور نئے بادشاہ گیاندرا نے مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے حکومت کو برطرف کر دیا تھا اور ماؤ نواز حلقوں پر فوج کے ذریعے تازہ حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب ہم نیپال پہنچے تھے تو جنگ میں قریباً دس ہزار لوگ موت کا شکار ہو چکے تھے جبکہ ایک سے ڈیڑھ لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے تھے۔

ہمارے گروپ کے لئے یہ ایک مختصر دورہ تھا۔ ترقی یافتہ دنیا سے دل بھر جانے کی وجہ سے تبدیلی کی تلاش میں مبتلا یہ گروپ جب گاڑی میں بیٹھا کھٹمنڈو کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تب شینا نے اعلان کیا کہ وہ ہم سب کو نیپال میں آخری رات ایک پر آسائش اور اپنے علاقے کے بہترین

ہوٹل ''دواریکا'' میں رات گزارنے کا تحفہ دے رہی ہے یہ سن کر بس میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

دواریکا نے بالکل بھی مایوس نہ کیا تھا۔ کپلنگ جیسی جگہ سے واپسی کے بعد وہ رات گزارنے کے لئے ایک نہایت حسین اور آرام دہ مقام تھا۔ یہ علاقہ ان نوآبادیاتی سلطنتوں کی نشانی تھا جہاں پر میں معاشی تباہ کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔

ہمارے گروپ کے زیادہ تر لوگ قریب کے بازار میں نیپال میں آخری بار خریداری کر رہے تھے کیونکہ اس بات کو گائیڈز نے محفوظ قرار دیا تھا میں ہوٹل ہی میں رک گیا تھا۔ میں اس اچانک تبدیلی کا عادی ہونا چاہتا تھا اور پھر میں تبت سے حاصل ہونے والے تجربات پر غور بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کاغذات ٹائپ کرنے لگا اور پھر کچھ دیر بعد سیڑھیوں سے اتر کر سرسبز باغات میں آ گیا۔ یہ باغات ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل انڈونیشیا میں لگے باغات سے حد درجہ مماثلت رکھتے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس رقاصہ کے بارے میں سوچنے لگا جسے میں سوئمنگ پول کے کنارے ملا تھا۔ میں وہاں بنی سیٹی پر بیٹھ کر اس رات کے بارے میں سوچنے لگا جب اس کو ہوٹل میں کہیں نہ پا کر جکارتہ کے پل کے پار چلا گیا تھا اور وہاں ان دونوں رقاصاؤں سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے کچھ ایسا کہا تھا جس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور ان تمام سالوں کا درمیان میری یادوں سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا:

> ''یہ تاریخ میں میں سب سے زیادہ چاہے جانے والا قدرتی معدنیات ہے۔ بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے تو کیا اس میں حیرانگی کی کوئی بات ہے کہ طاقتور لوگ اس کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں؟ وہ دھوکہ دیتے ہیں، چوری کرتے ہیں، جہاز اور میزائل بناتے ہیں اور ہزاروں لاکھوں نوجوان فوجیوں کو تیل کے لئے مرنے کے لئے جنگوں پر بھیجتے ہیں۔''

اور آج پچیس سال بعد جب ویتنام کی جنگ ختم ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم عراق میں ایک نئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مرد اور عورتیں دوبارہ وسائل کے حصول کی جنگ میں مر رہے ہیں اور کار پریٹو کریسی نام کا شہنشاہ پہلے سے کہیں زیادہ امیر ہو چکا ہے اور بہت سے امریکیوں کو ان تمام حالات کا ذرہ برابر اندازہ نہیں ہے۔

میرے خیال کے مطابق ایشیاء اس سلطنت کی تعمیر میں ایک نئے طریقہ کار کی علامت ہے۔ قدیم طریقے ویتنام میں مطلوبہ نتائج نہ حاصل کر سکے تھے مگر نئے طریقوں نے انڈونیشیا اور دیگر کئی ممالک میں کافی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اگرچہ پالیسیاں اور منصوبے ناکام ہوتے نظر آتے ہیں لیکن بڑے تاجر شاندار منافع بٹورتے ہیں، ایشیائی آئی ایم ایف بحران بے تحاشہ اموات اور محرومیوں کا سبب بنا تھا مگر اس بحران کے اختتام پر کارپوریٹوکریسی سب سے زیادہ فائدے میں رہی تھی جس نے انڈونیشیا اور دیگر ممالک کی ان تمام حکومتوں کو اپنے قابو میں کر لیا تھا جن کو پہلے آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی پالیسیوں نے برباد کر دیا تھا۔ اگرچہ ویتنام کی جنگ ایک عسکری ناکامی تھی لیکن امریکی کارپوریشنز نے اسلحہ کی فروخت، پھیلی ہوئی منڈیوں اور مزدور طبقے کے اشتراک کی صورت میں کافی منافع کما لیا تھا۔ انہوں نے سویٹ شاپس کی پیداواری صلاحیتوں اور غیر معمولی ذرائع جیسے جدید حربوں کے ذریعے بھی سبقت حاصل کر لی تھی۔ کارپوریٹوکریسی نے تو قدرتی آفات سے بھی فائدہ اٹھانے کے طریقے ڈھونڈ نکالے تھے۔

میرا دھیان بار بار چین کی طرف جاتا تھا جو گھات لگائے بیٹھا تھا۔ تبت کی صورتحال نے واضح کر دیا تھا کہ اگرچہ چین نے عسکری قوت کا بھی استعمال کیا تھا مگر وہ ساتھ ساتھ تسلط قائم اور اسے وسعت دینے کے لئے نت نئے طریقوں کا بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے معاشی تباہ کاروں اور کرائے کے قاتلوں نے ہماری کی ہوئی غلطیوں سے کافی سبق حاصل کر لئے تھے۔

تاریخی اعتبار سے چین نے قدیم نوآبادیاتی طاقتوں جیسے روایتی حربے استعمال کرنے سے پرہیز کیا تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو دور دراز علاقوں میں بھیجنے کے بجائے اپنے ہی خطے میں تبت اور تائیوان جیسے علاقوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی تھی۔ اس سلسلے میں چین امریکہ کے طرز عمل کی پیروی کر رہا ہے۔

تھامس جیفرسن نے جب لیوس اور کلارک کو مس سس سی پی کے مغرب میں واقع علاقوں کے معاینے پر تعینات کیا تھا تو وہ اس کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ پورا براعظم اس کے دائرہ اختیار میں آتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے آج کے تبت اور تائیوان۔ لوزیانا کی خریداری، ٹیکساس کا الحاق اور الاسکا کا حصول اسی حکمت عملی کے ذریعے حق بجانب ٹھہرائے گئے تھے۔ واضح تقدیر (Menifest Destiny) کے نظریے کو بھی بعد میں شمالی امریکہ سے مزید آگے کی پیش قدمی کے لئے بہانے کی صورت میں استعمال کیا گیا تھا۔ اس نظریے کا دائرہ کار کیریبین اور اوقیانوس

کے جزائر پر اور پھر پانامہ، کیوبا اور میکسیکو پر قبضہ اور مزید آگے چل کر لاطینی امریکہ کے دیگر ملکوں کی اندرونی سیاست میں چھیڑ چھاڑ کرنے تک پھیل گیا تھا۔ واشنگٹن نے بانیوں کے اصولوں کی کھلی خلاف ورزی کرنے والے حربوں سے بظاہر اجتناب برتا تھا مگر یکے بعد دیگرے ہر امریکی انتظامیہ نے تسلط کے لئے خفیہ طریقوں پر عمل درآمد کیا تھا اور ہر ایک نے اپنے پیش رووں، حکومتوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق حاصل کئے تھے اور اب ایسا لگتا ہے کہ چین اس معاملے میں امریکہ پر سبقت لیتا جا رہا ہے۔

تبت اور نیپال کے دورے کے کافی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں اس طرح کا موازنہ کرنے والا اکیلا شخص نہیں تھا۔ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء کو سنگاپور میں منعقد ہونے والے عالمی بینک کے انتہائی اہم اجلاس سے ایک دن پہلے نیویارک ٹائمز نے ''اپنے پڑوسیوں کی امداد کے سلسلے میں چین کا مغرب سے مقابلہ'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ٹائمز کے صحافی جین پرلیز نے واضح انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ عالمی بینک کا سب سے بڑا گاہک چین ایشیاء میں امدادی کاروبار کو غیر مستحکم کرنا چاہ رہا ہے اور اس کے لئے وہ بینک سے اپنے انداز میں ٹکر لے رہا ہے۔ صحافی نے کمبوڈیا، لاؤس، میانمار اور فلپائن کی مثالوں کے ذریعے یہ بتایا تھا کہ ''چین کے دیے ہوئے قرضے مغرب کے الجھا دینے والے قرضوں سے زیادہ پرکشش ہیں'' پرلیز نے اس سلسلے میں کچھ وجوہات درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بیجنگ قرضے دینے کے لئے معاشی اور ماحولیاتی معیاروں کی شرائط کو قرضوں کی ادائیگی میں لازمی قرار دیتا ہے اور نہ ہی قرضوں کے حصول کے لئے بدعنوانی پر جرمانے لگانے کی شرائط لاگو کرتا ہے۔ بالخصوص اس مضمون میں اس حکمت عملی پر تنقید کی تھی جس نے معاشی تباہ کاروں کو دنیا بھر کے ممالک میں پھیلنے میں جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا وہ تھیں چینی شرائط۔ مس پرلیز نے لکھا تھا کہ چینی شرائط میں مہنگے ماہرین اور مشیروں کو سفری اخراجات شامل نہیں ہوتے ہیں جو عالمی بینکوں کے منصوبوں کا لازمی جزو ہوتا ہے۔

اس کتاب میں جن چار خطوں کی بات کی گئی ہے امریکیوں کے مطابق ان میں زیادہ تر ایشیائی مشکلات کم مشکل اور سہل تھیں۔ ہمارے ذہنوں میں کوریائی اور ویتنام کی جنگوں کی یادیں تازہ تھیں جہاں پر عسکری ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر وہ اس طرح اختتام پذیر ہوئی تھیں کہ ہماری زندگیاں اپنے مخصوص انداز میں رواں دواں رہی تھی اور ساتھ ساتھ امریکی معیشت کی ترقی

کے شاندار مواقع فراہم کرگئی تھیں۔ جاپانی انجینئرنگ اور ذہانت کی ہم امریکی عزت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان سے گاڑیاں، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر خریدتے ہیں۔ ہماری مصنوعات سے ایشیائی دکانیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ جب ہم ۸۰۰ ڈائل کرتے ہیں تو ہم ایشیاء میں کسی نہ کسی سے رابطے پر ہوتے ہیں یہاں تک کہ چین اور کوریا کی عسکری دھمکیاں ہمیں پرانی اور بے اثر معلوم ہوتی ہیں اور کسی حد تک ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ ہم سرد جنگ میں کس طرح اور کتنے کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمیں ہوسکتا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں سے خوف محسوس ہوتا ہو مگر خودکش حملہ آوروں کو تو ہم قابو میں نہ رکھ پائیں لیکن ایٹمی مسائل سے پچھلی نصف صدی میں زیادہ بہتر طریقے سے نمٹتے آئے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ ایشیائی ملکوں نے ہمارے سرمایہ دارانہ نظام کو قبول کرلیا ہے جو ایسے اصولوں پر کاربند ہیں جیسے کہ مالک کی اجارہ داری، بڑے کاروباری اداروں اور حکومتوں کے درمیان سازشیں سرچڑھ کر بولتی مادہ پرستی اور اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ قدرت کے وسائل صرف چند مخصوص افراد کے استحصال کے لئے وجود میں آئے ہیں۔

لیکن لاطینی امریکہ مختلف ہے جس کو ہم یہ مان کر چلتے تھے کہ ہم نے انہیں قابو میں کرلیا ہے اور الینڈیز، نوریگاس، ساندینیستا اس سے نجات حاصل کرلی ہے اور کاسترو کا اختتام بھی قریب ہی تھا تو ہمیں یہ پتہ چلا کہ خاموش انقلاب خطے کو اپنے شکنجے میں کس رہا ہے اور اس کا براہِ راست نشانے پر ہم ہیں۔ لاطینی امریکہ کے باشندے امریکی بادشاہت کے شدید مخالف ہیں اور اس مخالفت کی وجہ سے ہماری خفیہ تاریخ کو بے نقاب کر رہے ہیں۔

جب میں ان دو علاقوں ایشیاء اور لاطینی امریکہ سے سیکھے ہوئے سبق پر غور کرتا ہوں تو میں اس بوڑھے تبتی جس سے میری ملاقات گلیشئر پر ہوئی تھی اس کے الفاظ یاد آرہے ہیں۔ وہ اپنے قابضین کو ''خانہ بدوش کے قاتلوں'' کے نام سے یاد کرتے تھے تو ان کے خیالات گوئٹے مالا کے صنعت کار سے ملتے جلتے لگتے تھے۔ یہ دونوں افراد دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے تھے، ایک غریب تھا اور دوسرا امیر، ایک استحصال سے دوچار تھا اور دوسرا استحصال کرنے والا تھا مگر اس کے باوجود دونوں کو اپنے بچوں کے لئے رہ جانے والی اس دنیا سے متعلق کچھ خاص بات سمجھ میں آگئی تھی۔ گوئٹے مالا کے صنعت کار نے اپنے محافظوں کے بارے میں شیخی بگھارتے ہوئے انہیں ''مایا کے شکاری'' کے طور پر بیان کیا تھا۔

گوئٹے مالا میں کرائے کے محافظ

لفٹ کا دروازہ کھلا۔ اندر تین لوگ کھڑے تھے۔ پیپ اور میری طرح انہوں نے برنس سوٹ نہیں پہنے ہوئے تھے بلکہ انہوں نے پتلون اور سوئٹر زیب تن کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے چمڑے کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی مگر جس چیز نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا وہ تھیں ان کی بندوقیں، تینوں کے پاس اے کے ۴۷ تھیں۔

پیپ نے مجھے لفٹ کی طرف بلاتے ہوئے کہا ''یہ بدقسمتی سے ان دنوں گوئٹے مالا میں رہنے کے لئے ضروری ہوگیا ہے کم ازکم میرے جیسے ان لوگوں کے لئے جو جمہوریت اور امریکہ کے دوست ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کو پالنا پڑتا ہے جو ہمارے دشمن مایا قبیلے کے لوگوں کو قتل کرسکیں یا ان سے نمٹ سکیں۔''

میں ایک دن پہلے ہی میامی سے گوئٹے مالا پہنچا تھا اور یہاں شہر کے نہایت پرآسائش ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ یہ ان چند مواقعوں میں سے ایک موقع تھا جب اسٹون اینڈ ویبسٹر انجینئرنگ کارپوریشن نے مجھے معاشی تباہ کاروں کے متعلق لکھنے سے روکنے کے علاوہ کسی اور کام کے سلسلے میں میری مدد مانگی تھی۔ پیپ جیرامیلو (فرضی نام) نے گوئٹے مالا میں اسٹون اینڈ ویبسٹر کمپنی کے لئے نجی ملکیت کے پاور پلانٹ تیار کرنے کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ وہ گوئٹے مالا کے اس چھوٹے سے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو بے حد امیر اور طاقتور تھا اور جنہوں نے ہسپانوی قبضے کے بعد سے ملک کی باگ ڈور سنبھالی ہوئی تھی۔ پیپ کا خاندان صنعتی، پارکس، دفتری عمارات، رہائشی منصوبوں اور ان بڑے زرعی اراضیوں کا مالک تھا جن کی پیداوار امریکہ کو برآمد کی جاتی تھیں۔ اسٹون اینڈ ویبسٹر کے لئے جس پہلو کی خاص اہمیت تھی وہ تھا پیپ کا سیاسی اثر ورسوخ جو گوئٹے مالا میں کام کروانے اور نکلوانے کے لئے نہایت ضروری تھا۔

میں نے معاشی تباہ کار کی حیثیت سے گوئٹے مالا کا پہلا دورہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں کیا تھا۔ اس وقت میری ذمہ داری یہ تھی کہ مجھے بجلی کے شعبے کو بہتر بنانے کے لئے حکومت کو قرضے لینے کی حکمت عملی پر آمادہ کیا جائے اور پھر ۱۹۸۰ء میں مجھے ایک این جی او کے بورڈ آف ڈائریکٹر نے

اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ یہ ادارہ مایا حلقوں کے لئے چھوٹے قرضے دینے والے بینک بنانے اور انہیں غربت سے نجات دلانے کے لئے نہایت نچلی سطح پر بنیادی کوششیں کرنے میں مدد دیتا تھا۔ سالوں یہاں رہنے کے بعد میں یہاں پر ہونے والی پرتشدد کارروائیوں سے بخوبی آگاہ تھا جنہوں نے اس ملک کو بیسویں صدی کے اختتامی حصے میں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

گوئٹے مالا مایان تہذیب کے قلب کی حیثیت رکھتا ہے جو ہزاروں سال کامیابی سے زندگی بسر کرتی رہی تھی۔ یہ تہذیب تباہی کا شکار اس وقت ہوئی تھی جو علم الانسان (انتھروپولوجی) کے ماہرین کے مطابق جب وہ اپنے شاندار شہری مراکز کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ماحولیاتی تبدیلی کی تاب نہ لا سکی تھی جب ۱۵۲۴ء میں ہسپانیوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ جلد ہی گوئٹے مالا وسطی امریکہ میں ہسپانوی عسکری بالادستی کی علامت بن گیا تھا۔ یہ صورتحال انیسویں صدی تک برقرار رہی جس کے نتیجے میں ہسپانویوں اور مایان آبادیوں کے درمیان اکثر ہونے والی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

۱۸۰۰ء کے اختتام پر بوسٹن کی ایک کمپنی یونائیٹڈ فروٹ *United Fruit* نے ہسپانیوں کو اس کے انداز میں شکست دے کر اپنے آپ کو وسطی امریکہ کی چند طاقتور ترین قوتوں میں سے ایک کے طور پر منوالیا تھا۔ اس ادارے نے بھرپور انداز میں ۱۹۵۰ء کے آغاز تک حکومت کی۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکی انقلاب کے اصولوں کو بنیاد بنا کر جیکوبو اربینز صدارتی امیدوار کے طور پر ابھرا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ گوئٹے مالا کے لوگوں کو اپنی زمین سے حاصل ہونے والے قدرتی وسائل سے ہونے والے منافع کے استعمال کا حق ہونا چاہئے اور غیر ملکی اداروں کو اس کے ملک اور اس کے عوام کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ان انتخابات کو پورے خطے میں عین جمہوری اصولوں کے نمونے کے طور پر بے حد سراہا گیا تھا۔ اس وقت تین فیصد سے بھی کم گوئٹے مالا کے عوام ملک کی ۷۰ فیصد زمین کے مالک تھے۔ اربینز نے صدر کی حیثیت سے جامع زمینی اصلاحات کے منصوبے کا اعلان کیا تھا جو براہ راست یونائیٹڈ فروٹ کی گوئٹے مالا سے وابستہ مفادات پر کاری ضرب تھی۔ کمپنی کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اربینز کامیاب ہو گیا تو وہ ایسی مثال قائم کر دے گا جس سے پورے خطے اور پھر پوری دنیا میں ایسے جذبات کو پذیرائی ملنے لگے۔

یونائیٹڈ فروٹ نے امریکہ میں بھرپور عوامی مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے امریکی عوام اور کانگریس کو اس بات کا یقین دلایا کہ اربینز نے گوئٹے مالا کو ایک روسی ریاست بنا دیا ہے اور اس کا

زمینی اصلاحات کا منصوبہ دراصل لاطینی امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کو تباہ کرنے کا روسی منصوبہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں سی آئی اے نے گوئٹے مالا میں اربینز کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار کیا۔ امریکی طیاروں نے دارالحکومت پر بم برسانے شروع کر دیے تھے۔ جمہوری طور پر منتخب صدر کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ سفاک قدامت پسند کرنل کارلوس کاسٹیلو ارماس کو نامزد کر دیا گیا۔

نئی حکومت نے فوری طور پر زمینی اصلاحات کے طریقہ کار میں تبدیلی پیدا کر دی، یونائیٹڈ فروٹ سے لئے جانے والے ٹیکسز ختم کر دیے گئے۔ انتخابات کے پوشیدہ طریقوں کو تلف کر دیا گیا اور جیلوں کو کاسٹیلو کے ناقدین سے بھر ڈالا۔ ۱۹۶۰ء میں خانہ جنگی پھوٹ پڑی جس کے نتیجے میں حکومت مخالف گوریلا گروپ گوئٹے مالن قومی انقلابی یونین کا جنم ہوا جو امریکہ کی حمایت یافتہ فوج اور قدامت پسندانہ قاتلانہ گروپوں کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں تشدد نے مزید زور پکڑ لیا جس کے نتیجے میں سینکڑوں ہزاروں شہریوں کی جانوں کا ضیاع ہوا جس میں اکثریت مایان قبیلے کے باشندے تھے اور اس کے علاوہ کئی اور شہریوں کو جیل میں ڈال کر تشدد کا نشانہ بنایا۔

۱۹۹۰ء میں فوج نے انتہائی بلند مقام پر واقع جھیل اٹیٹلان کے قرب میں واقع سینٹیا گو کے قصبے اٹیٹلان میں شہری قتل عام کیا۔ یہ علاقہ وسطی امریکہ کے سب سے خوبصورت علاقوں میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اس وقت جاری کئی اور سفاک حرکات میں سے ایک تھی لیکن یہ سفاکیت بین الاقوامی سطح پر کافی تشویش کا باعث بنی کیونکہ یہ جس علاقے میں رونما ہوئی تھی وہ غیر ملکی سیاحوں کا من پسند مقام تھا۔ عینی شاہدین کے مطابق یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا تھا جب مایان شہریوں نے فوج کے اڈے کے سامنے کھڑے ہو کر پرامن مظاہرہ کیا تھا۔ دراصل لاپتہ افراد کی فہرست میں شامل ہونے والے افراد اور وہ اس کی فوری رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن فوج نے مظاہرین کے اس ہجوم پر فائر کھول دیا تھا۔ اگرچہ اس واقعہ میں ہلاک ہونے والوں کے بارے میں متضاد اطلاعات تھیں لیکن محتاط اندازے کے مطابق درجنوں مرد، عورتیں اور بچے شدید زخمی اور ہلاک ہوئے تھے۔

اس وقعہ کے کچھ عرصے بعد ۱۹۹۲ء میں پیپ جیرامیلو سے ملاقات کرنے کے لئے میں گوئٹے مالا پہنچا تھا۔ وہ اسٹون اینڈ وبیسٹر کے اشتراک سے عالمی بینک سے قرضہ لینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مایان زمین کو زندہ روح تصور کرتے ہیں اور وہ مقامات جہاں پر زمین سے دھواں نکلتا ہے انہیں مقدس مانتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ زمین سے ابلنے والے گرم چشموں پر بجلی کے پلانٹس تعمیر کرنے کی صورت میں قتل وغارت گری ہو سکتی تھی۔ یونائیٹڈ فروٹ کے معاملے اور اس

کے علاوہ حالیہ دور میں ایران، چلی، ایکواڈور، پانامہ، نائیجیریا اور عراق میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں مجھے یقین تھا کہ اگر امریکی کمپنی جیسے کہ اسٹون اینڈ ویبسٹر نے گوئٹے مالا جیسے ملک میں امریکی مدد چاہی تو سی آئی اے اس سارے کھیل میں کود پڑے گی تشدد مزید بڑھ جائے گا۔ پینٹاگون بحری فوجوں کو روانہ کردے گا۔ میرے ضمیر پر پہلے ہی کافی لاشوں کا بوجھ تھا اور میں مزید کسی تباہی کو روکنے کے لئے پرعزم تھا۔

اسی صبح مجھے ایک گاڑی ہوٹل سے لینے آئی اور مجھے لے کر گوئٹے مالاسٹی کی متاثر کن عمارات میں پہنچ گئی۔ دو مسلح لوگوں نے مجھے اندر بلالیا۔ ان میں سے ایک مجھے لفٹ کے ذریعے سب سے اوپر والی منزل پر لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ عمارت پیپ خاندان کی ملکیت ہے اور تمام کی تمام گیارہ منزلوں پر ان کا قبضہ ہے۔ زمینی منزل پر ان کا بینک تھا، مختلف کاروباروں کے دفاتر دوسری سے آٹھویں منزل پر ہیں اور نویں، دسویں اور گیارہویں منزل پر اس کی ذاتی رہائشگاہیں تھیں۔ پیپ میرے استقبال کے لئے لفٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کافی نوش فرمانے اور مختصر تعارفی گفتگو کے بعد وہ مجھے عمارت کے دورے پر لے گیا ماسوائے نویں منزل کے جو بقول اس کے اس کی بیوہ ماں کے لئے مختص ہے (لیکن مجھے اس بیان پر شک تھا) اگر وہ اس عمارتی دورے کے ذریعے اسٹون اینڈ ویبسٹر کے نمائندے کو متاثر کرنا چاہ رہا تھا تو وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ گرم چشموں کے منصوبے کے متعلق میری اس سے اور اس کے انجینئرز سے ملاقات کے بعد میں نے اس کی ماں، بھائی اور بہن کے ساتھ گیارہویں منزل پر دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر ہم لوگ منصوبے کے لئے چنی گئی جگہ کا دورہ کیا ہم لفٹ میں مسلح افراد کے ساتھ چڑھے تھے۔

لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے ایک آدمی نے نیچے جانے کے لئے بٹن دبادیا۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ میں مستقل ان بندوقوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مسلح افراد مجھے اور پیپ کو مایان قبیلے کے لوگوں سے بچانا چاہتے تھے۔ مایان وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ میں نے این جی اوز کے سلسلے میں کام کیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر انہیں یہ بات پتہ چل جائے تو میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

لفٹ روکی گئی، دروازہ کھلا تو میں داخلی دروازے پر سورج کی روشنی تلاش کر رہا تھا مگر مجھے اس کی جگہ بڑا سا مضبوط گیراج نظر آیا۔ وہ پوری طرح روشن اور کنکریٹ کی بو سے بھرا ہوا تھا۔

پیپ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور اس نرم آواز سے مجھے حکم دیا ''یہیں رکنا''۔

باب نمبر:۱۶

غصے سے بھرے ہوئے لوگ

ان میں دو محافظ میرے اور پیپ کے آگے چل رہے تھے۔ انہوں نے دروازے کا راستہ روک رکھا تھا۔ بندوقوں کا رخ گیراج کی طرف تھا۔ پھر تیسرا شخص جس نے چمڑے کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی پیروں کے بل جھک کر آگے بڑھا اس کا ہتھیار اور سر ایک سے دوسری طرف نہایت احتیاط سے گھوم رہا تھا۔ وہ پورے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہمارے دو محافظوں نے لفٹ سے باہر قدم رکھا اور دونوں نے لفٹ کے دروازے کے برابر اپنی جگہ سنبھال لی۔

اب مجھے گیراج کا پورا منظر نظر آیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں صرف چھ گاڑیاں تھیں تمام امریکی تیار کردہ چیویز اور فورڈز تھیں۔ ان میں سے پانچ کالے رنگ کی اسٹیشن ویگنز تھیں جبکہ چھٹی گاڑی ایک لال رنگ کا پک اپ ٹرک تھا۔ وہ تمام کی تمام ہر لحاظ سے غیر معمولی گاڑیاں تھیں۔

چمڑے کی جیکٹ والے نے گاڑی کے اندر روشنی ڈالی اور پھر جھک کر اس کے نیچے دیکھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دوبارہ گیراج کا معاینہ کیا۔ بظاہر مطمئن ہونے کے بعد وہ ایک ویگن کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور انجن چلادیا اور پھر آہستگی سے گاڑی کو لے کر وہاں آ گیا جہاں ہم اس کے منتظر تھے۔

ہمارے محافظوں میں سے ایک نے پچھلا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے اور پیچھے کی طرف منہ کئے ہوئے تیسری سیٹ پر بیٹھ گئے۔ چمڑے کی جیکٹ والا اپنی بندوق سنبھالے باہر نکلا۔ پیپ اور میں دوسری سیٹ پر بیٹھ گئے۔ چمڑے کی جیکٹ والے نے دروازہ بند کردیا۔ اس نے ایک دفعہ تیز آواز میں سیٹی بجائی اور پھر گاڑی چلانے لگا۔

ویگن ڈھلان سے اترنے لگی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو ایک دھاتی دروازہ کھلا اور ہم سورج کی روشنی میں آ گئے تھے۔ تین لوگ اے کے ۴۷ سنبھالے باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں سیلوٹ کیا، گاڑی رک گئی۔ ان تین میں سے ایک شخص چمڑے کی جیکٹ والے کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ واکی ٹاکی ریڈیو پر بات کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد دو سیڈن جن میں سے ایک سفید رنگ اور

دوسری نقرئی (سلور) رنگ کی تھی ہماری گاڑی کے آگے چلنے لگیں۔ ان کے کالے شیشوں سے اندر دیکھ پانا ناممکن تھا۔ ہماری گاڑی کے ڈرائیور کے برابر والے نے انہیں ہاتھ ہلایا، سفید گاڑی آگے تھی اس کے بعد ہماری گاڑی تھی اور نقرئی (سلور) رنگ کی گاڑی سب سے پیچھے تھی۔

پیپ نے خاموشی توڑتے ہوئے میرا گھٹنا تھپتھپا کر کہا ''خطرناک ہے نہ اس طرح کی زندگی گزارنا؟''

میں بولا ''ناقابل یقین ہے واقعی سب کچھ، لیکن تمہارے لوگوں کو اپنے کام میں کافی مہارت ہے۔''

پیپ نے بتایا ''یہ پیسے سے خریدے ہوئے بہترین لوگ ہیں۔ تمام کے تمام تمہارے مالک یعنی امریکی اسکولوں کے تربیت یافتہ ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیوریاں چڑھا کر مخاطب ہوا ''پچھلے ہفتے ہی میری بہن کی گاڑی پر کچھ مایان قبیلے کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری گاڑیوں کے شیشے بلٹ پروف ہیں۔ ان شیشوں اور ہمارے محافظوں کی مہارت کی بناء پر میری بہن کی زندگی بچ گئی۔''

میں نے پوچھا ''کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟''

اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا ''محافظ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے دو مایان ذلیلوں کو زخمی کر دیا تھا مگر ان کے ساتھی ان کو لے کر بھاگ گئے۔ میرے آدمیوں نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا پیچھا نہیں کیا۔ میرا ایک بزنس پارٹنر ہوا کرتا تھا اس کے محافظوں نے حملہ آوروں کا پیچھا کیا تھا اور ان کے جال میں پھنس گئے تھے ایک بے چارہ زخمی ہو گیا تھا اور دوسرا مر گیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے درختوں سے گھری چوڑی سڑک کو دیکھنے لگا جس پر سے ہم لوگ گزر رہے تھے۔ وہ بولا ''یہ شہر بہت اچھا ہوا کرتا تھا، زیادہ تر تشدد دیہی علاقوں میں ہوتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف مڑا ''مگر اب ایسا نہیں ہے، ان پاگل مایان نے حد کر دی ہے۔'' اس نے دوبارہ باہر جھانکتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا ''لیکن اگر آپ میری طرح خوش نصیب ہیں تو آپ کو سب سے زیادہ خطرہ کن لوگوں سے ہوگا؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''کسے آپ کو مارنے کا بہترین موقع ملے گا؟''

مجھے یکدم پانامہ کے ٹوریجوس اور ان افواہوں کا خیال آیا جن کے مطابق اس کے حفاظتی

عملے میں سے ایک نے اسے دھماکا خیز مواد میں لپٹا ہوا ٹیپ ریکارڈر، ٹوئن اوٹر کی پرواز پر سوار ہونے سے پہلے تھما دیا تھا۔ میں نے فوراً پیپ کو اس کے سوال کا جواب دیا ''تمہارے محافظ''

''یقیناً'' یہ کہہ کر اس نے پرسکون انداز میں ٹیک لگا لی اور پھر بولا ''آپ کو بہترین لوگوں کو ڈھونڈ کر انہیں اچھا معاوضہ دینا ہوگا۔ میرا ایک بہت بڑا حفاظتی عملہ ہے جو ہمارے گھروں کی حفاظت پر مامور ہونے سے پہلے یہ لوگ سالوں اس عملے کے ساتھ گزارتے ہیں جو ہمارے کارخانوں، بینکوں اور جائیدادوں پر تعینات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کی وفاداری ثابت کئے بغیر میرے یا میرے خاندان کے نزدیک نہیں آ سکتے۔''

میں نے استفسار کیا ''اور وہ یہ کیسے کرتے ہیں؟''

''کیا، اپنے آپ کو ثابت کرنا ہے؟'' وہ میرا سوال سن کر مسکرا پڑا اور پھر بولا ''انہیں اپنی جان داؤ پر لگانی ہوتی ہے، حملوں میں فائر کر کے دکھانا ہوتا ہے اور اپنی خوبیوں بالخصوص ہمت اور وفاداری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔''

اس کے ان الفاظ نے میرے ذہن میں اس واقعہ کو تازہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ۱۹۹۱ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا تھا۔ جب میں نے اس واقعے کا حوالہ دیا تو پیپ نے پوچھا ''مجھے مزید اس سلسلے میں کچھ بتاؤ۔''

میں نے بتانا شروع کیا ''ہمارے کرائے کے قاتلوں نے صدام کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا حفاظتی عملہ ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی تھا۔ اس کے علاوہ صدام نے اپنے ہم شکلوں کی فوج جمع کر رکھی تھی۔ آپ فرض کریں کہ آپ اس کے محافظوں میں سے ایک ہیں اور آپ کو رشوت لینے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور آپ کسی ہم شکل کو گولی مار دیں تو آپ اور آپ کا خاندان دردناک موت کا شکار ہو جائے گا اسی وجہ سے بش نے فوج روانہ کر دی تھی۔''

وہ یہ سن کر کافی خوش ہوا ''یہ کافی اچھا خیال ہے۔ مجھے اپنے لوگوں میں اس بات کو پھیلانا ہوگا کہ اگر کسی نے غداری کی تو ہم اسے تکلیف دہ موت سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔''

ہم شہر سے باہر آ کر عظیم الشان آتش فشاں کی طرف بڑھنے لگے۔ آسمان نیلگوں ہو رہا تھا۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ دارالحکومت ایک دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہر سے باہر دن بہت شاندار لگ رہا تھا۔ ہم ایک چھوٹی جھیل کے پاس سے گزرے تو ساری گاڑی دھول میں اٹ گئی تھی۔ پیپ نے وضاحت کی کہ کیمپسینوز نے اپنے گھروں کو گرم رکھنے اور کھانا پکانے کے لئے

سارے درخت کاٹ کر رکھ دیے ہیں۔ پہاڑی کنارے مٹی کے بہاؤ کی بدولت کاٹ پیٹ کا شکار ہوگئی تھیں۔

اس نے مجھے کہا ''ہم سوچتے تھے کہ یہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کریں گے۔ ان کے باپ دادا نے درخت کاٹ کر اور اہرام بنا کر اپنے آپ کو برباد کر لیا تھا اور اب یہ بے وقوف، احمق لوگ یہ تباہی پھیلا رہے ہیں۔'' میں اسے کہنے لگا کہ شہری ماحولیاتی آلودگی آگے چل کر زیادہ تباہی کا باعث بنے گی، ہمارے کارخانے اور گاڑیاں اس تباہی کے اصل ذمہ دار ہیں اور یہ ہماری حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ کیمپسینو زان درختوں کو جلا رہے ہیں مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری بات کو قدیم خیالات جان کر ریڈ انڈین کو پسند کرنے والا ماحولیاتی ماہر سمجھے گا اور اس لئے گھر پر اعتبار نہیں کرے گا۔ میں کھڑکی سے باہر گھورنے لگا۔ بنجر زمینیں دیکھ کر مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں اس ملک میں مایان شامین سے ملنے آیا تھا۔ ایک این جی او نے مجھے اگلے چند دنوں میں منعقدہ تقریب کی افتتاحی رسومات ایک شامین سے کروانے کی درخواست لے کر بھیجا تھا۔ میرے ساتھ چندہ جمع کرنے والی اور ''دولت کی روح'' نامی کتاب کی مصنفہ لائنی ٹوئسٹ تھی۔ ہمیں ان لوگوں سے ملاقات کرنے کے لئے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ معلوم کرنے پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ مایان پر جاری ظلم و جبر میں امریکہ کی حمایت بھی شامل ہے اور اسی وجہ سے وہ لوگ ہم سے ملنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ہم بھی امریکی تھے۔

بالآخر انتھک کوششوں کے بعد شامین سے ملاقات کا اہتمام ہو ہی گیا۔ ہم اس کے کچی اینٹوں سے بنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے نیلی جینز اور روایتی کڑھی ہوئی قمیص پہنی ہوئی تھی اور سر پر لال رنگ کا رومال باندھ رکھا تھا۔ اس کا گھر جلتی لکڑیوں اور جڑی بوٹیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ ان اونچے پہاڑوں میں بنا ہوا تھا جو پانی اور مٹی کے بہاؤ کی وجہ سے کاٹ پیٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ جب میں نے اسے دعوت میں بلانے کی وجوہات سے آگاہ کر دیا تھا تو وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ دراصل ہم لوگ اس کی مدد سے اس کے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے تھے۔ میں مستقل ہسپانوی زبان میں بات کر رہا تھا جبکہ مترجم ان الفاظ کو مایان زبان میں دہرا رہا تھا۔

جب میں نے بات مکمل کر لی تو شامین نے غصے میں اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا۔ وہ پر جوش انداز میں ہاتھ کے اشارے سے چیختے ہوئے کہنے لگا ''میں تم لوگوں کی مدد کیوں کروں؟ تمہارے

لوگ پچھلے پانچ ہزار برس سے میرے لوگوں کا قتل کرتے آئے ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں یہ کام صرف ہسپانوی لوگ ہی نہیں کیا کرتے تھے۔ میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں کہ تمہاری حکومت خفیہ پرکاروں اور وردی میں ملبوس فوجیوں کو یہاں بھیجتی ہے اور آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ تم لوگوں نے ہمارے دارالحکومت پر حملہ کیا اور اربینز وہ واحد صدر تھا جو ہماری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن تم لوگوں نے اسے بے دخل کر دیا۔ تم نے گوئٹے مالا کے عوام کو اذیت پہنچانے کے لئے ان کے فوجیوں کو تربیت دی اور اب تمہیں مجھ سے مدد چاہیئے؟''

یکدم پیپ کے الفاظ مجھے اپنی یادوں سے باہر لے آئے وہ کہہ رہا تھا ''یہ مایان غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔'' وہ ہم سب کو ان کی پریشانی کا سبب مانتے ہیں۔ ہم انہیں کام دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم انہیں غلام بنا رہے ہیں اور جب ہم انہیں کام نہیں دیتے جیسے کہ ایک دفعہ میرے خاندان والوں نے ہیٹی کے رہنے والوں کو یہاں لے کر آ گئے تھے کیونکہ وہ نہایت کم قیمت پر کام کر دیتے ہیں تو ان مایان نے فساد کر کے ہمیں مارنے کی کوشش کی تھی۔ ایسا صرف یہاں نہیں ہوتا ہے ایسی حرکتیں پورے خطے میں ہو رہی ہیں۔ جیسے کہ آنڈیز، امیزون، میکسیکو، برازیل، ایکواڈور، پیرو، وینزویلا، کولمبیا اور بولیویا میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ریو گرانڈے کے جنوب میں واقع کسی ملک کا نام لے لو۔ وہ کہتے ہیں کہ تم گرنگو کبھی یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ تم سب کو مار ڈالنا چاہتے ہو اور اب ہم تمہارے راستے پر چلیں گے۔ اس نے میرے گھٹنے پر زور دیتے ہوئے کہا ''میرے الفاظ یاد رکھنا۔ اگلے کچھ عشروں میں سب سے بڑا مسئلہ مقامی لوگوں یعنی ریڈ انڈین کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ تم چاہے جمہوریت کی بات کرو مگر ان ممالک کو مضبوط حکمرانوں کی ضرورت پڑنے والی ہے جو ان انڈینز پر قابو رکھ سکیں۔ یہ مایان جمہوریت وغیرہ کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے۔ اسی طرح کیوچوا ہیں اور باقی سب بھی۔ ان کو موقع ملے تو ہم سب کو ذبح کر ڈالیں۔''

میں نے اسے شامین کے بارے میں نہیں بتایا تھا جو بالآخر ہمارے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی ہو گیا تھا۔ اس کی رضامندی ہمیں اس وقت ملی تھی جب میں نے اسے بتایا کہ ہم اس کی مدد اس لئے چاہتے ہیں کیونکہ ہم مل کر اپنے اور تمہارے لوگوں کے درمیان پل بن سکتے ہیں۔ میں نے شامین کو بتایا ''امریکہ میں ہم میں سے بہت سے لوگ اس نفرت کو سمجھتے ہیں جو تم لوگ ہماری حکومت کے رویوں کی وجہ سے محسوس کرتے ہو لیکن ہمیں یہ سب کچھ بدلنا ہوگا۔'' میں نے اپنا بیگ کھولا جس میں انکا Incas سے لائے ہوئے پتھر تھے جو مجھے کیوچوا شامین نے ایکواڈور میں تحفے

کے طور پر دیئے تھے۔ میں نے اس سے کہا ''اور ہم ایسا ہی کچھ کرنے کی کوشش لاطینی امریکہ کے دوسرے حصوں میں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' یہ سننے کے بعد اس نے اچانک ہسپانوی زبان نہایت روانی سے بولنا شروع کردی تھی۔

جب پیپ کی گاڑیوں کا کارواں گرم چشموں کے منصوبے کے مقام پر پہنچا تو میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اسٹون اینڈ ویبسٹر کو کیا مشورہ دینا ہے۔ یہ منصوبے صرف عالمی بینک کے قرضوں سے امیروں کو مالا مال کرنے اور غریبوں کو لوٹنے کے بارے میں نہ تھا بلکہ یہ مایان لوگوں کو ان کے مقدس عقائد سے محروم کرنے کے مترادف تھا۔ جب تینوں گاڑیاں رکیں تو پیپ نے مجھے اندر رہنے کو کہا اور اس کے بارہ عدد محافظوں نے پورے علاقے کی تلاشی لی۔ باہر زمین سے بھاپ کے بڑے بڑے بادل اٹھ رہے تھے۔

جب میں اور پیپ ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے تو وہ پانی کے دباؤ، کلوواٹ اور تعمیراتی لاگت کے اعداد کے حوالے سے بات کررہا تھا ہم ابلتے پانی کے حوض کے کنارے گندھک کا دھواں سانس کے ساتھ جاتا محسوس کرنے لگے۔ اس نے بھاپ کی دوسری طرف پہاڑی سے نیچے وادی کی طرف اشارہ کرکے دکھایا اور بتایا کہ میری بہن نے وہاں مساج اور گرم حمام کھولنے کا ارادہ کیا ہے۔

میرے منہ سے نکلا ''مایان بھرپور مزاحمت کریں گے۔''

اس نے کہا ''نہیں! یہاں تم غلط ہو۔ وہ بے وقوف ہو سکتے ہیں مگر وہ مجھ سے اور میرے کام سے اچھی طرح واقف ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا ''مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے اور اس کے لئے زیادہ بھاری قیمت بھی ادا نہیں کرنا پڑے گی بلکہ میرا خیال ہے کافی آرام اور سستے میں ان کا علاج ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے تمہارے ادارے کو میرے جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ گوروں کی مذاکراتی جماعت کو ایک دفعہ یہاں لانا ہوگا اور سب طے ہو جائے گا اور دوسری طرف ہم ان کو قابو کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میری نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میرا خیال ہے تمہیں پتہ ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

میں نے سر ہلایا اور مڑ گیا۔ یقیناً میں سمجھ گیا تھا اور میں یہ سن کر سیخ پا ہو گیا تھا۔ میں چشمے کی دوسری طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ جس کی طاقت کی وجہ سے اس قدر حیرت انگیز عمل وقوع پذیر ہو رہا تھا کہ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اسے ابلتے پانی میں پھینکا۔ میں نے اس پتھر کو مایان جذبوں

کے احترام میں پھینکا تھا۔

ہماری واپسی کا سفر ٹریفک رش کی وجہ سے اتنا طویل ہو گیا تھا کہ میری فلائٹ چھوٹ گئی۔ اس بات نے پیپ کو پریشان نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے پائلٹوں کو فون کر دیا۔ وہ مجھے عمارت سے لے کر پیپ کے نجی جیٹ کی طرف لے گئے۔ یہ نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا کہ دو پائلٹ اور ہزاروں ڈالرز کا ایندھن مجھے میامی لے جائے گا تاکہ میں پیپ کے منصوبے پر ٹھپہ لگا دوں۔ شروع میں مجھے جہاز قبول کرتے ہوئے احساس جرم ہوا لیکن پھر اس سے یہ جان کر نجات حاصل ہوئی کہ مایان شامین اور گرم چشموں کی روحیں بہت خوشی محسوس کریں گی اور میری شکر گزار ہوں گی

پیپ کے ان الفاظ نے مجھے کئی سالوں تک خوفزدہ کئے رکھا تھا۔ ''میرے الفاظ یاد رکھنا، اگلے کچھ عشروں میں سب سے بڑا مسئلہ مقامی لوگوں یعنی ریڈ انڈین کو قابو میں رکھنا ہوگا۔'' ان الفاظ نے تیسرے ہزاریے میں اپنے لئے نئے مفہوم پیدا کر لئے تھے۔

۱۹۹۸ء کے آغاز پر جنوبی امریکہ کے سات ممالک کی ۳۷۰ ملین آبادی میں سے ۳۰۰ ملین کی آبادی نے دو ایسے سربراہان کو منتخب کیا تھا۔ تینوں نے اپنی پوری انتخابی مہم غیر ملکی استحصال کی مخالفت کو بنیاد بنا کر چلائی تھی۔ ہمارے پریس اور سیاستدانوں کے وعدوں کے باوجود ووٹ کمیونزم آمریت یا دہشت گردی کے خلاف نہیں ڈالے تھے۔ وہ تمام ووٹ خود مختاری کے حق میں ڈالے گئے تھے۔ جمہوری طریقے کے ذریعے ہمارے پڑوسیوں نے ہمیں ایک بھرپور پیغام بھیجا تھا۔ انہیں ہمارے ایثار کی ضرورت نہیں تھی وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہماری کارپوریشنز ان کا اور ان کی زمینوں کا استعمال اور استحصال بند کر دیں۔

لاطینی امریکہ کے عوام پینی، جیفرسن اور واشنگٹن اور ان تمام بہادر مردوں، عورتوں اور بچوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے جو برطانوی تسلط کے خلاف ۱۷۷۰ء کے دور میں ڈٹ گئے تھے۔ یہ تاریخ کا ایک امید افزا موڑ تھا کہ سلطنتوں کے خلاف اٹھنے والے جدید انقلاب کی باگ ڈور مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے بانیوں نے اپنی حکومتوں کی بنیاد اصولوں پر رکھی تھیں اور ہماری مین البراعظمی فوج نے غریب ریڈ انڈینز کو جاسوس اور فوجی بنا کر رکھ دیا تھا اور آخر میں ہم نے انہیں لاتعلقی اور نسل کشی کا انعام دیا تھا۔ بہت سے شمالی امریکہ کے ملکوں کے لئے وہ ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان رہنماؤں کی صورت میں ایک نئی نسل ابھر رہی تھی، اگرچہ وہ قبل از کولمبیائی تہذیبوں کی پیدائش ہیں مگر یہ رہنما اپنے ووٹروں کو غریب، مجبور، حق رائے دہی سے محروم

عوام کی صورت میں نسل، ثقافت اور مذہب سے بالاتر ہو کر دیکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ وہ جھونپڑیوں اور دیہاتوں میں بستے ہیں اور یہ انقلابی رویہ سب سے زیادہ بولیویا میں واضح ہو کر نظر آتا ہے۔ جب میں نے ۲۰۰۵ء میں بولیویا کے صدارتی انتخابات کا مشاہدہ کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ پیپ کو اس وقت کیسا محسوس ہو رہا ہوگا، اس کا رد عمل کیا ہوگا، جب نہایت متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مقامی کسان نے واضح اکثریت سے انتخاب جیتا ہوگا جو ایمارا انڈین کی نسل سے تعلق رکھتا تھا؟ ایوو مورالیس کی فتح پیپ کے بدترین خواب کی تعبیر ہوگی۔ صدارتی انتخابات کے بعد ٹی وی کوریج دیکھتے ہوئے میں واپس اسی دور میں چلا گیا تھا جب مجھے بولیویا کے طاقتور ترین عہدہ کی پیشکش ہوئی تھی اور جس طرح وہ سب ہوا تھا وہ کارپوریٹوکریسی کے رویوں اور حرکتوں کی غمازی کرتا تھا۔

باب نمبر: ۱۷

بولیویا کے توانائی ادارے کا سربراہ

"بولیویا ان علاقوں کی علامت ہے جن کا فائدہ بڑی سلطنتوں نے اٹھایا ہے۔" یہ الفاظ میرے ذہن میں اس وقت سے موجود ہیں جب انہیں میری تعلیمی مشن کی تربیت کے دوران میرے ایک استاد نے ایسکونڈیڈو، کیلی فورنیا ۱۹۶۸ء میں ادا کئے تھے۔ وہ استاد بولیویا میں رہ چکے تھے اور وہ مسلسل ہمیں صدیوں کے اس جبر کے اثرات کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔

تربیت کی تکمیل کے بعد جب میں ایکواڈور میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دے رہا تھا تب میں اکثر بولیویا کے بارے میں سوچتا تھا۔ میں چاروں طرف سے خشکی میں گھرے ہوئے ملک کے بارے میں سوچ کر ایک دلکشی محسوس کرتا تھا جو نقشے میں بسکٹ میں ہوئے سوراخ جیسا محسوس ہوتا تھا۔ ملک کو پیرو، چلی ارجنٹائن، پیراگوئے اور برازیل کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ تعلیمی مشن کے دوران میں نے بولیویا کے تمام پڑوسیوں سوائے پیراگوئے کا دورہ کیا ہوا تھا۔ پیراگوئے میں اس کے حکمران جنرل الفریڈو اسٹروسنر اور اس کی نازی ایس ایس افسران کو پناہ دینے کی حکمت عملیوں کے خلاف ذاتی احتجاج کے طور پر نہیں گیا تھا۔ میں بولیویا کے بارے میں معلومات جمع کرتا رہتا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ شمالی امریکی نوجوان رہا کرتے تھے جن کو ہم "گرنگو کے سفر پر" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ وہ اکثر بتایا کرتے تھے کہ بولیوین اپنے انڈین ایکواڈور سے بھی زیادہ سفاک ہے۔

اس وقت یہ ناممکن سمجھا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا ملک اس سلسلے میں ایکواڈور پر سبقت حاصل کر سکتا ہے۔ ملک کے اعلیٰ طبقے مقامی، دیسی لوگوں کو جانور مانتے تھے کچھ چند دن پہلے امریکہ میں رہنے والے افریقی امریکیوں کی طرح انہیں بھی شہری حقوق حاصل نہیں تھے۔ افواہیں مشہور تھیں کہ امیر مرد ایک کھیل کھیلا کرتے ہیں کہ اگر وہ کسی ریڈ انڈین کو کچھ غیر قانونی کام کرتا پکڑ لیں جیسے کہ اپنے خاندان کو فاقے سے بچانے کے لئے مکئی کا بھٹا چراتے ہوئے پکڑ لیں تو وہ اسے بھاگنے کا حکم دیتے ہیں اور پھر نشانہ لگا کر گولی سے اڑا دیا کرتے ہیں۔

امیزون میں کام کرنے والی تیل کی کمپنیوں کے کرائے کا قاتل بھی اسی طرح لوگوں کو قتل

کر دیا کرتے تھے لیکن وہ اسے دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے تھے کسی کھیل کا حصہ نہیں سمجھتے تھے
مگر ایکواڈور میں بربریت کے باوجود بولیویا بظاہر زیادہ ابتر حالت میں تھا۔

اس خیال کو اس بات سے تقویت پہنچتی ہے کہ ارجنٹائن کے ڈاکٹر چی گوویرا جنہوں نے جب ظلم وتشدد کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو انہوں نے اس مہم کے لئے بولیویا کا انتخاب کیا تھا۔ حکمران طبقے نے اس سلسلے میں واشنگٹن سے مدد کی درخواست کی۔ چی گوویرا کو درجہ بندی کم کر کے جانور یا دہشت گردوں میں کر دی گئی تھی کیونکہ اس کو کیوبا کی حمایت حاصل تھی اس لیے اسے کمیونسٹ پاگل بیان کیا جاتا تھا۔ واشنگٹن نے اپنے انتہائی ماہر قاتل کو اسے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ سی آئی اے کے ایجنٹ فیلکس راڈریگیز نے چی گوویرا کو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں لاہیگویرا، بولیویا کے قریب ایک جنگل میں گرفتار کر لیا تھا۔ گھنٹوں کی تفتیش کے بعد بولیویا حکمرانوں کے دباؤ میں آکر راڈریگیز نے بولیویا کی فوج کو چی گوویرا کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے بعد کارپریٹوکریسی کی گرفت بولیویا کے گرد تنگ ہوگئی تھی بسکٹ نے سوراخ کو دبا کر چھوٹا کر دیا تھا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے دوران بحیثیت معاشی تباہ کار کے بالآخر بولیویا پہنچنے سے پہلے میں کافی تحقیق کر چکا تھا۔ مجھے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بربریت میری توقعات سے کہیں زیادہ تجاوز کر چکی ہے اور تعلیمی مشن میں میرے استاد اور ان گورے ساتھیوں نے بڑی ہی محدود معلومات دی تھیں۔ یہ ملک انسانی تاریخ کے آغاز سے ہی بدترین تشدد کا شکار رہا ہے اور ہمیشہ سے مسلسل جابر حکمرانوں اور مفاد پرست سلطنتوں کے عتاب کا شکار رہا ہے۔

بولیویا کی مقامی ثقافتوں کو انکاس نے تیرہویں صدی میں فتح کر لیا تھا۔ ہسپانوی حملہ آور یہاں ۱۵۳۰ء میں پہنچے تھے۔ انہوں نے انکاس کو غلام بنانے کے لئے ہزاروں انسانوں کو بربریت سے قتل عام کیا تھا اور اس طاقت کے زور پر اس علاقے میں ۱۸۲۵ء تک قابض رہے۔ ۱۸۷۹-۱۹۳۵ء کے دوران مستقل جنگوں میں بولیویا بحرِ اوقیانوسی ساحل چلی کے ہاتھوں ہار گیا، تیل سے مالا مال چاکو کا علاقہ پیراگوئے نے ہتھیا لیا اور ربڑ پیدا کرنے والے جنگلات پر برازیل نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۵۰ء کے دور میں اصلاح پسند حکومت نے وکٹر یاز اسٹینسورو کی سربراہی میں انڈین اکثریت کی حالت بہتر بنانے استحصال شدہ ٹن کی کانیں کو قومیانے کے لئے حکمت عملیوں کا آغاز کیا تھا۔ اس پر بین الاقوامی تاجر برادری طیش میں آ گئی اور وکٹر یاز اسٹینسورو انتظامیہ ۱۹۶۴ء میں فوجی افسران کے گروہ نے تختہ الٹ دیا۔ ظاہر ہے سی آئی اے اس سب میں ملوث تھی، ستر کی

دہائی میں لگاتار کئی حکومتوں کو زیر زبر کر دیا گیا۔

یہاں تک کہ اس ملک کا جغرافیہ بھی ظالم تھا۔ ملک کے دو متوازی اور سنگلاخ آنڈین پہاڑی سلسلے اسے تین الگ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا خشک اور سخت گیر سطح مرتفع کا بلند علاقہ جسے الٹیپلانو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوسرا مغرب کی نیم گرم وادیاں اور آخر میں شرق کے میدانی علاقے اور وسیع بارانی جنگلات۔

بولیویا کی نوملین باشندوں کی اکثریت ریڈ انڈین تھے جو روایتی طور پر آنڈین ڈھلانوں سے جڑے ہوئے کھیتوں سے حاصل کی ہوئی اشیاء پر گزارہ کرتے تھے۔ نسلی تنوع کے بارے میں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بولیویا کی تین قومی زبانیں ہیں کیوچوا، ایمارا اور ہسپانوی۔ اگرچہ یہ ملک قدرتی وسائل جیسے کہ چاندی، ٹن، تیل، جست، پانی سے بجلی پیدا کرنے کی طاقت اور وینزویلا کے بعد جنوبی امریکہ کے دوسرے سب سے بڑے قدرتی گیس کے ذخائر سے مالا مال ہونے کے باوجود بھی خطے کے چند غریب ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔

بولیویا، آئی ایم ایف کے اسٹرکچر کو نافذ کرنے والے پہلے چند ممالک میں سے تھا مگر اس کی کچھ ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔

۱۹۷۰ء عشرے کے وسط میں جب میں بولیویا پہنچا تو چی گوویرا کی تحریک کے خوف کے باعث تاجروں کے اعلیٰ طبقے اور فوج نے گٹھ جوڑ کے بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ مقامی طبقوں کو زیردست رکھ سکیں۔ میری ذمہ داری یہ تھی کہ ایسے طریقے ڈھونڈوں جس کے ذریعے معاشی تباہ کار اس گٹھ جوڑ کو کارپریٹوکریسی کے ساتھ مل کر زیادہ بہتر طریقے سے کام کرنے پر مجبور کر سکیں۔ بولیویا کے باشندوں کے مختلف طبقوں سے میری ملاقاتوں کے دوران میں نے وہ منصوبے ترتیب دیئے تھے جن کے ذریعے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بہت سے ممالک نے سیپ کو منظور کر لیا تھا۔ انڈونیشیا کے سوہارتو کی طرح بولیویا کے حکمرانوں نے بھی ایسے منصوبوں پر عمل کرنے کے لئے آمادہ تھے جن کے ذریعے وہ ملکی وسائل غیر ملکیوں کو فروخت کر سکیں۔ غیر ملکی کان کن کمپنیوں سے فائدہ حاصل کرنے اور ان کے کام آنے کی بولیویا کے حکمرانوں کی طویل تاریخ موجود ہے۔ وہ بھاری قرضے حاصل کرتے تھے، اپنے روایتی دشمنوں یعنی پڑوسی ممالک سے خوف محسوس کرتے تھے، اسی طرح مقامی آبادیوں سے بھی خائف رہے تھے۔ وہ واشنگٹن کی طرف سے حفاظت کے وعدوں کو یقینی بنایا کرتے تھے اور اس تمام عمل میں امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بھی

سو ہارتو کی طرح اپنی قسمت کا انحصار امریکہ اور یورپ پر کرتے تھے اور مستقبل میں بولیویا کے معاشی بحران سے اپنے آپ کو بالکل لاتعلق کر رہے تھے۔

۱۹۷۰ء کی ابتدائی ملاقاتوں کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بولیویا نجکاری کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ لاپیز کے تاجران اور سیاستدان کان کن کمپنیوں کے شروع کئے ہوئے نمونے کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ چاہے اس کے لئے انہیں اپنے ملک کی خودمختاری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ اس طرز عمل نے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بھی آزاد کر دیا تھا جیسے کہ ٹیکسوں اور سرمائے کی منڈیوں اور اپنے بینک اکاؤنٹس کے ذریعے آمدنی حاصل کر کے اسے پانی، نکاسی، بجلی، مواصلات، نقل و حمل، تعلیم اور قانون کی بہتری کے منصوبوں میں لگائیں۔ میری مدد سے انہیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوئی تھی کہ ان تمام خدمات کے صلے میں انہیں منافع بخش ٹھیکے ملیں گے۔ ان کی اولادوں کو امریکہ میں مفت تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کو معتبر انجینئرنگ اور تعمیراتی کمپنیوں میں وظیفے اور انٹرن شپ ملیں گی۔ انہوں نے بخوشی بیرونی سرمایہ کاروں کے ٹیکس میں رعایتیں منظور کر لیں اور ساتھ ہی امریکی برآمدات پر عائد تجارتی پابندیاں کم کر دیں اور ہمارے مطالبے پر بولیویائی مصنوعات پر عائد کر دیں۔ خلاصہ یہ تھا کہ بولیویا کے امراء اور فوجی گٹھ جوڑ نو آبادیاتی نظام کی ایک نئی شکل سے فائدہ اٹھانے کے لئے پوری طرح تیار تھے جب تک انہیں آئی ایم ایف کی زبان جیسے کہ موثر انتظام، بہتر معیشت اور بنیادی تبدیلیوں جیسے دلکش الفاظ میں بیان کئے جائیں۔

حکومت کے مشترکہ منصوبوں کی اجازت دینے کے قانون کی منظوری کے بعد بیرونی سرمایہ ملک میں داخل ہونے لگا اور کرنسی کی تبدیلی پر عائد پابندی ختم کرنے کے ساتھ ہی بولیویا کی پانچ سرکاری کمپنیوں کی نجکاری میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ساتھ ہی حکومت نے ۱۹۹۰ء میں ان منصوبوں کا اعلان کر دیا جن کے مطابق ۱۵۰ سرکاری کمپنیوں کو غیر ملکی سرمایہ کاروں کو فروخت کرنا تھا۔ جہاں پر بہت سے امریکی حکومتی فیصلہ ساز منافع بخش کارپوریٹ ملازمتوں میں داخل ہو رہے تھے وہاں مجھے بھی قسمت سے بولیویا کی سب سے طاقتور یوٹیلیٹی کمپنی کی سربراہی پیش کی گئی۔

۱۹۹۰ء میں امریکی کمپنی لیوسیڈیا نیشنل کارپوریشن نے مجھ سے رابطہ کیا اور دریافت کیا کہ کیا میں ان کی ضمنی کمپنی بولیویا پاور کمپنی کی صدارت قبول کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ لیوسیڈیا نقصان میں جانے والی کمپنی کو خرید کر انہیں منافع کمانے کے مراکز میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کے لئے

مشہور تھی۔ (لیوسیڈیا نے ۲۰۰۴ء میں اس وقت بے حد شہرت حاصل کی جب اس نے ملک کی دوسری سب سے بڑی طویل فاصلے پر سامان لاد کر لے جانے والے جہازوں کی کمپنی کے ایم سی آئی کے ۵۰ فیصد حصص خریدنے کے لئے اینٹی ٹرسٹ کلیئرنس کے لئے درخواست دی تھی) کارپوریٹ نمائندوں نے مجھے بتایا کہ بولیویا پاور کمپنی چلانے کے لئے میں نہایت موزوں امیدوار ہوں۔ بولیویا کے سیپ کی تنظیم سازی کے علاوہ میری ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ میں امریکہ میں کام کرنے والی نہایت کامیاب پاور کمپنی کا سربراہ اور مالک بھی تھا (یہ کمپنی میں نے معاشی تباہ کار کا کام ترک کرنے کے بعد بنائی تھی جس کے لئے میں نے اپنی معاشی تباہ کاری ملازمت سے حاصل ہونے والے تجربات کو استعمال کیا تھا) پھر میں ہسپانوی زبان جانتا تھا اور لاطینی امریکہ کی ثقافتوں سے واقف تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ سابق معاشی تباہ کار کی حیثیت سے میں عالمی بینک اور انٹر امریکی ڈیولپمنٹ بینک سے بولیویا پاور کمپنی کے لئے قرضے آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔

مشرقی ساحل پر ہونے والی ملاقاتوں کے لئے لیوسیڈیا کمپنی نے میری بیوی ونیفریڈ، سات سالہ بیٹی جیسیکا اور مجھے سالٹ لیک سٹی مینشن پر جہاز کے ذریعے لے کر گئی جہاں پر کمپنی کے اعلیٰ افسر، ایان کمنگ اور اس کی بیوی اپنا بیشتر وقت گزارتے تھے۔ اعلیٰ عہدیداروں سے تعارفی ملاقاتوں کے بعد ہم کمنگ خاندان کے ساتھ نہایت شاندار پانچ کھانوں سے مزین رسمی دعوتوں کے کمرے میں جمع ہوئے جس کا انتظام ان کے عملے اور باورچیوں نے کیا تھا۔ کھانے کے بعد میں اور ایان نجی گفتگو کے لئے اس کے دفتر میں بیٹھ گئے۔ ملاقات کے دوران ایک ملازم مخل ہوا اور نہایت معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت کرنے لگا کہ اسے لاپیز سے ایک فیکس موصول ہوا ہے کہ ہسپانوی مترجم ڈاکٹر سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا ہے اور میں اس سلسلے میں مدد کر پاؤں گا۔ جب میں نے پیغام با آواز بلند انگریزی زبان میں پڑھا تو میں یہ شبہ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ میری زبان پر مہارت کا امتحان لیا گیا ہے۔ بظاہر میں نے وہ اور کئی دوسرے امتحانات کامیابی سے پورے کر لیے تھے۔ سالٹ لیک سٹی کے دورے کے فوراً بعد لیوسیڈیا نے ہم تینوں کو بولیویا لے جانے کا انتظام کر دیا تھا۔

باب نمبر:۱۸

لاپیز میں منافع کو حد درجہ تک پہنچانا

واپسی پر ہم ایل آلٹو پر اترے تھے۔ یہ دنیا کے چند بلند ترین کمرشل ایئرپورٹ میں سے ایک ہے۔ سطح مرتفع پر واقع یہ ایئرپورٹ سطح سمندر سے قریب تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ رخصت ہوتے ہوئے ہم بولیویا پاور کمپنی کے صدر اور ان کی اہلیہ سے ملے۔ وہ اور ان کی کمپنی کے دیگر اعلیٰ عہدیداروں نے ہمارے قیام کے دوران خاطر مدارات بادشاہوں کے سے انداز میں کی تھی۔ انہوں نے ہمیں مقامی بازاروں، میوزیم اور علاقے کے گرجا گھروں کی سیر کرائی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمیں امریکی طرز کا وہ اسکول بھی دکھایا جہاں میری بیٹی (جیسیکا) تعلیم حاصل کرے گی۔ اس کے علاوہ وہ ہمیں امراء کے کنٹری کلب لے کر گئے جو ہماری رکنیت شامل کرنے کے لئے بے تاب تھے اور پھر وہ ہمیں لاپیز کے پہاڑوں میں گھرے دلچسپ تفریحی مقامات پر لے کر گئے جن میں سے ایک پتھروں سے بنی ہوئی ''ویلی آف دی مون'' تھی۔ انہوں نے ہمیں پاور پلانٹ اور سب اسٹیشنز کے درمیان رہنمائی فراہم کی اور اس کے علاوہ مجوزہ مواصلاتی نظام بھی دکھایا۔

ایک سرد اور بارش کی دوپہر میں کمپنی کے عہدیدار نے اعلان کیا کہ وہ ہمیں اپنے منصوبے کی روح و قلب دکھائیں گے۔ میں نہایت شاندار انجینئرنگ کا کمال دیکھنے کی امید کر رہا تھا مگر اس عہدیدار کا ڈرائیور ہمیں برفانی بوندا باندی کے درمیان سے گزرتا ہوا لاپیز کے عین وسط میں واقع کمرشل بینک لے آیا تھا۔

بینک کی عمارت کے ساتھ اور علاقے کے اطراف میں شکستہ حال انڈینز کی قطار پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھگو دینے والی بارش میں اکٹھے ہو کر کھڑے تھے۔ کئی لوگوں نے سر ڈھانپنے کے لئے اخبارات تانے ہوئے تھے۔ وہ اپنے روایتی کپڑوں یعنی اونی پتلونیں، اسکرٹس اور لمبے چوغے جنہیں وہ پونچوز کہتے تھے پہنے ہوئے تھے۔ جب میں نے گاڑی کا شیشہ ذرا سا نیچے کیا تو مجھے ٹھنڈی ہوا، گیلے اونی کپڑوں اور گندے جسموں کی بدبو کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہسپانوی حملہ آوروں کے دور کی باقیات لگ رہے تھے جو انہیں ٹن کی کان میں کام کرنے کے بعد قطار میں کھڑا کر دیتے

تھے۔ وہ مظلوم خاموشی سے کھڑے گھورتے رہے اور پھر کبھی کبھار بینک کے دیوہیکل دروازوں کی طرف قدم بڑھاتے تھے جہاں مسلح محافظوں کا ایک جتھا کھڑا ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ خستہ حال بچے بھی اس صف میں نظر آ رہے تھے۔ بہت سی عورتیں بچوں کو چادروں میں لپیٹے کھڑی تھیں اور ان کے کپڑوں اور کندھوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ عہدیدار نے وضاحت کی ''یہ لوگ اپنے بجلی کے بل دینے آئے ہیں۔''

ونیفریڈ بڑبڑائی ''کس قدر ظلم ہے۔''

عہدیدار نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو خوش قسمت لوگ ہیں۔ ان کے دیہاتی رشتہ داروں کے برعکس انہیں بجلی کی سہولت میسر ہے۔

جب ہم دفتر کی طرف واپس آ رہے تھے تو عہدیدار ڈرائیور کی برابر والی سیٹ سے مڑ کر بتانے لگا کہ بولیویا پاور کمپنی امریکی قونصل خانے سے پیسوں سے بھرے بیگ امریکہ بھیجتی رہتی ہے۔ وہ پیسہ جس کو دینے کے لئے کیوچوا اور ایمارا قطار میں کھڑے تھے۔ ''یہ کمپنی لیوسیڈیا کے لئے دودھ دینے والی گائے کی مانند ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اگرچہ مظلوم لوگوں کا بجلی کا استعمال ایک بلب تک محدود ہے مگر پھر بھی مہینے میں ایک بار انہیں بینک ضرور آنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے پاس چیکنگ اکاؤنٹ اور کریڈٹ کارڈ نہیں ہیں اس لئے وہ قطار میں لگ کر نقد رقم ادا کرتے ہیں۔

اسی رات جب ہم لوگ اپنے کمرے میں بیٹھے تو ونیفریڈ نے پوچھا کہ قونصل خانہ ایک کارپوریشن کے لئے ڈاکیا کا کام کیوں کرتا ہے؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ امریکی سفارت خانے پوری دنیا میں بنیادی طور پر کارپریٹوکریسی کو فائدے پہنچانے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہم اس بات پر بھی حیران ہو رہے تھے کہ اس عہدیدار نے ان لوگوں کی قطاریں دکھانے کے لئے باقاعدہ راستہ تبدیل کیا تھا۔ ونیفریڈ نے کہا ''وہ اس پر کتنا فخر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا بیہودہ طریقہ ہے پیسہ کمانے کا؟''

اگلی صبح ہم لوگوں کو دریائے زونگو کے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ وہ منصوبہ مجھے بولیویا پاور کمپنی کی اصل روح محسوس ہوا۔ لاطینی امریکہ کی توانائی کی صنعت کے اعلیٰ عہدیداروں میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ منصوبہ پانی سے بجلی بنانے کے کئی مقامات کا سلسلہ تھا جو آنڈیز کی چوٹی سے شروع ہوتے ہوئے نیچے تنگ راستے سے ہوتے ہوئے گرم وادی میں اتر رہے تھے اور یہ تمام

منصوبہ مہارت اور ماحولیاتی تحفظ کا ایک بہترین نمونہ ہوگا۔ کئی انجینئرز نے یقین دہانی کرائی تھی کہ اسے پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے اس تکلیف دہ سفر کی پریشانی دور ہوگئی لیکن ایک نے افسوس سے کہا ''مگر یہ دوبارہ نہیں ہو پائے گا۔ ہم سب کو زونگو سے بہت محبت ہے کیونکہ یہ جس مہارت سے چیزیں ترتیب دی جانی چاہئیں اس کا یہ بہترین نمونہ ہے۔ مگر آج کل کوئی قرض دینے والا بشمول عالمی بینک کے اس چھوٹے اور عمدہ منصوبے کے لئے پیسہ نہیں لگائے گا۔ اگر انہیں دوبارہ ایسا کرنا پڑے گا تو وہ زور دیں گے کہ ایک بڑا ڈیم بنایا جائے اور پوری وادی کو سیلاب کے سپرد کر دیا جائے۔''

بولیویا پاور کمپنی کے صدر اور ان کی اہلیہ نے ہمیں دریائے زونگو چلنے کی دعوت دی۔ وہ ہمیں ایک دن سورج نکلنے سے پہلے لینے ہوٹل آ گئے تھے۔ ہم ڈرائیو کرتے ہوئے شہر سے باہر آ گئے اور الٹیپلانو کی طرف روانہ ہوئے۔ برف کی دبیز تہہ سے ڈھکا ہوا یہ بنجر سطح مرتفع آرکٹک برف کی دبیز تہہ سے ڈھکا ہوا یہ بنجر سطح مرتفع شمالی امریکا اور یوریشیا کے درمیان واقع آرکٹک کا درختوں سے پاک خطہ محسوس ہو رہا تھا۔ میدانوں کا خشک وجود لگ رہا تھا۔ اچانک صبح ہونے لگی اور پہاڑی سلسلے کارڈلیر اریئل کے کنارے ساتھ طلوع ہوتا شاندار سورج دیکھا تھا۔ اس کا خطاب ''امریکہ کا ہمالیہ'' تھا۔ آندیز کے اس پہاڑی سلسلے میں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں جن کی بلندی انیس ہزار فٹ یا اس سے بھی بلند تھی۔

کئی گھنٹوں بعد ہم جیسے ہی ایک سترہ ہزار فٹ بلند پہاڑی درہ کے برابر سے گزرے تو جیسیکا کو اپنا پہلا گلیشئر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ایپا کا زنامی جانور زرخیز میدان میں گھوم رہے تھے جو بہت بڑی برفانی تہہ سے جدا کر رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ جب جیسیکا سڑک پر دوڑتے ہوئے اس منظر کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی تو اس کے ہونٹ آکسیجن کی کمی سے کالے ہو رہے تھے۔ وہ اچانک گھٹنوں کے بل گر پڑی اور اسے زور دار قے ہوئی۔ ونیفریڈ اور میں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور ہم کم بلندی والے علاقوں کی طرف آ گئے اور بعد دوپہر پانی سے بجلی بنانے والے مقام پر پہنچے تھے۔

ایک چھوٹا ڈیم پگھلے ہوئے گلیشئر سے بنا دریائے زونگو کے پار پانی جمع کرنے کا تالاب بنا رہا تھا۔ وہاں سے پانی بہتا ہوا پہاڑوں کے کنارے کو کاٹ کر بناتی ہوئی لہروں میں جا گرتا تھا اور پھر وہاں سرنگوں سے ہوتا ہوا دھاتی نالی سے گزرتا ہوا پاور ہاؤس میں آتا تھا جہاں بجلی پیدا ہوتی

تھی۔ اس عمل کو کئی دفعہ دہرایا جاتا تھا۔ یہ عمل اس مہارت سے بنا ہوا تھا کہ دریا کی توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت کو بڑھایا جائے اور ساتھ ہی قدرتی منظر کی خوبصورتی بھی برقرار رہے۔ جب ہم گھاٹی میں سے گزر رہے تھے جو چاروں اطراف عمودی چٹانوں سے گھری ہوئی تھی تو اب پوری طرح چاق و چوبند جیسیکا نے کچھ ایسا کہا جو پورے جذبات کی بھی ترجمانی کرتا تھا۔ اس نے کہا ''میں خوش ہوں کہ ان لوگوں نے بڑا ڈیم بنا کر پوری وادی کو پانی پانی نہیں کر دیا، یہ بہت خوبصورت ہے۔''

آخر میں ہم اس چھوٹے سے بنگلے پر رک گئے جو میری ملازمت قبول کرنے کی صورت میں ہماری رہائش گاہ ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد میں، ونیفریڈ اور جیسیکا قریب واقع آبشار کی طرف پیدل روانہ ہو گئے۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہم کافی توانا محسوس کر رہے تھے۔ بالخصوص لاپیز اور پہاڑی درے کی فضا کے مقابلے میں یہ کافی بہتر محسوس ہو رہا تھا۔ ہم آبشار کی قریبی چٹان پر چڑھ گئے تھے۔ سرسبز پتوں کے درمیان سے تنگ وادی کے پار ہم نے سورج کو پہاڑوں کے عقب میں غروب ہوتے دیکھا اور پھر ہم واپس اپنے میزبانوں کے پاس بنگلے پہنچ گئے۔ میزبانوں نے ہمارے لئے لاسا گنا پکایا تھا جس کا ذائقہ بالکل ایسا تھا جیسے وہ تازہ تازہ کوریئر کے ذریعے روم سے پہنچا ہو۔

اس شام جب جیسیکا سو گئی تھی تو ہم چاروں کافی دیر تک شراب پیتے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ واضح تھا کہ بولیویا پاور کمپنی کے صدر اور ان کی اہلیہ بولیویا میں گزرے وقت سے بہت خوش تھے اور ساتھ ہی یہ بھی عیاں تھا کہ اب وہ بے چین ہیں کہ میں ان کی جگہ لے لوں اور وہ واپس گھر چلے جائیں۔ وہ بار بار ان آسائشوں کا ذکر کر رہے تھے جو ہم پہلے بھی سن چکے تھے۔ ہم بنگلے میں رہیں گے، لاپیز کی سڑکوں پر ڈرائیور والی گاڑی میں گھومیں گے، مسلح محافظ ہماری حفاظت کریں گے، ذاتی خانساماں، ملازمین اور مالی ہماری خاطر مدارت کریں گے اور بولیویا کے حکومتی عہدیداران کا دل بہلانے کے لئے ہمیں بھاری خرچ ملا کرے گا۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ میں بولیویا کے صدر کے بعد دوسرا سب سے طاقتور آدمی ہوں گا اور اگر کبھی تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی تو میں سب سے طاقتور بن جاؤں گا کیونکہ صدارتی محل اور فوجی اڈوں کو بجلی کی ترسیل کی نگرانی میں کروں گا۔ سی آئی اے اپنے پسندیدہ گروہ کی حمایت کے لئے مجھ سے امیدیں باندھے گی۔

بستر میں لیٹے میں اور ونیفریڈ بات چیت کر رہے تھے۔ میری بیوی پانی سے بجلی بنانے کے

منصوبے کی تعریفیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا ''میں نے اس جیسا پہلے کچھ نہیں دیکھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اگر تم اسے لاطینی امریکہ میں توانائی کا انقلاب برپا کرنے کی بنیاد سمجھو، ریڈ انڈین کو بجلی کا بل دینے کے لئے لگی تکلیف دہ لمبی قطاروں کا خاتمہ کر دو، دیہی علاقوں میں بجلی کم قیمت پر فراہم کرو، عالمی بینک سے قرضے لے کر بڑے منصوبے بنانے کے بجائے ایسے منصوبے بناؤ جیسے ہم نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کمپنی کو ماحولیاتی تحفظ کا پابند کرو۔

میں اس کی تمام باتوں کو دھیان سے سنتا رہا۔ میں لا پیز میں گزرے باقی دنوں کے دوران اسی سوچ میں غرق رہا۔ اکثر مواقع پر اس بارے میں بولیویا پاور کمپنی کے عہدیداروں اور انجینئرز سے تبادلہ خیال کیا۔ ان میں کئی ارجنٹائن، چلی اور پیراگوئے جیسے ممالک سے تعلق رکھتے تھے جہاں پر فوجی آمریت کی طویل تاریخ موجود ہے جس نے کارپریٹوکریسی کی خوشی کے لئے کئی خدمات انجام دی تھیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان کے شکوک وشبہات پر حیران نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ان کے خیالات پیرو کے اس انجینئر سے ملتے جلتے تھے جو دس سال سے زائد عرصے تک بولیویا پاور کمپنی میں کام کر چکا تھا اس نے واضح انداز میں کہا ''لیوسیڈیا اس سے بہت سے منافع کی امید رکھتا ہے۔''

جتنا میں اس بارے میں غور کر رہا تھا اتنا میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لاطینی امریکہ امریکہ کے تسلط کی علامت بن گیا تھا۔ گوئٹے مالا اربینز کی حکمرانی میں، برازیل گولارٹ کے دور میں، بولیویا اسٹینسورو کی حکومت میں، چلی الینڈے کے دور میں، ایکواڈور رالڈاس کے دور میں، پانامہ ٹوریجو کے دور میں اور دوسرا ہر وہ ملک جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھا جن پر ہماری کارپریٹوکریسی کی لالچی نظریں تھیں اور جن کے پاس ایسے طاقتور سربراہ بھی تھے جو ان وسائل سے حاصل ہونے والے فائدے کو اپنی عوام کو پہنچانا چاہتے تھے وہ ایک ہی طرح کی قسمت سے دوچار کئے گئے۔ ان تمام ممالک نے اپنے ان سربراہوں کو یا قتل ہوتے دیکھا یا بے دخل ہوتے اور اس کے بعد اپنی کٹھ پتلی حکومتیں بٹھا دی گئیں۔ میں ان کا گندا کھیل معاشی تباہ کار کی حیثیت سے دس سال تک کھیل چکا تھا۔ ان کا ساتھ ترک کئے ہوئے بھی ایک عشرہ گزر چکا تھا مگر میں اب بھی احساس جرم میں مبتلا تھا اور ایک انجانا خوف تھا۔ کارپریٹوکریسی کی خدمت کی اور اپنی ہوس نے مجھے ان اقدار کے بارے میں مضطرب اور غیر یقینی کر دیا تھا جن کی عزت کرنے کا مجھے سبق دیا گیا تھا۔ اپنے بے توقیر اور پامال ہونے کا مجھے بے حد غصہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بولیویا پاور کمپنی جیسے ادارے کو تبدیل کرنے کی

میری کوششوں کو روکے جانے کا اندیشہ بھی مجھے تنگ کر رہا تھا مگر پھر میں نے کوشش کرنے کا عزم کیا تھا۔

جب ہم امریکہ لوٹے تو میں نے لیوسیڈیا کے اس عہدیدار سے بات کی جس نے مجھے یہ پیشکش کی تھی۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں یہ ملازمت اس صورت میں قبول کروں گا اگر وہ لوگ مجھے بولیویا پاور کمپنی کو معاشی اور ماحولیاتی ذمہ داری اٹھانے والا ادارہ بنانے کی اجازت دیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ دریائے زونگو کے پانی سے بجلی بنانے کے منصوبے سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور یہ کمپنی تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اگر وہ اس خطے میں غریب ترین آبادیوں کو بجلی فراہم کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھائے۔

وہ یہ سن کر خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایان کمنگ سے بات کرتا ہوں ساتھ ہی یہ بھی کہا ''بہر حال زیادہ کچھ امید نہ کیجئے، ہمارے عہدیداران حصص کے مالکان کو جوابدہ ہوتے ہیں اور پاور کمپنی کے صدر سے منافع بڑھانے کی امید لگائی جاتی ہے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا ''کیا آپ سوچنا چاہیں گے؟''

اس کے الفاظ نے میرے عزم کو تقویت دی ''جی نہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے مجھ سے پھر کبھی رابطہ نہیں کیا۔

تبدیل شدہ خواہش

میں جتنا زیادہ غیر ملکی اداروں کا بولیویا کے استحصال اور معاشی تباہ کار کی حیثیت سے اپنے کردار کے بارے میں سوچتا تھا اتنا ہی مجھے غم و غصہ محسوس ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار لا پیز، کولمبیا یا کسی اور ہسپانوی بولنے والے ملکوں میں جا کر مزاحمتی تحریک کا حصہ بننے کے بارے میں سوچا تھا۔ مجھے خیال آتا تھا کہ اگر ٹام پینی زندہ ہوتے تو وہ ایسا ہی کرتے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ بندوق اٹھانے کے بجائے وہ قلم اٹھانے کو فوقیت دیتے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں کس طرح زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہوں۔

اس سوال کا جواب مجھے گوئٹے مالا کی غیر منافع بخش ادارے کے ساتھ کئے ایک دورے کے دوران ملا تھا۔ ایک مایان رہنما سے بات چیت کے دوران میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے ایکواڈور کے شواروں کے علاقے میں واپس جانا چاہئے جہاں پر میں تعلیمی مشن کے رضا کار کی حیثیت سے دو دہائیوں پہلے رہ چکا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں تو اس وقت میں بوکھلاہٹ کا شکار تھا اور میں معاشی تباہ کار ساتھیوں سے وفاداریاں، احساس گناہ سے بوجھل ضمیر اور اپنے گناہوں پر سے پردہ اٹھانے کی خواہش اور ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی لعنت مادہ پرستی کے درمیان بری طرح بٹ گیا تھا۔ اندر ہی اندر غیر شعوری طور پر مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ شوار اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔

میرا دوست اور مقامی ثقافتوں پر میری چھپنے والی کتابوں کا ناشر ایہود اسپرلنگ اور میں نے کوئیٹو، ایکواڈور کے لئے امریکن ایئر لائن کی فلائٹ لی اور پھر وہاں سے ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے آنڈیز سے ہوتا ہوا کیونکا پہنچا۔ ہم نے اونچے پہاڑوں میں آباد نو آبادیاتی دور کے اس شہر میں دو راتیں گزاری تھیں جہاں پر میں بارانی جنگلات کے دورے کے بعد رہا تھا اور پھر کرائے کی جیپ اور ڈرائیور لے کر علی الصبح ناقابل اعتبار پہاڑی سڑکوں سے ہوتے ہوئے جنگلاتی قصبے ماکاس پہنچے تھے۔

وہ سفر بہت شاندار تھا۔ آنڈیز کی چوٹی سے اترتے ہوئے ڈھلان والی پہاڑی سڑکوں کے

کئی سلسلے عبور کرتے ہوئے نیچے اترے تھے۔ وہ سڑک جس میں پانی سے گڑھے پڑ گئے تھے اور یہاں سے میں دو عشرے پہلے سفر کے دوران بھی گزرا تھا اس سڑک کے ایک طرف چٹانیں اٹھ رہی تھیں اور دوسری طرف گہری کھائی میں گرتا ہوا آبشار کا پانی تھا۔ جنگلات سے نکلتے ہوئے خستہ حال سڑکوں کی وجہ سے ہمیں نہایت خطرناک انداز میں گاڑی ایک طرف لگانی پڑی تھی جہاں ایک طرف چٹان تھی اور دوسری طرف نیچے گرنے کا خطرہ تھا۔

یہ واقعی الگ ہی دنیا تھی امریکہ کی زندگی سے الگ تھلگ اور بہت دور۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں معاشی تباہ کار کا کام چھوڑ کر یہاں تک کیسے آ گیا تھا۔ اس کا سادہ جواب وہی تھا جہاں ایک نوجوان اور مضطرب شخص نیو ہیمپشائر کے شہری علاقے میں پرورش پا رہا تھا جو اس پیسے سے حاصل ہونے والی دولت اور پر جوش زندگی سے متاثر ہو گیا تھا۔ بالکل اس مچھلی کی طرح جو کانٹے میں لگے چارہ کو دیکھ کر مچل اٹھتی ہے اور میں بھی اسی طرح شکار ہو گیا تھا۔

دوپہر کے قریب ہماری جیپ ایک مقامی آبادی میں داخل ہو گئی جہاں پچھلے سفر کے دوران سڑک ختم ہو گئی تھی مگر اب وہ سڑک آگے بھی تعمیر ہو گئی تھی لیکن پھر بھی جگہ جگہ دھول سے اٹی ہوئی اور اکھڑی ہوئی تھی جو امیزون کی سطح سے اٹھنے والی بارش ماکاس کے قصبے تک آ رہی تھی۔ میں ایہود کو ۱۹۶۹ء میں اپنے اس علاقے ماکاس کے دورے کا احوال بتانے لگا۔ اس قصبے نے ہمیں دنیا کی تاریخ میں امریکہ کے کردار پر روشنی ڈالنے کا موقع دیا۔

امریکہ دو سو سال تک جمہوریت اور انصاف کی زندہ علامت تھا۔ ہمارے آئین اور آزادی کے اعلامیہ نے پوری دنیا کی آزادی کی تحریکوں کو متاثر کیا۔ ہم نے ایسے عالمی اداروں کی بنیاد ڈالنے کی کوششیں کیں جو ہمارے اصولوں کے آئینہ دار تھے۔ بیسوی صدی کے دوران جمہوریت اور انصاف کی تحریکوں میں ہمارا کردار بڑھتا گیا، ہم نے ہیگ میں عالمی انصاف کی عدالت کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح اقوام عالم کی انجمن کا معاہدہ، اقوام متحدہ کا دستور، انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ اور اقوام متحدہ کے دیگر معاہدوں میں اہم کردار ادا کیا لیکن جنگ عظیم دوئم کے بعد عالمی رہنما کی حیثیت آہستہ آہستہ متزلزل ہونے لگی اور ہم نے دنیا کو جو مثال پیش کی تھی اس کو دنیا پر تسلط بڑھانے کی متمنی کارپوریٹوکریسی نے برباد کر کے رکھ دیا۔ تعلیمی مشن کے رضا کار کی حیثیت سے میں واقف تھا کہ ایکواڈور اور دیگر پڑوسی ممالک کے باشندے ہمارے ظلم و سفاکیت اور دوغلی پالیسیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہم ویتنام میں جمہوریت کا دفاع کرنے کا دعویٰ کرتے

تھے اور دوسری طرف جمہوری طریقوں سے منتخب سربراہان کے تختے الٹتے اور انہیں قتل کر دیتے تھے۔ لاطینی امریکہ کے ہائی اسکولوں کے طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ چلی کے الینڈے، ایران کے مصدق، گوئٹے مالا کے اربینز، برازیل کے گولارٹ اور عراق کے قاسم کو ہٹانے میں امریکہ کا کردار تھا چاہے ہمارے طالب علم ان تمام حقیقتوں سے ناواقف ہیں۔ واشنگٹن کی حکمت عملیوں نے دنیا کو گمراہ کن پیغام دیئے تھے۔ ہماری حرکتوں نے ہمارے مقدس اصولوں کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک طریقہ کے جس کے ذریعے کارپریٹوکریسی نے اپنا اثر ورسوخ بڑھایا تھا ۱۹۷۰ء کی دہائی میں لاطینی امریکہ میں آمرانہ حکومتوں کو طاقت دینا تھا۔ ان حکومتوں نے ایسی حکمت عملیاں اختیار کیں جن کے ذریعے امریکی سرمایہ داروں اور بین الاقوامی کارپوریشنز کو فائدہ پہنچا اور جن کے نتیجے میں مقامی آبادیوں کو معاشی بدحالی، شرح افراطِ زر میں اضافہ، بے روزگاری اور معاشی ترقی پر منفی اثرات جیسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ واشنگٹن نے ایسے حکمرانوں کی ہمت افزائی کی جو اپنے ملکوں کو دیوالیہ کر کے اپنی ذاتی قسمتیں سنوارتے رہے۔ صورتحال کو مزید خراب کرنے میں اقوام متحدہ کی قدامت پرست آمروں اور گوئٹے مالا، ایل سیلواڈور اور نکاراگو میں ان کے قاتل دستوں کی حمایت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں پورے براعظم کو جمہوری اصلاحات کے خیال نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نومنتخب شدہ حکومتوں نے اپنے مسائل کے حل کے لئے آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے ماہرین سے رجوع کیا تھا۔ ان حکومتوں کو سیپ (SAP) اختیار کرنے کے لئے رضامند کیا گیا جس کے نتیجے میں بنیادی ضروریات کے اداروں کی نجکاری سے لے کر سماجی بہبود کے شعبے میں تبدیلی لانے جیسے غیر مقبول اقدامات کا انتخاب کرنا پڑا۔ ان حکومتوں نے ایسے انفرااسٹرکچر منصوبوں کی ترقی کے لئے بے تحاشہ بڑے قرضے حاصل کئے جو اکثر امیر طبقے کی شکایتیں دور کرتے تھے جبکہ غریبوں کو قرض کے بوجھ تلے دبا دیتے ہیں۔

نتائج یقیناً تباہ کن تھے۔ معاشی پیمانے زوال کا شکار تھے۔ لاکھوں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور مفلسی کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف لوگ پنشن فراہم کرنے والے اداروں، صحت عامہ کے شعبے اور تعلیمی اداروں کا زوال دیکھ رہے تھے وہیں دوسری طرف ان کے سیاستدان مقامی کاروبار میں سرمایہ لگانے کے بجائے فلوریڈا میں

جائیدادایں خرید رہے تھے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں سراٹھانے والی کمیونسٹ تحریکیں کبھی زور نہ پکڑ سکیں سوائے کاسترو کو کیوبا میں ان کو کامیابی ملی۔ اس کے باوجود براعظم میں کارپریٹوکریسی اور اس کے بدعنوان حواریوں کے خلاف نفرت کی ایک نئی لہر اٹھی تھی۔

ایہود اور میرے ایکواڈور کے دورے سے کم از کم ایک سال پہلے بش انتظامیہ نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے امریکہ اور لاطینی امریکہ کے تعلقات پر دوررس منفی اثرات مرتب کئے تھے۔ صدر نے مسلح افواج کو پانامہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ ایک یکطرفہ کارروائی جو ایک ایسی حکومت کو بے دخل کرنے کے لئے کی گئی تھی جو پانامہ معاہدے سے منحرف ہو گئی تھی۔ اس حملے میں دو ہزار سے زائد شہریوں کو قتل کر دیا گیا اور اس ظالمانہ کارروائی سے ریوگرانڈے کے جنوب میں واقع تمام ممالک میں خوف کی لہر دوڑا دی اور یہ خوف جلد ہی غصے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں ان تمام حقیقتوں پر بحث اور غور وفکر کرتا ہوا ایہود کے ساتھ ماکاس کی طرف رواں دواں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے پاس براعظم میں پھیلی اس بدعنوانی سے نجات پانے کا کوئی اور متبادل طریقہ ہے۔

''یقیناً ہے نہ۔ کریٹیکل ماس واحد چیز ہے جو تم لوگوں کو چاہئے۔'' پھر اس نے پوچھا کہ میں ان دنوں میں ماکاس کا سفر کیسے کیا کرتا تھا کیونکہ یہ سڑک اس وقت یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔

''تم جنگلوں میں ہفتوں تک بھٹک سکتے ہو یا پھر جنگ عظیم دوئم کے سرپلس ڈی سی 3 میں ''اسٹاپ واچ'' پرواز کر سکتے ہو۔ یہ پرواز اچھی خاصی خودکشی ہوتی ہے لیکن میں نے ایسا ہی کیا تھا۔''

''اسٹاپ واچ پرواز؟''

''وہ جہاز آنڈیز کے اوپر تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ انہیں وادیوں سے بہتے دریاؤں کا تعاقب کرنا ہوتا تھا۔ ریڈار بھی نہیں ہوتا تھا۔ پائلٹ کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ بادل کب اس کو اپنے اندر لپیٹ لیں گے تو پرواز شروع کرتے ہی پائلٹ اسٹاپ واچ چلا دیتے تھے۔ تین سیکنڈ بعد وہ سیدھے ہاتھ پر دس زاویے کا موڑ لیتے ہیں پھر پینتالیس سیکنڈ بعد بائیں ہاتھ پر موڑ کاٹتا تھا۔ کافی خوفناک ہوتا تھا۔ اس دور میں بہت سے جہاز لاپتہ ہو گئے تھے۔ جنگل میں بھٹکتے رہنے کی بہ نسبت بہتر اور محفوظ طریقہ تھا۔''

''اب تو انہوں نے سڑک بنا دی ہے۔'' وہ رکا اور پھر حیرت سے بولا ''کیوں؟'' اس کی

چڑھی ہوئی بھنوؤں سے میں اشارہ بھانپ گیا۔

پھر وہ بولا ''کریٹیکل ماس؟''

میں نے جواب دیا ''بالکل۔''

عوام تبدیلی چاہتے تھے۔ جب احتجاج حد سے تجاوز کر جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس معاملے میں یہ تبدیلی امیزون کی گہرائی میں معاشی ترقی برپا کرنے کے لئے رونما ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کریٹیکل ماس تیل کی کمپنیوں کے اثر ورسوخ سے وقوع پذیر ہوا تھا۔ ماکاس میں داخل ہونے پر میں نے دیکھا کہ سڑک نے سوئے ہوئے جنگل کی چوکی کو معروف شور کرتے قصبے میں بدل ڈالا تھا مگر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ جیسے جیسے ہم میں سے زیادہ لوگ مستقبل کے خطروں سے آگاہ ہوں گے، کرائیٹکل ماس کا عملہ امن اور سلامتی کے منصوبوں پر منتقل ہونا شروع ہو جائے گا۔

ہوٹل آنے کے بعد میں نے دو ایسی اشیاء دیکھی تھیں جو میں نے دنیا کے اس خطے میں پہلے نہ دیکھی تھیں۔ ایک فلش والا ٹوائلٹ اور دوسرا غسل کرنے کے لئے شاور۔ ایہود کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ بجلی کے سرکٹ کے ساتھ ہی نلکا لگا ہوا تھا۔

میں نے اسے یقین دلایا ''بجلی کے شیور کے لئے ہے۔''

اس نے کہا ''اپنے آپ کو قتل کرنے کے لئے ہے۔''

اگلی صبح ہم چھوٹے جہاز میں سوار ہوئے۔ ایہود نے پائلٹ سے اسٹاپ واچ کے بارے میں دریافت کیا۔ پائلٹ نے مسکراتے ہوئے کہا ''میرے انکل نے استعمال کی تھی لیکن میرے پاس ریڈار ہے۔''

جہاز نے ہمیں سٹی کے رن وے پر جنگل کے کافی اندر جا کر اتارا تھا۔ شوار کے لوگوں کا ایک گروہ جنگلات کے درمیان میں میدان کے کنارے پر ہی رک گیا تھا۔ میری یادداشت کے مطابق وہ بالکل پہلے جیسے ہی لگ رہے تھے۔ مضبوط، سخت، خوش مزاج لوگ سوائے اس کے کہ انہوں نے پرانی ٹی شرٹس اور نیکرز پہن رکھی تھیں جو انہیں پادریوں کے اصرار پر پہننے پر مجبور کی گئی تھیں تاکہ وہ بے لباس رہنے کے گناہ سے محفوظ رہ سکیں۔

جب وہ لوگ جہاز میں سوار ہمارے ساتھ آیا ہوا سامان اتار رہے تھے تو ایک بوڑھا آدمی میری جانب بڑھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ان کے جنگل کو تباہی سے بچانے میں ان کی مدد کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے بجائے میرا طرز زندگی مسائل کی

اصل وجہ ہے۔

اس نے مجھے بتایا ''دنیا ایسی ہے جیسا تم لوگوں نے اسے بنانے کا سوچا تھا۔ تمہارے لوگوں نے بڑے بڑے کارخانے، بلند عمارتوں اور اتنی گاڑیوں کا خواب دیکھا جتنی بارش کی بوندیں اس دریا میں ہیں مگر اب تم لوگوں کو نظر آ رہا ہے کہ تمہارا حسین خواب تو بھیانک حقیقت بن گیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔

اس نے جواب دیا ''نہایت آسان ہے۔ صرف اپنا خواب بدل لو تمہیں صرف مختلف بیج بونا ہو گا۔ اپنے بچوں کو سکھاؤ کہ وہ نئے خواب دیکھیں۔''

اگلے چند دنوں میں ہمیں آبادی کے دوسرے اراکین سے بھی ایسے ہی پیغامات موصول ہوئے۔ میں اور ایہود ان لوگوں کی ذہانت اور اپنی ثقافت اور ماحول کو محفوظ رکھنے کے نام کے عزم سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ امریکہ لوٹنے کے بعد میں نے ایسا ادارہ بنانے کے انتظامات کا جائزہ لیا جو ہمارے صنعتی ملکوں میں عام آدمی کو دنیا کے دیکھنے اور اس کے تعلق کے بارے ہمارے خیالات میں تبدیلی لانے کے لئے وقف ہو گا۔ میں نے اس وقت نہیں سوچا مگر درحقیقت میں اس عمل کو الٹا چلانا چاہ رہا تھا جس کا آغاز میں نے معاشی تباہ کار کی حیثیت سے کیا تھا۔

بالآخر ہم نے اس غیر منافع بخش کارپوریشن کا نام ڈریم چینج (خواب بدلو) رکھا تھا، یہ نام اس پیغام کے اعتراف میں رکھا گیا تھا جو مجھے شوار کے علاقے میں دیا گیا تھا۔ اس کے ذریعے ہم نے مختلف دوروں اور ورکشاپس کا اہتمام کیا تھا۔ ہم لوگوں کو مقامی، دیسی اساتذہ کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کرتے تھے اور پھر ان اساتذہ کو امریکہ لاتے تھے۔ ہم ایسی کتابیں، سی ڈیز اور فلموں کا انتظام کرتے تھے جو ان دو دنیاؤں کے درمیان فاصلے مٹا سکیں۔ ہمارے ان دوروں کے نتیجے میں ہی ایک اور غیر منافع بخش ادارہ پاچاماما الائنس وجود میں آیا تھا۔ اس ادارے نے لاکھوں ڈالرز کی رقوم مقامی آبادیوں کی فلاح کے لئے اکٹھے کئے تھے جن میں سے زیادہ تر رقم تیل کی کمپنیوں کے خلاف قانونی مقدموں کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے استعمال ہوئی تھیں۔

بولیویا پاور کمپنی کے تجربہ کی وجہ سے میں نے اپنے لئے نیا طرز زندگی ڈھونڈ نکالا تھا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے دوران اور نئے ہزاریے کے ابتدائی سالوں میں مستقل لاطینی امریکہ آتا جاتا رہا تھا۔ میں نے زیادہ تر وقت آنڈیز اور امیزون میں ایسی مقامی آبادیوں کے ساتھ گزارہ کرتا تھا میں ان کے ماحولیاتی تحفظ کے عزم اور روحانیت سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔ ان کی روحانیت مجھے ان تمام

اہم مذاہب میں اس کے اشکال سے زیادہ محسوس ہوا کرتا تھا جن کو میں نے دیکھا تھا۔ یہ لوگ اس دنیا کو بہتر بنانے کے لئے اپنے استقلال پر ڈٹے ہوئے تھے۔

پاچاماما الائنس کے بورڈ کے رکن کی حیثیت سے میری وکیلوں، سیاستدانوں اور تیل کی کمپنی کے ملازمین سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک ایسے ہی گروپ کے ساتھ رات کا کھانا کھاتے ہوئے مجھے پہلی بار وینزویلا کے ہیوگوشاویز کے بارے میں جاننے کا موقع ملا تھا۔ شیل کی کمپنی کے نمائندے اس غصیلے فوجی افسر کے بارے میں حقارت سے بات کررہے تھے جس نے کارپریٹوکریسی مخالف ففتھ ری پبلک موومنٹ کی بنیاد رکھی تھی مگر سیاستدان اس کی ذاتی صلاحیتوں سے متاثر نظر آرہے تھے۔ میرے مقامی دوست اس بات سے خوش تھے کہ شاویز کے باپ دادا انڈین، افریقن اور ہسپانوی تھے اور اس کے علاوہ وہ مسلسل امیروں کو بے توقیر کیا کرتا تھا اور غریبوں کی زندگی بہتر بنانے میں مدد کرنے کا وعدہ کیا کرتا تھا۔

باب نمبر: ۲۰

وینزویلا کا شاویز

شاویز کو شہرت فروری ۱۹۹۲ء میں اس وقت حاصل ہوئی جب اس نے وینزویلا کی فوج میں بحیثیت لیفٹینینٹ اور کرنل کے کارلوس آندریس پیریز کا تختہ الٹا تھا۔ صدر کارلوس کا نام بدعنوانی کے مترادف ہوگیا تھا اور شاویز اور اس کے ماننے والوں کو اس بات پر شدید غصہ تھا کہ وہ ملک کو عالمی بینک، آئی ایم ایف اور غیر ملکی کارپوریشنوں کو بیچنے کے لئے تیار تھے کہ کاراکاس کی کارپریٹوکریسی کے ساتھ ملی بھگت کی وجہ سے وینزویلا کی فی کس صد آمدنی ۴۰ فیصد گرگئی تھی اور ماضی میں لاطینی امریکہ کے سب سے بڑے متوسط طبقہ کی حیثیت سے جاننے والی مفلسی کا شکار ہوگیا تھا۔

شاویز کا حکومت بدلنے کا منصوبہ ناکامی کا شکار ہوگیا تھا مگر اس ناکامی نے اس کے سیاسی کیریئر کا مستقبل طے کردیا تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے قومی ٹیلیویژن پر آکر اپنے دستوں کو لڑائی چھوڑنے کے لئے آمادہ کرنے کی اجازت ملی تھی مگر اس نے للکارتے ہوئے اپنے قوم کے سامنے دعویٰ کیا کہ وہ صرف وقتی طور پر ناکام ہوا ہے۔ اس کی ہمت نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا تھا۔ اس نے یارے کی جیل میں دوسال سزا بھگتی اور اس دوران پیریز کو مواخذہ کا سامنا کرنا پڑا۔ شاویز نے عین شجاعت، وقار، غریبوں کی مدد کرنے کی خواہش اور صدیوں سے غیر ملکی استحصال کے چنگل میں پھنسے ملک اور براعظم کو آزاد کرانے کے عزم کے لئے بے حد نیک نامی کمائی۔

۱۹۹۸ء میں ہیوگوشاویز ۵۶ فیصد ووٹوں کے ساتھ وینزویلا کا صدر منتخب ہوگیا۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد اس نے بدعنوانی کے سامنے اس طرح گھٹنے نہیں ٹیکے جس طرح اس سے پہلے کے حکمران کرچکے تھے بلکہ اس نے گوئٹے مالا کے اربینز، چلی کے الینڈے، پانامہ کے ٹوریجوس اور ایکواڈور کے رالڈاس کو عزت و احترام کا حقدار سمجھا۔ یہ تمام لوگ سی آئی اے کے ہاتھوں برطرف یا قتل کئے گئے تھے مگر اس نے اعلان کیا کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلے گا مگر اپنی سیاسی بصیرت اور سحر انگیز شخصیت کا استعمال کرتے ہوئے ساتھ ہی اسے تیل سے مالا مال ملک کے سربراہ ہونے کی وجہ سے اپنی حیثیت مستحکم اور برقرار رکھنے کا پورا اختیار تھا۔ اس کی فتح اور واشنگٹن اور تیل

کی کمپنیوں کے خلاف اس کی جارحیت نے لاکھوں لاطینی امریکی باشندوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔

شاویز نے دیہی اور شہری علاقوں کے غریبوں کی خدمت کا عزم برقرار رکھا ہوا تھا۔ تیل سے حاصل ہونے والے منافعوں کو اس نے واپس تیل کی صنعت میں لگانے کے بجائے اس نے اس سرمائے کو جہالت، بھوک وافلاس، بیماریوں اور دیگر معاشی لعنتوں سے نجات حاصل کرنے کے منصوبے میں لگا دیا تھا۔ اسی طرح اس نے سرمایہ داروں کے لئے بھاری منافعوں کا اعلان کرنے کے بجائے ارجنٹائن کے مشکل حالات سے نبرد آزما صدر کرچنر کی قوم پر آئی ایم ایف کے دس بلین ڈالر کے قرضے ادا کر کے ان کی قرضوں کی ادائیگی کی قسطوں میں کمی کرا دی اور اس نے تیل کو رعایت شدہ نرخوں پر ان لوگوں کو فروخت کیا جو اسے عام نرخ پر حاصل نہیں کر سکتے تھے، ایسا ہی رویہ اس نے چند امریکی آبادیوں میں بھی روا رکھا۔ اس نے تیل سے حاصل ہونے والے منافع کا کچھ حصہ کیوبا کے لئے مختص کر دیا تا کہ اس کے ذریعے کیوبا براعظم کے غریب علاقوں میں معالجوں کو بھیج سکے۔ اس نے مقامی آبادیوں کے زبان اور زمینی ملکیت کے حقوق تحفظ کے لئے قانون سازی کی۔ ساتھ ہی اس نے سرکاری اسکولوں میں افریقی، وینز ویلا نصاب رائج کرنے کی جنگ شروع کر دی تھی۔

کارپریٹو کریسی نے شاویز کو شدید خطرہ گردانا شروع کر دیا تھا۔ نہ صرف اس نے تیل اور دیگر بین الاقوامی کمپنیوں کو پریشانی سے دوچار کیا بلکہ وہ ایک ایسے لیڈر کی صورت میں ابھرا تھا جس کی تقلید کی جا سکے۔ بش انتظامیہ کے نقطہ نظر سے دو انتہا پسند شاویز اور صدام کا ظہور عمل میں آ گیا تھا جن کا خاتمہ ضروری تھا۔ عراق میں نسبتاً آسان حربے جیسے معاشی تباہ کار اور کرائے کے قاتل ناکام ہو گئے تھے اور اب آخری ہتھیار یعنی جنگی حملہ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ وینز ویلا میں معاشی تباہ کاروں کی جگہ اب کرائے کے قاتلوں نے لے لی تھی اور واشنگٹن کو امید تھی کہ وہ مسئلہ حل کر پائیں گے۔

ایران چلی اور کولمبیا میں کامیابی سے ہمکنار ہونے والے حربوں کی بدولت کرائے کے قاتلوں نے ۱۱ اپریل ۲۰۰۲ء کو ہزاروں شہریوں کو کاراکاس کی سڑکوں پر لے آئے تھے جو وینز ویلا کی سرکاری تیل کی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر اور صدارتی محل میرافلوریس کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس مظاہرے کے دوران انہیں شاویز حامی جلوس کا سامنا کرنا پڑا جو دوسری طرف کے مظاہرین کے منتظمین کو امریکہ اور سی آئی اے کے امیر مہرے ہونے کا الزام لگا رہے تھے اور پھر اچانک

غیر متوقع طور پر مسلح افواج نے اعلان کیا کہ شاویز نے بطور صدر استعفیٰ دے دیا ہے اور اسے فوجی اڈے پر قید میں رکھا گیا ہے۔

واشنگٹن نے جشن منانا شروع کر دیا مگر ان کی خوشیاں زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکیں۔ شاویز کے وفادار فوجی حلقوں نے وسیع پیمانے پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ غریب عوام سڑکوں پر نکل آئے اور ۱۳ اپریل کو شاویز نے صدارت دوبارہ سنبھال لی۔

وینز ویلا کی باضابطہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تختہ الٹنے کی سازش امریکی انتظامیہ کے تعاون سے عمل میں آ سکی تھی۔ وائٹ ہاؤس نے باقاعدہ اس میں شمولیت قبول کی تھی۔ لاس اینجلس ٹائمز نے رپورٹ کیا تھا ''بش انتظامیہ نے باقاعدہ اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انہوں نے وینز ویلا کے صدر ہیوگو شاویز کی برطرفی کے امکانات کے سلسلے میں کئی ماہ سے ملک کے عسکری اور غیر عسکری رہنماؤں سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔''

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ۲۰۰۳ء کا عراقی حملہ شاویز کے لئے باعث برکت تھا۔ اس حملے نے تیل کی قیمتیں آسمان تک پہنچا دی تھیں اور اچانک ملک کے علاقے اور ینو میں خام تیل کی کھدائی ممکن ہو گئی تھی۔ وینز ویلا کا خزانہ بھر گیا۔ شاویز نے اعلان کیا کہ جب تیل کی قیمت فی بیرل پچاس ڈالر تک پہنچ جائے گی اس وقت وینز ویلا اپنے خام تیل کے ذخائر کی وجہ سے وسطی ایشیاء کو پیچھے چھوڑ کر تیل کا دنیا میں سب سے بڑا خزانہ بن جائے گا۔ اس نے کہا کہ اس کا یہ تجزیہ امریکی محکمہ برائے توانائی کے اندازوں کے عین مطابق ہے۔

بقیہ لاطینی امریکہ شاویز کو برطرف کرنے کی کوشش ناکام ہونے کے بعد بش انتظامیہ کے ردعمل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا مگر ان کو صرف کھسیانا اور بزدل امریکی صدر دیکھنے کو ملا۔ وائٹ ہاؤس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب انہیں سخت احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ وینز ویلا امریکہ کو تیل فراہم کرنے والا دوسرا سب سے بڑا اور تیل سے تیار کی جانے والی مصنوعات کا فراہم کرنے والا چوتھا سب سے بڑا ملک تھا۔ اس کے تیل کے کنویں وسطی ایشیاء سے نسبتاً قریب بھی واقع تھے۔ سٹگو نامی تیل کی کمپنی خریدنے کے بعد وینز ویلا نے کئی امریکی مزدوروں، ڈرائیوروں اور دیگر کارپوریشنز جو سٹگو سے تیل خریدتے اور بیچتے تھے اُن پر اثر انداز ہوا تھا۔ ساتھ ہی کاراکاس ۱۹۷۰ء کے دوران اوپیک کی لگائی گئی تیل کی درآمد یا برآمد کی پابندیوں کو توڑنے میں ہمارا حلیف رہا تھا۔ بش انتظامیہ کا وینز ویلا میں فوجی مداخلت کرنے کے امکانات عراق اور افغانستان میں جنگ، اسرائیل

فلسطین کا مسئلہ، سعودی عرب میں شاہی خاندان کی بڑھتی غیر مقبولیت، کویت میں سیاسی مسئلوں اور ایران کی جنگی قوت کی وجہ سے محدود ہو گئے تھے۔

۲۰۰۲ء میں لوئز انا سیو "لولا" ڈاسلوا کی برازیل کے انتخابات میں شاندار کامیابی سے قومی تحریکوں کو مستحکم ہونے میں مدد ملی۔ ۱۹۸۰ء میں پروگریسو ورکرز پارٹی کی بنیاد رکھنے والا لولا ایک ایسا سیاستدان تھا جو سماجی، اصلاحات، برازیل کی قدرتی وسائل کو غریبوں کی مدد کے لئے وقف کر دیے اور آئی ایم ایف کی طرف سے برازیل کو دیے گئے قرضے جو اس کے خیال میں غیر قانونی تھے کا حساب کتاب کرنے پر ہمیشہ سے زور دیتا رہا تھا۔ ۶۰ فیصد ووٹوں سے کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے لولا شاویز کی طرح براعظم کی عظیم شخصیات میں شامل ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ آنڈیز کی چوٹیوں اور بارانی جنگلات کی گہرائیوں میں بسے دور دراز دیہاتوں میں یہ بات پھیلنے لگی کہ جن کو پہلے حق رائے دہی استعمال کرنے کا حق نہیں تھا وہ اب حکمرانی حاصل کر رہے ہیں۔

لاطینی امریکہ کو اس سے بہت حوصلہ ملا۔ حالیہ تاریخ میں پہلی بار انہیں امریکی تسلط کی زنجیروں سے آزاد ہونے کا موقع نظر آ رہا تھا۔

دو ممالک میں شاویز اور لولا کی کامیابیوں کا بہت گہرا اثر دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ان میں بھی کثیر مقامی آبادیاں تھیں اور یہ بھی تیل اور گیس کے موجود وسائل جن پر کارپریٹوکریسی نظر جمائے بیٹھی تھی اور ان دو سے میرے بہت مضبوط اور ذاتی تعلق وابستہ تھے۔ ایکواڈور اور بولیویا۔

باب نمبر:۲۱

ایکواڈور: منتخب صدر سے دھوکہ کھانا

"معاشی تباہ کار کے اعترافات" میں میں نے جیمی رالڈاس اگوٹیلیر اسے اپنے تعلقات کو بیان کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی پروفیسر اور وکیل تھے جو ۱۹۷۹ء میں کارپریٹوکریسی کے حمایت یافتہ کو آمروں کے بعد جمہوری انداز میں منتخب کردہ پہلے صدر تھے۔ عہدہ سنبھالتے ہی اپنے وعدے کے مطابق رالڈاس نے تیل کی کمپنیوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی اور اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو غریب لوگوں کی فلاح کے لئے استعمال کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس وقت مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اگر اس نے معاشی تباہ کاروں کی خواہشات کا احترام نہیں کیا تو اسے کرائے کے قاتلوں کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ میرے خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔ ۲۴ مئی ۱۹۸۱ء کو جیمی رالڈس طیارے کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ لاطینی اخباروں نے اپنے سرورق کو "قتل، قاتل سی آئی اے" جیسی سرخیوں سے سجایا تھا۔

اب ایک دہائی بعد ایسا لگتا تھا کہ ملک میں تمام حالات تبدیل ہو گئے ہیں لیکن سیاست میں کچھ خاص رد و بدل نہیں ہوا۔ ایہود کے ساتھ شوار کا دورہ اور ڈریم چینج اور پاچاماما الائنس جیسی تنظیموں کی تشکیل کے بعد میں ۱۹۹۰ء کے دوران زور پکڑتے بحران سے بخوبی واقف تھے۔ کرائے کے قاتلوں نے رالڈاس کا خاتمہ ضرور کر دیا تھا مگر امریکہ نے اصل مسئلے کے تدارک کے لئے کچھ نہ کیا تھا۔ امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا فاصلہ، ماحولیاتی تباہی اور تعلیم، صحت اور دیگر سماجی شعبوں کی طرف عدم توجہ نے اس بڑھتے غصے کو مزید ہوا دی جب ایکواڈور امریکہ کو تیل برآمد کرنے والا خطے کا دوسرا سب سے بڑا ملک بن گیا تھا (وینز ویلا پہلے نمبر پر تھا) انڈین آبادی شدید متاثر ہو رہی تھیں۔ حکومت اور تیل کی کمپنیوں نے انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی تھی اور اگر وہ اپنی زمینیں چھوڑنے سے انکار کرتے تھے تو ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے درختوں کی جگہ تیل کے کنوؤں پر نصب کئے جانے والی مشینیں لگا دی جاتی تھیں اور ان کے دریاؤں کو گندگی کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

ان لوگوں پر کئی طریقوں سے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک واضح ہو کر میرے

سامنے آیا جب ایک دو پہر میں امیزون کے دورے پر تھا۔ ٹنڈ وام نامی ایک نوجوان شوار نے مجھے بتایا کہ وہ ایسی بستی کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ ''میں کچھ زبانیں جانتا ہوں کم از کم تیل کی کمپنیوں کے ماہرین تو ایسا ہی کہتے ہیں۔ وہ مجھے انگریزی سیکھنے کے لئے اسکول بھیجیں گے اور پھر اس کے ذریعے ان کے لئے کام کرنے کا معاوضہ دیں گے۔ پھر متفکر ہوکر کہنے لگا ''مگر میں فکر مند ہوں۔ سینٹساک نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اب اس کا نام سینٹساک سے بدل کر جوئیل رکھ دیا گیا ہے۔ وہ اس کو اخبارات میں آپ اور آپ کی بنائی ہوئی تنظیمیں ڈریم چینج اور پاچاماما اور ان تمام لوگوں کے خلاف مضامین لکھنے کو کہتے ہیں جو تیل کی کمپنیوں سے لڑ رہے ہیں۔ وہ اسے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو شوار کا منتخب نمائندہ ظاہر کرے اور ہماری زمینیں تیل کی کمپنی کے حوالے کرنے کے دستاویز پر دستخط کرے لیکن جب اس نے ان باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اسے جیل بھیجنے کی دھمکی دی تھی۔

میں نے پوچھا ''تو پھر اس نے کیا کیا؟''

اس نے کہا ''وہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ ویسے مضامین لکھ رہا ہے اور ان دستاویزات پر دستخط کرتا رہتا ہے۔ میں نے ٹنڈ وام سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہونا چاہتا ہے؟

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ''میں انگریزی سیکھنا چاہتا ہوں اور بہت سا پیسہ کمانا چاہتا ہوں۔'' اس نے باہر درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ سب غائب ہو رہا ہے۔ پادری کہتے ہیں کہ ہمیں اب دور حاضر کے تقاضوں سے آگاہ ہونا ہوگا اور اب ہم مزید شکاریوں کی طرح نہیں رہ سکتے۔''

ایسے قصے شوار اور ان کے پڑوسیوں ہواورانی، اچوآر، کچوا، شیویار اور زاپارو کی مدد کرنے کے میرے عزم کو مزید پختہ کر دیتے تھے۔ پس و پیش سے دو چار ان لوگوں کی پریشانیوں نے ۲۰۰۲ء کی صدارتی انتخابات میں میری دلچسپی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ رالڈوس کے بعد پہلی بار کسی امیدوار نے مقامی آبادیوں کے مسائل کی طرف توجہ دینا شروع کی تھی اور ساتھ ہی تیل کے کھیل کی بھی کھلی مخالفت کر رہا تھا۔

میں اس وقت شیل میں تھا جو ایک جنگلاتی قصبہ تھا جس کا نام تیل کی کمپنی پر رکھا گیا تھا۔ میں اور ڈریم چینج کی ایک جماعت ٹھیک اسی دن شوار کے علاقے کا دورہ کرنے کے لئے جہاز کا انتظار کر رہے تھے جس دن صدارتی امیدوار، لوسیو گوٹیریز اس علاقے میں آ رہا تھا۔ اس وقت تک اس

نے ایک نئی طرز کا اتحاد بنا لیا تھا جس میں ایکواڈور کی مسلح افواج اور سب سے مضبوط مقامی تنظیمیں شامل تھیں۔ فوج اس اتحاد میں اس وجہ سے شامل ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک سابق فوجی کرنل تھا اور مقامی تنظیمیں اس لئے اس کا ساتھ دے رہی تھیں کیونکہ اس نے اس وقت اپنے فوجیوں کو مقامی مظاہرین پر حملہ کرنے سے منع کر دیا تھا جب انہوں نے صدر جمیل ماہوآد کو ۲۰۰۰ء میں صدارتی عہدہ چھوڑنے کے لئے محل پر حملہ کر دیا تھا بلکہ کرنل نے فوجی باورچی خانے سے مظاہرین کو کھانا کھلوایا تھا اور پھر انہیں کانگریس کی عمارت پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ صدر کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے پر گوٹیریز نے ایک ایسے آدمی کی برطرفی میں اعانت کی تھی جس میں غریب عوام اس کی آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی حکمت عملیوں کی کھلم کھلا حمایت کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ ان حکمت عملیوں میں سے ایک ایکواڈور کی کرنسی کا ڈالر میں تبدیل کرنا بھی شامل تھا۔ جس نے ایکواڈور کی ساری آبادی پر منفی اثرات مرتب کئے تھے سوائے ان امیروں کے جو اس وقت تک ایسا پیسہ غیر ملکی بینک کھاتوں، وال اسٹریٹ کے حصص اور غیر ملکی جائیدادوں میں لگا چکے تھے۔

شیل صدارتی امیدوار کی لوگوں سے ملاقات کے لئے نہایت موضوع جگہ تھی۔ اس علاقے کو دہائیوں پہلے جنگلات سے صاف کر دیا گیا تھا تاکہ یہاں پر تیل کی کمپنیوں کی کارروائیوں کا مرکز بن سکے۔ مقامی لوگوں نے مزاحمت کی تھی اور بعض مواقعوں پر تشدد کا بھی استعمال کیا تھا مگر کوئیٹو نے پینٹاگون کی حمایت سے ہزاروں فوجی یہاں بھیج دیئے تھے اور اس علاقے میں ایک بہت بڑا فوجی اڈہ تعمیر کیا گیا تھا جو شیل کے وسط سے شروع ہوتا ہوا جنگلات تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے یہاں پر رن وے تعمیر کر دیے تھے جو اس دور میں دنیا کے اس حصے میں نادر و نایاب تھے۔ اس کی دفتری عمارتوں میں دنیا کے سب سے نفیس آلات لگائے گئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ امریکی ایکواڈور کے مواصلاتی ماہرین شیل کی مرکزی سڑک کے قرب میں بنے کسی دفتر میں بیٹھ کر امیزون کے اوپری علاقے میں آباد کسی ضلعی مکان میں ہونے والی بات چیت سن سکتے تھے۔ افواہیں یہ بھی تھیں کہ تبلیغی جماعتوں نے تیل کے پیسے پر چلنے والے اداروں سے اپنی تقسیم کردہ کھانے کی ٹوکریوں اور طبی امداد کی تھیلیوں میں مائیکروفون نصب کرنے کے عوض لاکھوں ڈالرز قبول کئے تھے۔ جس کی مقامی آبادی کے فیصلہ ساز علاقے میں تیل کے اڈے، تباہ کرنے کے لئے جنگجوؤں کو بھیجا کرتے تھے وہاں ان سے پہلے فوجی دستے اور شیل کے ہیلی کاپٹر پہنچ جایا کرتے تھے۔

اس دن جب گوٹیریز کا دورہ طے تھا تو لوگوں کا ہجوم دلدلی سڑکوں پر امیدوار سے مصافحہ کرنے کے لئے جمع ہو گیا تھا۔ شوار کے شامین روایتی ٹوکین کے پروں سے بنے تاج پہنے امریکی ہری ٹوپیوں، تیل کھودنے والے مزدوروں ایکواڈور کے کمانڈوز میں گم ہو گئے تھے۔ ماحول میں جشن کا سا سماں تھا۔ پرانی نفرتیں بھلا دی گئی تھیں۔ گھوڑے پر سوار فوجیوں اور ریڈ انڈین نے بظاہر یہ طے کر لیا تھا کہ اس قوم کی نجات کے لئے ساتھ مل کر کام کریں گے جو سالوں کی بدعنوانی، بڑے افراط زر اور استحصال سے پریشان ہو گئے تھے۔

میں شیل ۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء کے کچھ ماہ بعد گیا تھا۔ اس افسوسناک واقعہ نے بش انتظامیہ کی شاویز سے نجات حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد ایکواڈور کے صدارتی مہم پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ ایک اخبار میں چھپے کارٹون سے مقامی رویوں کی نشاندہی ہوئی تھی۔ وہ کارٹون ویسٹرن فلموں کے کردار پر مبنی تھا جس میں دو لوگ بندوقیں تھامے ایک دوسرے پر فائر کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ پہلے خاکے میں کاؤبوائے ٹوپی پہنے شاویز پتلون کے ساتھ بندوق لٹکائے ڈاج سٹی اسٹریٹ پر ٹہل رہا تھا۔ دوسرے خاکے میں بندوق تھامے جارج بش شاویز کا سامنا کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگلے خاکے میں دکھایا گیا تھا کہ شاویز بش کے سامنے ڈٹا کھڑا ہے اور چہرے پر استقلال اور خونریز جذبات نمایاں ہیں۔ امریکی صدر کے پیچھے دو بلند عمارتوں کو جلتا ہوا دکھایا گیا تھا اور آخری خاکے میں دکھایا گیا کہ شاویز ہنستے ہنستے دہرا ہوا جا رہا ہے اور بش میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ اس کے پیر مٹی اڑاتے جا رہے ہیں اس کی ٹوپی سڑک میں دور گری پڑی ہے اور گوٹیریز شراب خانے کی دیوار سے کندھا لگائے تالیاں بجا رہا ہے۔

اگر ہمارا جہاز آ گیا تھا اور ہمیں شیل گوٹیریز کے پہنچنے سے پہلے پہنچنا تھا اس مختصر دورے نے مجھے یہ سمجھنے میں بہت مدد ملی تھی کہ یہ انتخابات ایکواڈور کے مقامی لوگوں کے لئے کیوں اتنی اہمیت رکھتے تھے۔ بولیویا، برازیل اور وینزویلا میں ان کے بھائیوں کی طرح انہوں نے بھی غیر ملکی استحصال کی وجہ سے بہت پریشانیاں دیکھی تھیں اور اب وہ اس سلسلے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

گوٹیریز نومبر ۲۰۰۲ء میں ایکواڈور کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ مقامی آبادیوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ان کا حمایت یافتہ امیدوار جیت گیا تھا۔ انہیں شاید مزید مشکلات کی امید تھی۔ بی بی سی کے مطابق:

''سابق باغی رہنما لوسیو گوٹیریز کی فتح برازیل کی ورکرز پارٹی کے لیڈر لولا کے فوراً بعد آئی ہے اور اس کامیابی نے وینزویلا میں ہیوگو شاویز کے انتخابات کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ان میں سے ہر ایک شخص جمہوری انتخابات میں ایسے منشوروں پر کامیاب ہوئے ہیں جو تبدیلی کی بات کرتے ہیں اور نئی معاشی سوچ کا پتہ دیتے ہیں اور بدعنوانی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ انتخابات کے پہلے مرحلے میں پچھلے ماہ گوٹیریز نے ہر ایک کو اپنی پیش قدمی سے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور اس کے لئے اپنی تبدیلی کے لئے ووٹ دینے والوں کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ مگر ایک ایسے ملک میں جو قرضوں کے شدید مسائل سے دوچار ہے جہاں غربت کی سطح ۶۰ فیصد تک ہے اور ایک غیر یقینی اور غیر مستحکم سیاسی نظام ہے وہاں پر مشکلات اس کے سامنے پہاڑ کی مانند کھڑی ہیں۔''

نئے صدر نے عہدہ سنبھالتے ہی صدر بش سے ملنے کے لئے واشنگٹن کا دورہ کیا۔ اس نے عالمی بینک کے عہدیداران کو کوئیٹو میں تیل کی کمپنیوں سے مذاکرات کی دعوت دی۔ عین اس دوران تیل کی کمپنیوں اور مقامی آبادی کی تنظیموں کے درمیان تعلقات شدید کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ دسمبر ۲۰۰۲ء میں ارجنٹائن کی کمپنی سی جی سی نے الزام لگایا کہ امیزون کی ایک آبادی نے اس کی جماعت کے کچھ اراکین کو یرغمال بنا لیا ہے اور یہ ظاہر کیا کہ جنگی جنگجو القاعدہ کے ساتھ تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حیران کن حقیقت منظر عام پر آئی کہ تیل کی کمپنی کو تیل کی کھدائی شروع کرنے کی اجازت باشندوں کی طرف سے حکومتی ذرائع سے نہیں پہنچی تھی اور اس کے باوجود وہ مقامی آبادی کی زمینوں میں داخل ہونے کے حق کا دعویٰ کر رہے تھے جبکہ جنگجو کا یہ موقف تھا کہ انہوں نے تیل کی کمپنی کے اراکین کی جماعت کو اس لئے پکڑ رکھا ہے تاکہ وہ انہیں جنگل سے خیریت سے باہر نکال سکیں۔

میں ۲۰۰۳ء میں دوبارہ ایکواڈور گیا تھا۔ جب میں کوئیٹو پہنچا تھا تو مجھے پتہ چلا کہ ایکواڈور کی اکثریتی آبادی اس بات پر متفق تھی کہ گوٹیریز تیل کی کمپنیوں کے ساتھ خفیہ معاہدے کر رہا ہے اور وہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے سیپ نافذ کرنے پر بھی آمادہ ہو گیا ہے۔ صدر بش سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کی تصاویر پورے شہر میں چسپاں تھیں۔ مقامی آبادی کے رہنما اس طرح کی

قیاس آرائیوں پر بپھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے اسلامی دہشت گرد تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی ہے اور انہوں نے کہا کہ اگر گوٹیریز نے انہیں تیل کی کمپنی کے کرائے کے قاتلوں سے لڑنے پر مجبور کیا تو یہ افواہ حقیقت میں بدل سکتی ہے۔

ان میں ایک نے مجھے کہا ''ماضی میں جن لوگوں کو امریکہ سے خطرہ محسوس ہوتا تھا تو تربیت اور اسلحہ کے لئے روس کی طرف دیکھتے تھے مگر اب سوائے عربوں کے اور کوئی نہیں ہے۔''

صورتحال ۲۰۰۴ء تک مزید ابتری کا شکار ہوگئی تھی۔تیل کی کمپنی کے منافع بنانے اور حکومت کی بدعنوانی میں ملوث ہونے کی افواہیں ہر طرف پھیل گئی تھیں اور پھر حکومت نے وہ اقدامات متعارف کرائے جو بالکل ان اقدامات سے ملتے جلتے تھے جو بولیویا نے عالمی بینک کے دباؤ پر اختیار کئے تھے۔ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق گوٹیریز کے عالمی قرض خواہوں کو مطمئن کرنے کے لئے نافذ کئے گئے سخت اقدامات جیسے کہ خوراک اور کھانے کے تیل کے لئے دی جانے والی سبسڈی میں کمی کے باعث اس کے بائیں بازو کا حلقہ انتخاب ختم ہوگیا تھا۔''

جب ایکواڈور کی سپریم کورٹ نے اس کی حکمت عملیوں میں مداخلت کرنے کا عندیہ دیا تو اس نے اس کی نئے سرے سے تنظیم شروع کی جو کہ درحقیقت اس کو تحلیل کرنے کے مترادف تھا ایکواڈور کے عوام جو صدر کی برطرفی کا مطالبہ کرنے کے لئے سڑکوں پر آگئے۔مقامی رہنما جواکوئن یامبرلا نے بتایا کہ ''گوٹیریز کو حکومت چھوڑنی پڑے گی۔وہ جمہوری طور پر منتخب ہوا تھا۔اس نے عوام سے کئے وعدوں کی خلاف ورزی کی ہے اور جمہوریت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اسے عہدہ چھوڑنے پر مجبور کردیں۔''

لوگوں نے مجھے کہا کہ میں اس معاشی تباہ کار کی شناخت کروں جو گوٹیریز کو بے ایمان بنا رہا تھا۔انہیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایکواڈور کا صدر دھمکیوں اور رشوتوں کی وجہ سے پسپا ہو رہا تھا۔اگرچہ میں کسی کا نام نہیں بتا سکتا مگر مجھے شبہ تھا کہ ان کے اندازے صحیح تھے۔اس کتاب میں آگے ذکر کیا گیا ہے کہ مجھ سے ایک ایسے کرائے کے قاتل نے رابطہ کیا تھا جس نے معاشی تباہ کار ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

بولیویا کے عوام بہرحال کچھ اور طرح کے حالات سے نبرد آزما ہو رہے تھے۔

باب نمبر:۲۲

بولیویا میں بیک ٹیل اور پانی کے لئے جنگیں

بولیویا نے بھی ایکواڈور اور وینزویلا کی طرح اکیسویں صدی کا آغاز غیر ملکی کارپوریشنز کے خلاف مظاہروں سے کیا تھا جو ان کے وسائل کو مال غنیمت سمجھ کر لوٹ رہی تھیں۔مظاہروں، ہڑتالوں اور عدم تعاون کی تحریکوں نے لاپیز اور کئی دوسرے شہروں کی تجارتی سرگرمیوں کو ماند کردیا تھا۔اگرچہ ان تحریکوں کی باگ ڈور ایمارا اور کیوچوا سربراہوں کے ہاتھ میں تھی مگر اس میں مقامی آبادیاں اکیلی نہ تھیں بلکہ اس سلسلے میں انہیں مزدور یونینوں اور شہری اداروں کی حمایت حاصل تھی۔

ایکواڈور اور وینزویلا کے برعکس اس بے چینی کی اصل وجہ تیل نہیں بلکہ پانی تھا۔۱۹۹۰ء کی دہائی میں اس حقیقت کا اظہار ہوگیا تھا کہ پانی جلد ہی سیارے کے چند اہم ترین وسائل میں سے ایک ہوگا۔کارپریٹوکریسی کو یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ پانی کے وسائل پر قابو کرکے وہ معیشتوں اور حکومتوں پر اثر انداز ہوگئے ہیں۔

بولیویا کی افراتفری کو ہمیشہ کی طرح عالمی بینک اور آئی ایم ایف نے مزید سنگین بنا دیا تھا۔ ۱۹۹۹ء میں دونوں اداروں نے اس بات کا اقرار کرنا شروع کردیا کہ بولیویا کی حکومت اپنے تیسرے سب سے بڑے شہر کوچابمبا کے پانی کے سرکاری نظام کو انجینئرنگ کی دنیا کا مشہور نام بیک ٹیل کے ذیلی ادارے کو فروخت کردے اور یہ فروخت سیپ کے نئے سلسلوں کی ایک کڑی تھی۔عالمی بینک کے اصرار پر بولیویا پانی فراہم کرنے کی لاگت بھی صارفین پر سے وصول کرنے کے لئے تیار ہوگیا تھا چاہے اور اس کا تعلق ان کی مالی استطاعت سے ہرگز نہ تھا۔یہ بات مقامی آبادیوں کی روایتوں کے برعکس تھا جو یہ کہتی تھی کہ پانی استعمال کرنا سب کا حق ہے چاہے اس کی معاشی حیثیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔

جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بولیویا معاشی تباہ کاروں کے بچھائے اس جال میں پھنس گیا ہے تو میں شدید احساس جرم کی اذیت سے دوچار ہوگیا تھا۔''ہر فرد ادا کرنے کی حکمت عملی بنیادی نظام کو بہتر بنانے کے لئے میں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تیار کرنے میں مدد کی تھی۔اس وقت اس کا اطلاق اصل میں بجلی کے محصولات پر ہوتا تھا اور یہ نہایت منفرد خیال تصور کیا جاتا تھا اور اس وقت

بجلی کی یہ حکمت عملی اکثر معیاری منصوبوں پر جو ۱۹۳۰ء سے افلاس زدہ علاقوں کی امداد کے لئے ترتیب دیے جاتے وہ منصوبوں کے بنیادی دائرہ کار کی خلاف ورزی کرتا تھا۔ بشمول ان منصوبوں کے جو امریکہ میں شہری بجلی کی انتظامیہ کے تحت اختیار کئے گئے تھے۔ اس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ بنیادی شعبے جیسے بجلی، پانی اور نکاسی کے شعبے جن کا براہِ راست تعلق معاشی ترقی سے ہے ان کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے چاہے اس کے لئے سبسڈی لگانی پڑے۔ آر ای اے کی مثالوں کو سمجھتے ہوئے اس سلسلے کا نفاذ کئی اور ممالک میں کیا گیا تھا اور نہایت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ ان کامیابیوں کے باوجود عالمی بینک نے یکسر مختلف تجربہ کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے دوران جب مجھے بینک کی حکمت عملیوں کی ترویج کرنے کے لئے معاشیات کے شعبے کا سربراہ مقرر کیا گیا تو مجھ پر یہ دباؤ ڈالا گیا کہ میں ایسے معاشی معیار کے نمونے (اکونومیٹرک ماڈلز) تیار کروں جو ای پی پی کو حق بجانب قرار دیں۔ اکونومیٹرکس نے تمام معیارات کی تصدیق کر دی تھی اور ساتھ مجھے اعلیٰ درجے کے ماہر معاشیات، ماہر ریاضی دان اور مالی امور کے ماہرین پر مشتمل عملہ دیا گیا تھا فنی لحاظ سے کوئی مسئلہ اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن دو ایسے امور تھے جو تنگ کر رہے تھے۔ پہلا امور تو اخلاقی مسئلہ تھا، دوسرا مسئلہ بے اصولی کا تھا جب اس حقیقت کو بار بار تسلیم کیا جا چکا ہے کہ پرانا نظریہ زیادہ موثر ہے تو پھر اس کامیاب نظریے کو کیوں جھٹلایا جا رہا ہے۔ کیوں غربت بڑھانے کا خطرہ مول لیا جا رہا ہے اور معاشی افراتفری کو دعوت دی جا رہی ہے اور کیوں ای پی پی کی حمایت کی جا رہی ہے؟

جواب واضح تھا ''ای پی پی کی حکمت عملی سرکاری امداد سے پلنے والی حکومتی اداروں کو منافع بخش نجکاری کے عمل کے لئے تیار کر دے گی (جس کا اندازہ مجھے بعد میں بولیویا پاور کمپنی کے معاملے میں ہوا) ای پی پی اس ذہنیت کا شاخسانہ تھی جس کے مطابق انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کے لئے قرضے فراہم کیے جاتے ہیں جو درحقیقت تعمیراتی کمپنیوں اور امیر طبقے کو فائدہ پہنچاتے تھے اور غریب کے پاس سوائے بڑے قرضوں کے کچھ نہیں چھوڑتے۔ ارجنٹائن کے دورے کے دوران مجھے اس حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ایک اور وجہ واضح ہوگئی۔

۱۹۷۷ء میں جب میں جنرل چارلس نوبل کے ساتھ بیونس آئرس کی شاہراہوں سے گزر رہا تھا تو اس نے مجھے بتایا ''یہ ممالک ہمارے مستقبل کے ضامن ہیں۔'' ان کو چک کہا جاتا تھا جو مین (Main) میں اس وقت نائب صدر تھے اور بعد میں ان کی تقرری صدارت کے عہدے پر ہوگئی

تھی۔ ویسٹ پوائنٹ کے گریجویٹ تھے اور ایم آئی ٹی سے انجینئرنگ میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے نہایت شاندار فوجی زندگی گزاری تھی جو ویتنام میں امریکی آرمی انجینئر کمانڈ کے کمانڈنگ جنرل اور مس سس پی ریور کمیشن کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے اور اس وقت وہ ارجنٹائن کے لئے مین (Main) کی پانی کے وسائل کی اس تحقیق کے سربراہ تھے جس کا براہِ راست تعلق سالٹو گرانڈے کے بہت بڑے پیمانے کے پانی سے بجلی بنانے کے منصوبہ پر تھا جو ارجنٹائن یوراگوائے کے تعاون سے تعمیر کر رہا تھا جو قریباً دو ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا، ایک بہت وسیع جھیل تعمیر کی جائے گی اور بائیس ہزار باشندوں کے قصبے کو سیلاب کے حوالے کر دے گا۔

چک نے مجھے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا جو ایک ایسے شخص کے چہرے پر جو نہایت سخت گیر مشہور ہو کافی حیران کن تھا۔ اس نے کہا ''ہم ویتنام میں اس لئے ہارے تھے کیونکہ ہم کمیونسٹ سوچ کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ ہمیں اس سے کہیں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ لاطینی امریکہ میں کرنا ہوگا۔'' کبھی سوشلسٹوں کی اس بات پر یقین مت کرنا کہ مفت کچھ دینے کے سوائے بے عزتی کے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف آپ کی عزت اس وقت کرتے ہیں جب آپ اس چیز کی قیمت ادا کریں جو ان سے خریدیں۔ اس کے علاوہ اس سے انہیں سرمایہ داری سمجھنے میں مدد ملتی ہے کمیونزم ہرگز نہیں۔ یہ دیکھو اس نے اس پارک میں بنے تالاب کی طرف اشارہ کیا جہاں سے اس وقت ہم گزر رہے تھے ''پانی بھی تیل کی طرح مستقبل کا سونا ہے۔ ہمیں اسے اس قدر خریدنا ہوگا جتنا ممکن ہو سکے۔ اس سے ہمیں زیر کرنے کی قوت اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔''

دو دہائیوں سے زائد عرصے کے بعد مجھے اس وقت چک نوبل کا خیال آیا تھا جب یہ اعلان ہوا تھا کہ کوچابمبا کے پانی کے نظام کو خریدنے کے خصوصی حقوق صرف ایک کمپنی سیپاما (Sepama) کو عطا کیے گئے تھے۔ بدنامِ زمانہ بیک ٹیک کارپوریشن کے ذیلی ادارے کی شراکت دارا گواس ڈیل ٹوناری کمپنی کو نجکاری پر چالیس سال کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ استحصال کرنے کی کھلی چھوٹ ملنے پر یہ جنرل بہت خوش ہوا ہوگا مگر لاطینی امریکہ کے عوام یکسر مختلف ہو چکے تھے۔ سان فرانسسکو کی یہ فرم جو ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے مشہور تھی جو اونچے عہدوں پر بیٹھے تمام لوگوں سے کام نکلوا لیا کرتی تھی اس کی عالمی بینک اور امریکی حکومتوں سے فائدے مند ٹھیکے حاصل کرنے کی طویل تاریخ موجود تھی کیونکہ یہ ایک نجی کارپوریشن تھی جس پر ایک خاندان کی مکمل دسترس

تھی۔اس لئے وہ سیکورٹی اور ایکسچینج کلیشن یا اس طرح کسی بھی اور ادارے کو جوابدہ نہیں تھی اور اگر اس طرح کا کوئی مطالبہ کیا جاتا تو اسے سختی سے رد کر دیا جاتا تھا۔

''اگر بیک ٹیل کو کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا ہوتا ہے تو وہ بولی میں شرکت کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتی۔'' یہ حقیقت مجھے انڈونیشیا، مصر، کولمبیا کے سرکاری عہدیداروں نے اس وقت بتائی تھی جب میں معاشی تباہ کار کی حیثیت سے ان ممالک میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرے چک نوبل کے ساتھ ارجنٹائن کے دورے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہوگا تو ایکواڈور کے ٹھیکے جاری کرنے والا ایک افسر جو تعلیمی مشن کے دوران میرے ساتھ تھا اور میرا قریبی دوست جس کو میں رات کے کھانے کے لئے کوئیٹو کے ایک مہنگے ہوٹل لے کر گیا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے مجھے رازدارانہ انداز میں آگاہ کیا کہ وہ میرے اس کھانے پر خرچ ہونے والی رقم سے ہزاروں گنا زیادہ رقم یہ مشورہ دے کر بچا سکتا ہے کہ اگلے چند ماہ میں کسی ایسے منصوبے کی سفارشات تیار مت کرنا جسے بیک ٹیل حاصل کرنا چاہتی ہو۔ اس نے اپنی انگلیاں رگڑتے ہوئے کہا ''سب کے سب امیر ہو جائیں گے۔ میں، میئر، صدر، سان فرانسسکو والے سوائے تمہارے اور وہ تمام بے وقوف جو یہ سمجھتے ہیں کہ بولیوں کا یہ نظام کچھ حیثیت رکھتا ہے۔''

بیک ٹیل کے سابق افسران اور عہدیداروں میں کئی نامور شخصیات شامل ہیں جیسے کہ جارج شولٹز (بیک ٹیل کے صدر اور بورڈ کا رکن، نکسن کے دور میں سیکرٹری خزانہ اور ریگن کے دور میں سیکرٹری آف اسٹیٹ)، کیسپر وائن برگر (بیک ٹیل کے نائب صدر اور مشیر اور ریگن کے دور میں سیکرٹی آف دفاع)، ڈینیل چاؤ (خصوصی نائب صدر، بیک ٹیل انٹر پرائزز ہولڈنگز کے مینجنگ ڈائریکٹر اور ایکسپورٹ، امپورٹ بینک آف امریکہ کے مشاورتی کمیٹی کے رکن رہ چکے تھے) اور ریلے بیک ٹیل (بیک ٹیل کے چیف ایگزیکٹو آفیسر اور جارج ڈبلیو بش کی صدارت میں ایکسپورٹ کونسل کے رکن تھے) بیک ٹیل کی انتظامیہ میں میرے سسر بھی شامل تھے جو ریٹائر ہونے سے پہلے کمپنی کے چیف آرکیٹیکٹ تھے اور بعد میں انہیں بیک ٹیل کے سعودی عرب میں شہر بنانے کے بڑے منصوبے کا پروجیکٹ منیجر بنایا گیا تھا۔ میری بیوی نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز بیک ٹیل ہی سے کیا تھا۔ میں کمپنی کو بہت سے زاویوں سے بخوبی جانتا تھا۔

سیما پا کا ٹھیکہ بیک ٹیل کو ملنے کے فوراً بعد پانی کے نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کوچا بمبا کے کچھ افراد کے مطابق ان کے پانی کے اخراجات ۳۰۰ فیصد بڑھ گئے تھے۔ یہ اس شہر

کے ان باشندوں کے لئے تباہ کن تھا جن کا شمار خطے کے افلاس زدہ طبقے میں ہوتا تھا۔

کیوچوا منتظم نے مجھے بتایا ''انہیں پانی یا خوراک میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑ رہا ہے، گوروں کو زیادہ منافع چاہئے، بولیویا کے عوام پیاس سے مر رہے ہیں۔ انہیں کہا گیا ہے کہ وہ بارش کا پانی بھی جمع نہیں کر سکتے کیونکہ سیما پا سے کئے گئے معاہدے کے مطابق انہیں بیک ٹیل کو ہر طرح کے پانی اور تمام پانی کی ادائیگی کرنا ہوگی۔''

کوچا بمبا کے عوام نے بغاوت کر دی۔ ہڑتالوں نے شہر کو جنوری ۲۰۰۰ء میں لگاتار چار دن کے لئے بند کر دیا تھا۔ عوام کے ہجوم سیما پا کے دفتروں میں گھسنے کے لئے تیار تھے۔ بیک ٹیل نے تحفظ کا مطالبہ کیا تھا۔ بولیویا کے صدر ہیوگو بینزر نے مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے فوج کو بلا لیا جس کے نتیجے میں ہونے والے تشدد میں سینکڑوں کیوچوا اور ایمارا زخمی ہو گئے اور سترہ سالہ لڑکا اپنی جان کھو بیٹھا۔

بغاوت کے خوف سے صدر بینزر نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور پھر امریکن سفارتی عملے سے ملاقات کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ بیک ٹیل کے معاہدے کو منسوخ کرتا ہے اور اپریل ۲۰۰۰ء میں بیک ٹیل نے سیما پا میں اپنے منصوبے ترک کر دیے تھے۔

کوچا بمبا کے عوام نے فتح کا جشن منایا تھا۔ انہوں نے پانی کے پیالے لے کر پیے۔ انہوں نے اپنے کیوچوا اور ایمارا سورماؤں کو خراج تحسین پیش کیا اور اس فتح کے لئے گانے لکھے گئے اور اسے ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا۔ مگر جلد ہی یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ان کو ایک نیا مسئلہ درپیش ہے۔ انہیں احساس ہوا کہ ان کے ملک میں ایسا کوئی نہیں ہے جسے سیما پا چلانے کا تجربہ ہو۔ سابق منتظمین میں سے کئی ایک ریٹائر ہو گئے تھے، ہجرت کر گئے تھے یا انہوں نے دوسری ملازمتیں اختیار کر لی تھیں۔

انہوں نے نیا بورڈ آف ڈائریکٹرز منتخب کیا تھا اور ایسے انتظامی اصول وضع کئے جن کے مطابق معاشی مساوات کو سیما پا کا اصل مقصد قرار دیا گیا۔ پانی کی کمپنی کا اہم مقصد غریبوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو پانی فراہم کرنا تھا جو پہلے اس نظام سے منسلک نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ان سے دیگر مقاصد میں کمپنی کے مزدوروں کو معقول معاوضہ ادا کرنا، تن دہی سے کام کرنا اور بدعنوانی سے دور رہنا شامل تھا۔

اس دوران بولیویا کی حکومت کو کارپوریٹوکریسی سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ بیک ٹیل ہرگز بھی سونے

کی کان کو ایسے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ایک ایسی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا تھا جو دیگر ممالک کی ہمت افزائی کرے اور وہ بھی بولیویا کی تقلید کرتے ہوئے بغیر لڑے اپنے مطالبات منوانا شروع کر دیں۔ اس وقت نہایت اہم واقعہ رونما ہوا جو یہ عندیہ دیتا ہے کہ کارپریٹوکریسی اپنے مقاصد کے لئے بین الاقوامی قانون پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور خواہش رکھتی ہے اور وہ واقعہ تھا کہ بیک ٹیل نے اپنی دلندیزی ہولڈنگ میں سے ایک کا اندراج کرا دیا تھا۔

۱۹۹۲ء کے ہالینڈ اور بولیویا کے درمیان طے پانے والا دوطرفہ سرمایہ کاری کا معاہدہ کو استعمال کرتے ہوئے ہالینڈ کی ذیلی کمپنی نے بولیویا کے عوام کے خلاف ۵۰ ملین ڈالر کا ہرجانہ دائر کر دیا جس میں سے نصف ان کے سرمائے پر قبضہ کرنے کے لئے تھا اور باقی نصف ان کے نقصان کے لئے تھا۔ سرمایہ دارانہ لالچ، سازش اور بے حسی کی اس حیرت انگیز کہانی کو امریکی میڈیا نے یکسر نظر انداز کیا تھا مگر لاطینی امریکہ اس سارے معاملے کو میڈیا کے ذریعے بڑے پیمانے پر منظر عام پر لایا تھا۔ جب میں ان کی ویب سائٹس پر شائع ہونے والے مضامین دیکھ رہا تھا تو مجھے بولیویا پاور کمپنی کے عہدیداران کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ بولیویا کی انتہائی اہم توانائی کمپنی جو صدارتی محل اور فوجی ہیڈ کوارٹرز کو بجلی فراہم کرتی تھی جس کے اہم عہدوں پر فائز زیادہ تر افسران اور انجینئرز امریکہ، برطانیہ، ارجنٹائن، چلی، پیرو اور پیراگوائے جیسے ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ غیر ملکیوں پر اس قدر انحصار ایک سوچی سمجھی حکمت عملی تھی جو یہ ثابت کرتی تھی کہ کمپنی کبھی بھی قومیائی نہ جا سکے۔

مجھے پتہ چلا کہ بولیو پاور کمپنی اب لیوسیڈیا کی ملکیت نہیں رہی تھی۔ بجلی کی یہ کمپنی ۱۹۹۰ء کے اوائل سے کئی بار غیر ملکیوں سے خریدی اور بیچی جا چکی تھی۔ لیوسیڈیا اور دیگر کمپنیاں منافع کے لئے نجی ملکیتی اداروں کو بیچنے کے لئے جانی جاتی تھیں۔ مستقل آمدنی اچھی چیز ہے مگر ایک تیز رفتار اور زیادہ فائدہ پہنچانے والی فروخت بہت بہتر ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب اس سے مقامی آبادیوں کو متاثر کیا جا سکے۔

اس بحران سے ایک نیا رہنما ابھر کر سامنے آیا۔ یہاں پر بھی مقامی آبادی سے ایوو مورالیس ظہور پذیر ہوا۔ مقامی آبادیوں سے رہنما ابھرنے کا سلسلہ ایک رجحان کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ ایمارا قبیلے کا سرگرم رکن تھا جس نے ایم اے ایس میں شمولیت اختیار کر لی تھی جو ایک سوشلسٹ جماعت تھی۔ وہ نجکاری کے خلاف تھا جس کو کارپریٹوکریسی کے حواری ''آزاد منڈی'' کی معاشی

اصلاحات کی حکمت عملیاں کہا کرتے تھے جن کے ذریعے بولیویا کو اپنے کسانوں اور کاروباروں کے تحفظ سے روکا جاتا تھا اور دوسری طرف امریکہ کی عائد کردہ تجارتی پابندیوں کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ اس نے واشنگٹن کا مجوزہ امریکہ کے لئے آزاد تجارت کے منصوبے کو مسترد کر دیا تھا جو دراصل امریکی کالونیوں کے قیام کو قانونی قرار دینے کا منصوبہ تھا۔ اس کی مقبولیت ان اقدام سے بڑھنے لگی اور وہ کانگریس کے لئے منتخب ہو گیا۔

کارپریٹوکریسی نے فوراً اس پر دہشت گرد ہونے کا الزام لگا دیا تھا۔ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اسے ''غیر قانونی نشہ کا عادی بلوائی'' کے خطاب سے نوازا۔ اگرچہ مورالیس کوکا (ایک نشہ) کی ایک تحریک سے ماضی میں وابستہ تھا جو کوکا اگانے والے کیمپیسینوز کا ایک اتحاد تھا جو کوکا کے کھیتوں کو ختم کرنے کی امریکی کوششوں کے خلاف تھا۔ مورالیس نے واضح کیا کہ کوکا کا پودا آنڈین لوگ ایک طبی سپلیمنٹ کے لئے اور دیگر طبی استعمال کے لئے اس وقت سے استعمال کر رہے تھے جب اسے کوکین بنانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس پودے کو بلندی پر رہنے سے ہونے والی بیماری، پٹھوں کے درد، بھوک سے اٹھنے والی ٹیسوں اور ہاضمے کی دیگر تکالیف کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کوکا کے پودے سے بننے والی چائے کو کئی معروف ہستیاں جیسے کہ پوپ جان پال دوئم اور برطانیہ کی شہزادی این پیا کرتی تھی۔ ان تمام وضاحتوں کے باوجود مورالیس کو ۲۰۰۲ء میں دہشت گردی کے الزامات کے تحت کانگریس کی نشست سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کیو چوا اور ایمارا نے اس اخراج کا ذمہ دار سی آئی اے کو ٹھہرایا کچھ ہی ماہ کے عرصے میں اس کے اخراج کو غیر آئینی قرار دے دیا گیا۔

امریکی سفیر مینوئل روچا نے دھمکی دی ''میں بولیویا کے عوام کو یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگ ایسے افراد کو منتخب کریں گے جو بولیویا کو دوبارہ سے کوکین برآمد کرنے والا مرکزی ملک بنانا چاہتے ہیں تو اس سے مستقبل میں بولیویا کی امریکی امداد متاثر ہو سکتی ہے۔'' بولیویا کو ڈرانے کے بجائے روچا نے انہیں مشتعل کر دیا تھا۔ مورالیس نے اعلان کیا کہ سفیر کے الفاظ لوگوں کے ضمیر کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایم اے ایس نے پورے ملک میں ایسے پوسٹرز آویزاں کر دیے جس پر مورالیس کی تصویر تھی اور اس کے نیچے یہ الفاظ لکھے تھے ''بولیویا! تم فیصلہ کرو کہ کون حکمرانی کرے گا؟ روچا یا عوام کی آواز؟''

۲۰۰۲ء کے صدارتی انتخابات میں ایم اے ایس فاتح جماعت سے صرف دو عدد سے ہار گئی

تھی۔ مورالیس نے امریکہ میں پرورش پانے والے کروڑ پتی گونزالو سانچیز ڈی لوزاڈا کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا بلکہ ایم اے ایس نے حزب اختلاف میں بیٹھنا قبول کرلیا تھا۔ شاویز کا تختہ الٹنے میں ناکامی کی طرح بظاہر اس ناکامی نے بھی مورالیس کی نیک نامی میں اضافہ کردیا تھا۔

صدر سانچیز آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے مطالبات کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ۲۰۰۲ء میں اس نے ٹیکس میں بے تحاشہ اضافے کا فیصلہ کیا تھا جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوتا ہے کہ جو طبقہ مشکل ٹیکس ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ سب سے زیادہ متاثر ہو۔ نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات میں تیس افراد قتل ہوگئے۔ سڑکیں بند کرنے کے عمل اور مظاہروں نے ملک کو تالا لگا دیا۔ ساتھ ہی سانچیز نے قدرتی گیس کو ضرورت مند بولیویائی عوام میں تقسیم کرنے کے بجائے امریکہ اور دیگر ممالک کو سستے نرخوں پر برآمد کرنے کا منصوبے بنائے تھے جس سے مقامی آبادیاں بپھر گئیں۔ بالآخر سانچیز ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تھا اور اب وہ واشنگٹن سے باہر کسی علاقے میں مقیم ہے۔ بولیویا اس پر مقدمہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کی کئی درخواستوں کے باوجود امریکہ نے اسے لوٹانے سے انکار کردیا تھا۔

بولیویا نے عالمی بینک کو پسپا کیا اور پھر بیک ٹیل کو شکست دی جو دنیا کے چند مضبوط ترین اداروں میں سے ایک تھا اور اب ان میں سے ایک سے نسلوں سے ظلم کا شکار بنایا جارہا تھا وہ اپنی ثقافتوں کی راکھ سے اٹھ کر آسمان پر چھا گیا تھا اور اس میں نہ صرف بولیویا اور لاطینی امریکہ کی عوام کے لئے ایک پیغام تھا بلکہ بیک ٹیل اور بقیہ کارپوٹوکریسی کے لئے بھی واضح پیغام تھا۔ یہ انصاف اور جمہوریت پر مبنی ایک ایسا پیغام تھا جو بولیویا، امریکہ اور باقی دنیا کی نوجوان نسل کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

میں اکثر جیسیکا کے ان تاثرات کے بارے میں سوچا کرتا تھا جس کا اظہار اس نے دریائے زونگو کی تنگ وادی میں سے گزرتے ہوئے کیا تھا۔ برازیل کے دورے کے دوران میں نے امریکی خارجہ پالیسی اور سی آئی اے کے دھوکہ دہی کے پہلو میں نے دیکھے تھے وہ نہایت بدصورت تھے بلکہ وہ لاطینی رہنماؤں کے پیغام کا جواب دینے کی واشنگٹن کی ایک کوشش تھی۔

باب نمبر: ۲۳

برازیل: کچھ پوشیدہ راز

جب جنوری ۲۰۰۵ء میں، میں برازیل میں منعقدہ ورلڈ سوشل فورم میں شریک ہونے کے لئے پہنچا تھا تو پورے براعظم میں کارپوٹوکریسی کے خلاف انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ شاویز، لولا اور گوٹیریز کے ساتھ ساتھ نیسٹر کرچنر اور تاباری رامون ویز کویز نے بالترتیب ارجنٹائن اور یورا گوئے میں انتخابات جیت لئے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کے ان میں سے کچھ دباؤ کا شکار بھی ہیں۔ تمام کے تمام امریکی مداخلت اور غیرملکی کارپوریشنز کے استحصال کے خلاف بھرپور مہم چلا چکے تھے۔ شمالی امریکہ کا پریس ہوسکتا ہے کہ انہیں ''بائیں بازو کی جماعتیں''، ''کاسترو کے دوست'' اور ''کمیونسٹ'' کہہ کر رد کرچکا ہو مگر افریقہ، ایشیاء، یورپ، وسطی اور جنوبی امریکہ کے عوام ان القابات کا پس منظر اور وجوہات سے بخوبی آگاہ تھے۔ تمام کے تمام نئے صدور اپنے آپ کو قوم پرست کی حیثیت سے منوا چکے تھے جو اپنے ملکوں کے وسائل کو اپنے غریب عوام کی غربت کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرنے کے بارے میں پرعزم تھے۔

کچھ غیرمعمولی چلی میں بھی وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ شائع شدہ اطلاعات اور حال ہی میں منظر عام پر آنے والے امریکی حکومت کی دستاویزات نے ان تمام افواہوں کی تصدیق کردی تھی کہ نکسن انتظامیہ اور سی آئی اے نے ۱۹۷۳ء میں چلی کے جمہوری طور پر منتخب صدر الینڈے کی معزولی اور ہلاکت میں امریکی کمپنیوں اور چلی کے فوج کے ساتھ مل کر کوششیں کی تھیں۔ الینڈے کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے اپنے عوام سے کئے وعدوں جسے پورے کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان وعدوں میں چلی کے وسائل چلی کے عوام کے حوالے کرنے کے لئے غیرملکی ملکیت میں کوئلہ، تانبا اور لوہے کی کمپنیوں اور ۶۰ فیصد بینکوں کو قومیانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ عراق، ایران، گوئٹے مالا، انڈونیشیا اور دیگر کئی ممالک کی طرح امریکہ نے الینڈے کے متبادل کے طور پر ایسے شخص کا انتخاب کیا جو سفاک کردار کی جیتی جاگتی مثال تھی اس کا نام تھا جنرل آگسٹو پنوشے اور آج دو دہائیوں کے بعد ورلڈ سوشل فورم میں یہ خبریں گرم تھیں کہ امریکی کانگریس کے تفتیشی ممبران اور چلی کے ایک جج نے واشنگٹن کے رگز بینک اور دیگر غیرملکی بینکوں میں پنوشے کے ۱۶ ملین ڈالرز کے اثاثوں کا پتہ

چلا لیا اور اب پنوشے کو پولیس اور فوجی دستوں کے ذریعے دو ہزار باشندوں کے قتل کے الزام میں عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

ساتھ ہی ورلڈ سوشل فورم میں یہ افواہیں بھی پھیلی ہوئی تھیں کہ چلی کی ایک ایسی عورت کو ۲۰۰۵ء کے صدارتی انتخابات میں کھڑا کیا جا رہا ہے جس کا باپ ایئر فورس میں جنرل کے عہدے پر فائز تھا اور پنوشے سے اختلاف کرنے پر اسے جیل میں مار دیا گیا تھا۔ میشیل بچلیٹ نے اپنی قابلیت کو چلی کی صحت اور دفاع کی وزارتوں میں منوا لیا تھا۔ اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ایک قوم پرست تھی جو کارپریٹوکریسی کے خلاف کھڑی ہونے کو تیار تھی اگر وہ یہ انتخاب جیت جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنوبی امریکہ کی ۸۰ فیصد عوام نے کارپریٹوکریسی کے مخالف امیدواروں کو منتخب کیا ہے جو تقریباً امریکہ کی آبادی ۳۰۰ ملین کے برابر بنتی تھی اور انہوں نے ایسے لوگوں کو چنا تھا جو شمال میں قائم سلطنت کے خلاف ہیں۔

ورلڈ سوشل فورم دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی علامت ہے۔ اس کی بنیاد تیسرے ہزاریے کے آغاز میں ورلڈ اکنامک فورم کے مقابلے پر رکھی گئی تھی جہاں پر حکومتی اور کاروباری سربراہان مل کر کاروباری معاہدے کرتے ہیں، تجارتی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں اور کارپریٹوکریسی کی دیگر حکمت عملیوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں ۱۳۰ سے زائد ممالک سے ایک لاکھ پچاس ہزار شرکاء، پورٹو الیگرے، برازیل میں ورلڈ سوشل فورم کے پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تھے تاکہ وہ معاشی، سماجی، ماحولیاتی اور سیاسی معاملات اور مسائل پر تبادلہ خیال کر سکیں اور ناکام ہوتے نظاموں کے متبادل تیار کر سکیں۔ دیگر اہم شخصیات کے ساتھ برازیل کے صدر لولا اور وینزویلا کے صدر شاویز بھی ورلڈ سوشل فورم میں شریک ہوئے تھے۔

مجھے سویڈن کی ایک غیر منافع بخش تنظیم ڈیگ ہیمر سکیولڈ نے ''معاشی تباہ کار کے اعترافات-اب آگے اس دنیا کے لئے کیا ہوگا؟'' عنوان پر خطاب کرنے کے لئے مجھے دعوت دی تھی۔ میرے خطاب کے لئے ایک بہت بڑے شامیانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے حقوق دنیا کی کئی زبانوں میں فروخت ہو چکے ہیں مگر یہ کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اس کا انگریزی نسخہ ساری دنیا میں بک چکا تھا۔ سامعین کی ایک بڑی تعداد سینکڑوں کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور شامیانے کے دروازے تک پھیلے ہوئے تھے۔ میری تقریر کے بعد درجنوں قطار بنا کر سوال پوچھنے اور اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کے لئے مائیکروفون

کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ میں وہاں موجود ایک نوجوان برازیلی شخص سے بہت متاثر ہوا تھا جو اپنے ملک کی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے لولا پر الزامات لگائے کہ وہ معاشی تباہ کاروں کے چنگل میں پھنس گیا ہے اور انتخابی مہم کے دوران کئے گئے وعدوں سے مکر گیا ہے۔ اس کی مختصر تقریر نے مجھے گوٹیریز پر کی جانے والی تنقید کی یاد دلا دی جو میں نے ایکواڈور میں سنی تھی۔

دوسروں سے الگ نظر آنے والے ایک شخص جو عمدہ لباس میں ملبوس تھا میرے قریب آیا اور مجھے بزنس کارڈ تھماتے ہوئے اپنا تعارف برازیل کے صدر لولا کے مشیر خاص کی حیثیت سے کرا دیا۔ اس نے مجھ سے میرے ہوٹل کے نزد واقع پارک میں ملنے کی درخواست کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ''براہ کرم اس ملاقات کو ہم دونوں کے درمیان رہنا چاہئے۔''

طے شدہ وقت پر میں پارک پہنچ گیا تھا۔ میں کچھ پریشان تھا میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے برازیلی عہدیداروں کو ناراض کر دیا تھا لیکن مجھے اس کی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود سرکاری عہدیدار سے ان خفیہ حالات میں ملاقات کرنا کچھ عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

میں پارک کے کونے پر کھڑا رہا تاکہ اپنے آپ کو پرسکون کر سکوں۔ پاس سے گزرتی ایک گاڑی میں سر پھاڑنے والا زوردار میوزک بج رہا تھا۔ میں پھول کے پودے میں خوشبو سونگھنے جھکا تو مجھے اس میں سے گاڑیوں کے دھوئیں کی بو آئی تھی۔ میں اس شہر کے بارے میں سوچنے لگا پورٹو الیگرے ۱.۵ ملین آبادی کا ایک صنعتی شہر ہے مگر امریکہ میں بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ میں سیدھا ہوا اور پارک میں داخل ہو گیا۔

''جوز'' درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا تھا۔ آج اس نے استری شدہ قمیص اور پتلون کے بجائے پولو کی قمیص اور جینز زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس نے جدید انداز کے سیاہ چشمے پہن رکھے تھے اور ڈھیلی ڈھالی تنکوں والی ٹوپی پیشانی پر لگائی ہوئی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملانے لگا۔ وہ مخاطب ہوا ''آپ کے آنے کا شکریہ'' وہ ابھی بھی کھڑا تھا۔ اس نے نہایت عمدہ انگریزی میں بیان کیا کہ اگر اس سے کوئی پوچھتا کہ میں آپ سے ملنے کیوں آیا تھا تو وہ اسے صرف یہ بتاتا کہ وہ میرے اور میری کتاب کے بارے میں پرتگالی زبان میں اس کی اشاعت تعطل کا شکار ہونے کی وجہ جاننا چاہتا تھے۔'' مگر یہ میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی مگر آج کل کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور پھر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

اس نے مجھ سے میری کتاب میں بیان کئے گئے دو ایرانیوں یامین اور ڈاک کے متعلق سوالات جنہوں نے ۱۹۷۷ء میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہوئے شاہ ایران کے متعلق اور مولویوں کی شاہ کو برطرف کرنے کے ارادہ کے بارے میں تفصیلات سے آ گیا کیا تھا جو ۱۹۷۷ء کے دو برس بعد پوری دنیا نے دیکھا۔ جوز نے یقین دہانیوں پر اطمینان کا اظہار کیا کہ یامین اور ڈاک کی اصل شناخت کبھی ظاہر کی نہ جائیں گی۔ اس نے کہا کہ وہ بھی اپنے پیغام کو امریکہ کے عوام تک پہنچانا چاہتا ہے مگر مجھے اسے ضمانت دینی ہوگی کہ میں اس کی پہچان کو خفیہ رکھوں گا۔ گفتگو کے دوران اس نے تذکرہ کیا کہ وہ اس وقت چھبیس برس کا تھا جب ۱۹۶۸ء میں میں نے کالج سے گریجویشن مکمل کی تھی۔

اس نے کہا کہ اس نے میری کتاب پڑھی تھی اور ان معاملات کو سراہتا ہے جن کو میں منظر عام پر لایا تھا۔ مگر اس کے خیال میں ''یہ برف کے پہاڑ کی چوٹی ہے، بس! مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی اندازہ ہوا اس بات کا کہ تمہاری کتاب میں بھی اصل کہانی بیان نہیں کی گئی لیکن میں یہ سب بتانا چاہتا ہوں۔''

جوز نے بیان کیا کہ اس کے مالک لولا پر بے حد دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس نے کہا ''یہ صرف برطرفی اور قتل کی دھمکیوں اور رشوتوں کی حد تک محدود نہیں ہے اور نہ یہ کاروباری معاملات طے کرنے اور جھوٹی معاشی پیشین گوئیاں پیش کرنے کے متعلق ہے۔ ان کا مقصد صرف قرضوں کے ذریعے ہمیں غلام بنانا نہیں بلکہ یہ سب کچھ ان سب سے زیادہ گھناؤنا اور گھمبیر ہے۔''

اس نے بتایا کہ برازیل اور دیگر کئی ممالک میں سیاسی جماعتوں پر کارپوریٹوکریسی کا مکمل قابو ہے یہاں تک کہ کٹر کمیونسٹ امیدوار جو امریکہ کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں اندر ہی اندر واشنگٹن سے ملے ہوئے ہیں۔''

جب میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے تو وہ ہنسنے لگا۔ اس نے بتایا ''میں اس سب کا کافی عرصے سے حصہ ہوں۔ میں ہمیشہ سیاست میں شامل رہا ہوں۔ جانسن سے لے کر بش، دونوں بش یہ سب کچھ جان چکا ہوں۔ تمہاری خفیہ ایجنسیاں اور تمہارے معاشی تباہ کار تمہارے تصورات سے زیادہ موثر ہیں۔''

جوز نے بتایا کہ کس طرح طالبعلموں کو لالچ میں مبتلا کیا جاتا ہے جب وہ ناواقف ہوتے ہیں اور بہکاوے میں آ سکتے ہیں۔ اس نے اپنی نوجوانی کے ذاتی تجربات سے آگاہ کیا کہ کس

طرح عورتوں، شرابوں اور منشیات کو استعمال کیا جاتا ہے۔'' تو پھر تم نے سوچا کہ جب امریکہ کا ایک کٹر مخالف تمہارے دفتر میں داخل ہوتا ہے اور تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس وقت اس کی زندگی کا واحد مقصد امریکہ کے خلاف مزاحمت کرنا ہے تو سی آئی اے کا سایہ اس کے سر پر ہوتا ہے۔''

''کیا اسے دھمکایا جاتا ہے؟''

وہ مسکرانے لگا ''تم اسے یہ بھی کہہ سکتے ہو یا جدید سفارت کاری کا نام دے سکتے ہو۔ ظاہر ہے اس میں صرف امریکہ ہی شامل نہیں ہے۔ تم نے یقیناً ان افواہوں کے بارے میں سنا ہوگا کہ کیسے نوریگا کو برطرف کیا گیا اور اب وہ امریکہ کی جیل میں سڑ رہا ہے۔''

میں نے جواب دیا ''میں نے سنا ہے کہ اس نے کونٹاڈورا کے جزیرے پر کیمرے نصب کئے تھے۔'' وہ پانامہ کے ساحل پر ایک بدنام زمانہ ہوٹل ہے جہاں امریکی تاجران سیاستدانوں کو ہر طرح کی عیاشی میں پھنسا سکتے ہیں میں نے بھی اپنی ملازمت کے دوران کونٹاڈورا کے کافی دورے کئے تھے اور اسے استعمال بھی کیا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا ''تمہیں پتہ ہے کہ ان کیمروں سے کون پکڑا گیا تھا؟''

میں نے جواباً کہا ''افواہیں سنی تھیں کہ جارج بش اپنے باپ کی صدارت کے دور میں نشے کی حالت میں جنسی حرکتیں کرتا ہوا پایا گیا تھا۔'' لاطینی امریکہ میں یہ کہانی مشہور ہے کہ نوریگا نے بش اور اس کے حواریوں کی ان تصاویر کو صدر بش کو انتہائی اہم معاملات پر اپنے ساتھ ملانے کے لئے استعمال کی تھیں۔ جوابی کارروائی میں صدر نے پانامہ پر حملہ کر دیا تھا اور نوریگا کو پکڑ کر میامی جیل میں بند کر دیا تھا۔ وہ عمارت جہاں پر نوریگا کے خفیہ کاغذات رکھے تھے اسے بموں سے تباہ کر دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں اس دن دسمبر ۱۹۸۹ء کو پانامہ کے دو ہزار سے زائد باشندے جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کہانی ہی اس ملک کے خلاف ظالمانہ حملے کی وجوہات بیان کرتی ہے جو نہ صرف فوج رکھتا ہے اور نہ امریکہ کے لئے کسی اور طرح پریشانی کا باعث ہے۔

جوز نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''جہاں پر میں موجود ہوں یہ افواہیں بالکل سچ معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے ایسی چیزیں دیکھی ہیں جو ان کو تصوراتی دنیا سے حقیقی دنیا میں منتقل کر دیتی ہیں اور یقیناً تم نے بھی ایسی کئی چیزوں کا تجربہ کیا ہوگا۔'' پھر اس نے توقف سے کہا ''لیکن یہ چیزیں [illegible] خوفزدہ کر دیتی ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا لولا بھی بدعنوانی کی دلدل میں پھنس گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ میرے اس سوال نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ کافی وقفے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ لولا بھی اسی نظام کا حصہ ہے۔ ''اور کس طرح وہ اس رتبے سے پہنچ سکتا تھا؟'' مگر اس کے باوجود اس نے اپنے دل میں لولا کے لئے احترام کا اعتراف کیا ''وہ ایک سچا آدمی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنے لوگوں کی مدد کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا اور کہا ''مجھے ڈر ہے کہ واشنگٹن اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کرے گا اگر وہ حد سے آگے بڑھا۔''

میں نے دریافت کیا ''تمہارا کیا خیال ہے وہ یہ کیسے کر پائیں گے؟''

''ہر ایک کی زندگی میں کچھ راز ہوتے ہیں۔ ہر سیاستدان کی زندگی میں ایسے کچھ کام کئے ہوتے ہیں جو بدنما معلوم ہو سکتے ہیں اگر انہیں کسی خاص انداز میں منظر عام پر لایا جائے۔ کلنٹن کی زندگی میں مونیکا لیونسکی کا دھبہ ہے جبکہ وہ اصل مسئلہ ہرگز نہیں تھی۔ کلنٹن دراصل دنیا کی کرنسیوں کے طریقے میں نظر ثانی چاہتا تھا جس میں وہ حد سے تجاوز کر گیا تھا اور ساتھ ہی وہ ری پبلکن کی مختلف انداز کی مہموں کو ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی نوجوان متحرک اور سحر انگیز تھا۔ اسی لئے مونیکا کو منظر عام پر لایا گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ بش کے ماضی میں کوئی عورت نہیں ہوگی کیا؟ مگر کس میں ہمت ہے ان کے بارے میں بات کرنے کی؟ لولا کے بھی کچھ ایسے راز ہیں۔ اگر تمہاری سلطنت چلانے والے اسے برباد کرنا چاہیں گے تو وہ تمام راز دنیا کے سامنے آ جائیں گے۔ امریکی تسلط کو للکارنے والے رہنما کو قتل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔'' اس نے مجھے ایسے انداز سے دیکھا جو مجھے کئی ماہ بعد اس وقت یاد آیا تھا جب لولا کی جماعت کے چار تجربہ کار عہدیداروں نے اپنے اوپر لگائے گئے ان الزامات کے جواب میں استعفٰی دے دیا تھا جن کے مطابق ان چاروں نے قانون سازوں کے ووٹوں کے عوض انہیں کئی ملین ڈالر دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ لولا کا سیاسی کیریئر اس رسوائی کے نتیجے میں ختم ہو جائے گا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ اس سلطنت کو ہم کیسے قابو میں لا سکتے ہیں؟ تو جوز نے کہا تھا ''میں اسی لئے تم سے ملنا چاہتا تھا۔ امریکہ میں صرف تم یہ سب بدل سکتے ہو، تمہاری حکومت نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اور اب تمہاری عوام کو اسے حل کرنا چاہئے۔ تمہیں اس بات پر اصرار کرنا چاہئے کہ واشنگٹن جمہوریت کے خواب کے عزم کو پورا کرے اس وقت بھی جب جمہوری طور پر

منتخب ہوئے تمہارے سربراہان بدعنوان کارپوریشن کو قومیا رہے ہوں۔ تمہیں اپنی حکومت اور کارپوریشنز پر قابو پانا ہوگا۔ امریکی عوام بہت طاقت رکھتے ہیں۔ تمہیں اس کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ اس کے سوائے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ برازیل میں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وینزویلا میں بھی یہی حال ہے۔ نائیجیریا کے عوام بھی مجبور ہیں یہ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے۔''

ورلڈ سوشل فورم پر میری تقریر اور کتاب کو جس قدر پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی ساری خوشی پر جوز کی بات چیت کی وجہ سے اوس پڑ گئی تھی۔ پورٹو الیگرے کی سڑکوں پر ٹہلتا ہوا میں حد درجہ مایوس محسوس کر رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے میں اس برازیلی عورت کے سامنے اس قدر کمزور پڑ گیا تھا جس نے اپنا تعارف بطور صحافی کرایا تھا۔

خوبصورت برازیلی خاتون

اپنی تقریر کے دوران میں اس طرف متوجہ ہوئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔ وہ اسٹیج کے بالکل سامنے پہلی والی صف میں بیٹھی تھی۔ اس کے سنہرے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے چہرے مہرے سے اس کا تعلق مقامی آبادی سے لگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی یہ تمام خصوصیات اسے دوسری تمام عورتوں سے نمایاں کر رہی تھیں جبکہ برازیلی خواتین اپنے حسن کے لئے شہرت رکھتی ہیں۔

تقریر کے اختتام پر وہ سب سے پہلے چبوترہ کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے مصافحہ کے بعد مجھے اپنا تعارفی کارڈ تھما دیا۔ اس کا نام بیٹرز موشالا تھا۔ کارڈ پر کئی رسالوں کے نام لکھے تھے اور نیچے ریو کا پتہ لکھا تھا۔ وہ بولی ''مجھے آپ کا انٹرویو لینا ہے۔ میرے قارئین آپ کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں۔ والدین کی طرف سے میں ہسپانوی ہوں لیکن میری پیدائش ارجنٹائن کی ہے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی ''مگر دل سے میں کاری اوکا ہوں۔''

جس طرح اس نے اپنا تعارف کروایا تھا اور بالخصوص جن الفاظ کا انتخاب کیا تھا اس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ کاری اوکا، ریو ڈی جینیرو کی خواتین کو کہا جاتا ہے اور یہ خواتین مردوں کو لبھانے کے لئے مشہور ہیں مگر وہ مجھے دوسروں سے الگ لگی تھی یا پھر شاید اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا لباس یا پھر ہوسکتا ہے وہ خوبصورت بہت تھی۔ میری چھٹی حس مجھے اس سے دور رہنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بے حد مصروف ہوں۔

اسی دن مجھے ایک ریٹائرڈ سی آئی اے ایجنٹ سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جس نے مجھے کلنٹن کے مواخذے کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔ یہ تمام تفصیلات جوز کے بتائے ہوئے حالات سے کافی مماثلت رکھتی تھیں۔ ''لنڈا ٹرپ کو صدر کو تباہ کرنے کا کام دیا گیا تھا کیونکہ وہ اصلاح پسند گردانا جاتا تھا اور کارپریٹوکریسی کو کھوکھلا کر سکتا تھا۔'' اس نے بتایا ''جیسے کہ تم جانتے ہو میرے جیسے لوگ ہمیشہ سیدھے سادھے لوگوں سے اپنے گندے کام کرواتے ہیں اس میں خطرہ کم ہوتا ہے اور ثبوت باقی نہیں رہتا۔ لنڈا نے مونیکا لیونسکی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے مونیکا کو کہا کہ بے

چارے بل کو گھر پر کوئی توجہ دینے والا نہیں تم اس کی مدد کر سکتی ہو اور پھر جو کچھ ہوا وہ تم جانتے ہو۔

بیٹرز نے اس دن کافی دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی جب میں افریقہ اور یورپ کی جماعتوں سے مل رہا تھا میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ حیرت انگیز طور پر ہمارا کئی دفعہ اس وقت آمنا سامنا ہوا جب میں جوز کے ساتھ بات چیت کے بعد ایسے ہی ٹہل رہا تھا کیونکہ جو کچھ میں نے جوز سے سنا تھا اس پر میں بہت پریشان تھا۔ اس نے مجھے ایک اور کارڈ دیا۔ اس دفعہ اس نے اپنے آپ کو مجھ پر لادنے کی کوشش نہ کی شاید وہ میرے جذبات کی حساسیت کو بھانپ گئی تھی یا پھر شاید اسے مجھے فارغ دیکھ کر دکھ ہوا تھا کیونکہ میں نے اس سے مصروفیت کا بہانہ کیا تھا۔ اس کے تاثرات نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا نہ جانے میں اتنا شک کیوں کر رہا تھا؟

اس کے بعد میں اپنی توجہ اس کی طرف سے ہٹا نہیں پایا۔ میرا خیال تھا کہ جوز کے بتائے ہوئے واقعات کو مجھے محتاط کر دینا چاہیے تھا لیکن درحقیقت اس سے مجھ پر الٹ اثر پڑا۔ میں پریشان اور دکھی محسوس کر رہا تھا اور اب میں انٹرویو کے لئے نہ ماننے پر اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے ایک خوبصورت عورت کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی ضرورت ہو کیونکہ وہ تھی تو ایک صحافی اور میں برازیل اپنا پیغام پہنچانے آیا تھا۔ اس سے ایک ملاقات سے کیا بگڑ سکتا تھا؟

مجھے ہوٹل کے استقبالیہ سے ملے اس کے پیغام پر گہرا اطمینان محسوس ہوا۔ میں نے اسے فون کیا اور شام میں اس کے ہوٹل کی لابی میں ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

بیٹرز اور میں پلازہ ہوٹل کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ آج اس نے منی اسکرٹ کے بجائے جینز پہن رکھی تھی۔ اس نے درخواست کی کہ انٹرویو ہسپانوی زبان میں کر لیں کیونکہ اس کی انگریزی میری ہسپانوی سے خراب تھی۔ وہ مضامین ارجنٹائن اور برازیل دونوں ممالک میں شائع ہونے تھے جن کا ترجمہ اسے پرتگالی زبان میں کرنا تھا۔ اس نے مجھے ارجنٹائن میں گزرے اپنے بچپن کے بارے میں بتایا اور میں اسے بیونس آئرس میں گزرے وقت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ارجنٹائنی عورت کو برازیلی حسن کے درمیان پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں ہنسی مذاق کرتی رہی۔

شاید پندرہ منٹ بعد اس نے مجھ سے ٹیپ ریکارڈ استعمال کرنے کی اجازت چاہی، میں مان گیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈ ایک بڑے سے ہاتھ سے بنے ہوئے بیگ میں سے نکالا اور مائیکروفون کو میز پر دونوں کے درمیان رکھ دیا تھا اور معاشی تباہ کار کے بارے میں سوالات کرتی رہی۔ پھر وہ

ریکارڈ کو پیچھے کر کے بات چیت سننے لگی۔ اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا ''اردگرد کی آوازیں بہت زیادہ آ گئی ہیں۔'' وہ دوبارہ اپنے بیگ پر جھک گئی اسے چھاننے کے بعد پین اور نوٹ بک نکالی اور معذرت کرتے ہوئے مجھے اپنے جوابات کو دہرانے کے لئے کہا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد وہ آرام سے اپنی کرسی پر دراز ہو گئی اور مقامی آبادیوں کے متعلق میری پچھلی تصنیف شدہ کتابوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ''پڑھنے والے یقیناً وسیع بارانی جنگلات میں آباد لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ کیا ہم اس کے متعلق بات کر سکتے ہیں؟''

معاشی تباہ کار کے قصے بتا بتا کر میں تھکن محسوس کرنے لگا تھا اس لئے میں نے فوراً اپنی دیگر کتابوں کے بارے میں بات چیت کرنا بہتر سمجھا۔

وہ اپنے ٹیپ ریکارڈ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ''میں یہ ریکارڈ کرنا چاہتی ہوں؟ کیا خیال ہے اس شور شرابہ سے دور چلیں۔ میرا کمرہ صرف لفٹ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے؟''

اس وقت تک میں مقامی آبادیوں کے متعلق بات چیت کے خیال میں الجھ چکا تھا۔ میں بیٹرز کی پیشہ وارانہ مہارت سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہلکی پھلکی نوک جھونک سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا جس طرح کے لوگوں کے خلاف میں کام کر رہا تھا مجھے زیادہ محتاط ہو جانا چاہئے تھا مگر میں بہک گیا تھا۔

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے تک پہنچا اور اس دوران اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا لباس، بات چیت اور خوبصورتی ثابت کر رہی تھی کہ کوپا کابانا اور اپانیما کے ساحل دنیا میں کیوں مشہور ہوئے۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے مجھے صوفہ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ہمارے درمیان کبھی میز پر ٹیپ ریکارڈ کا درست زاویہ طے کرنے لگی اور پھر اس نے مجھے شراب پیش کی۔ اگرچہ میں صرف کبھی کبھار بیئر پیا کرتا تھا مگر اس دن شراب کے لئے مان گیا۔ اس نے دو گلاس تیار کئے اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

جب میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں بہت قریب بیٹھے ہیں وہ اور قریب ہونے لگی۔ اس نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا اور میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا

وہ مستقل میرے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر یکدم خیال آیا کہ وہ کیسے مجھ سے اچانک پارک اور ہوٹل کے درمیان سڑک پر میرے سامنے آ گئی تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں ایک شخص بار بار آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے۔ مجھے شک ہوا، بیٹرز صرف دل لگی نہیں چاہتی تھی یقیناً اس کے عزائم زیادہ خطرناک تھے۔ میں اپنے گلاس کی طرف دیکھنے لگا۔ ممکن تھا اس شراب میں کچھ ملا ہوا ہو۔

میں نے یکدم خفیہ کیمرے کو ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور اس سے کہا میں لگ بھگ تمہارے باپ کی عمر کا ہوں گا اور میں شادی شدہ بھی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

''برازیل میں کہا جاتا ہے کہ عمر رسیدہ مرد زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''مجھے چلنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے؟'' وہ فوراً بولی۔

میں دروازہ کی طرف بڑھا اور بولا ''آج سے ہماری دوستی ختم!''

وہ صوفہ سے اٹھ کر میری طرف بڑھی۔

میں نے کمرہ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ''مجھے انٹرویو کی کاپی ضرور بھیجنا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''اگر تم اپنا ارادہ بدل لو تو مجھے فون کر لینا، میں یہیں پر ملوں گی ویسے تمہیں انٹرویو کی کاپی ضرور بھیجوں گی۔''

مگر اس انٹرویو کی کاپی مجھے کبھی نہیں ملی۔

بادشاہت سے ٹکر لینا

برازیل سے میری واپسی کے کچھ عرصے بعد اس کے پڑوسی بولیویا میں ایک نیا سیاسی تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ جس آدمی نے برطرف صدر گونزالو سانچیز ڈے لوزاڈا کی جگہ سنبھالی تھی اس کا نام کارلوس میسا تھا جو ایک نہایت کمزور اور کارپوریٹوکریسی کی کارروائیوں میں شریک تھا۔ ایوو مورالیس کی ایم اے ایس جماعت اور دیگر مقامی تنظیمیں زمینی حقوق، غریبوں کے لئے سبسڈائز شدہ کھانے پکانے کا تیل اور تیل اور گیس کی صنعتوں کے قومیائے جانے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

جب میں انٹرنیٹ پر چھپنے والے مضامین کا مطالعہ کرتا تھا اور لاطینی امریکی دوستوں سے بات کرتا تھا تو مجھے اکثر مردوں، عورتوں اور بچوں کی وہ لمبی قطاریں یاد آ جاتی تھیں یہاں وہ برفانی بارش میں اپنے بجلی کے بل دینے کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ وہ آج کیا سوچتے ہوں گے؟ وہ اس وقت کتنے کمزور، مفلس لگتے تھے بالکل ان غلاموں کی طرح جو ٹن کی ہسپانوی کانوں میں کام کیا کرتے تھے مگر یکدم مجھے خیال آیا کہ وہ قطار توڑ کر سڑکوں پر آ گئے ہیں اور انہوں نے پانی کی کمپنی پر دھاوا بول دیا ہوا اور انہوں نے صدارتی محل پر حملہ کر دیا ہو۔ وہ عالمی بینک کے سامنے ڈٹ گئے ہوں، کارپوریٹوکریسی کو منہ توڑ جواب دیں اور دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت پر اپنا غصہ نکال ڈالا ہو اور انہوں نے اپنے مقاصد کے لئے جان دے دی ہو۔ ایسا کیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہو جائے؟

عام طور پر ایسے سوالات کے کئی جواب ہوا کرتے ہیں مگر اس معاملے میں ایک جواب نہایت اہم ہے اور وہ ہے ایک شخص جس کا نام تھا ایوو مورالیس۔ وہ یقیناً اس نئی تحریک کی حمایت کرنے والے چند رہنماؤں میں سے ایک تھا مگر وہ واحد تھا جو کانگریس کا رکن بنا اور پھر صدارتی امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوا اور سب سے بڑھ کر وہ تبدیلی کی علامت اور متحرک بن چکا تھا۔ وہ جارج واشنگٹن، سائمن بولیور اور دیگر عظیم رہنماؤں کی طرح ایوو مورالیس ایک سرگرم کارکن اور خواب دیکھنے والا انسان تھا۔ وہ بولیویا کی امید تھا اور ہم سب کی بھی کیونکہ اس کا ظہور ہمارے مشترکہ خوابوں کی تعبیر تھی۔ جیسا کہ ایسے بحرانوں کے وقت میں انسان ابھرتے ہیں جو اپنے لوگوں

کو اندھیرے سے باہر نکالنے کے لئے رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں روشنی سے آشنا کرتے ہیں۔

مورالیس کے ظہور میں جدید لاطینی رہنما ہیوگو شاویز کا بہت بڑا کردار تھا جو اس کارٹون میں گن تھامے کردار کی طرح دنیا کے سب سے طاقتور حکمران کے سامنے ڈٹ گیا تھا اور اسے شکست دے دی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ لاطینی امریکہ کے لاکھوں باشندے جارج بش کو جمہوری طریقے سے منتخب نمائندے کے بجائے ایک ایسے جابر اور آمر گردانتے تھے جس نے انتخابات کے اس طریقے کو غلط استعمال کیا تھا جن سے صحیح اور شفاف ہونے کی وجہ سے شاویز اور مورالیس ابھرے تھے۔ اگر عظیم رہنماؤں کو مشکل حالات درپیش ہوتے ہیں تو شاویز اور مورالیس ان کا سامنا کر چکے ہیں۔

ایک اور ملک میں وقوع پذیر ہونے والے حالات نے بھی مورالیس کو حوصلہ دیا۔ ایکواڈور میں جاری سیاست اس ایمارا رہنما کے حق میں کردار ادا کر رہی تھی۔ ایکواڈور کی عوام لوسیو گوٹیریز پر معاشی تباہ کاروں کے ساتھ مل کر تجارتی معاہدے طے کرنے کا الزام لگا یا تھا اور وہ اس کے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ۲۰ اپریل ۲۰۰۵ء کو کوئیٹو کے قانون سازوں نے گوٹیریز کو عہدہ چھوڑنے کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس کی جگہ نائب صدر الفریڈو پلاسیو کو عارضی صدر بنا کر اس سے حلف لے لیا۔

ایکواڈور کے نئے صدر کو سبکدوش صدر کی ان خلاف ورزیوں کی شناخت کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا جس کی اصل بنیاد میں آئی ایم ایف، عالمی بینک، واشنگٹن اور وال اسٹریٹ کی خواہشات پوری کرنے میں پوشیدہ تھیں۔ اس کی برطرفی کے دو دن بعد نیویارک ٹائمز نے ایک مضمون شائع کیا جس کے مطابق پلاسیو اور اس کے وزیر معاشیات رافیل کوریا نے سابق صدر کے بین الاقوامی قرضے دینے والے اداروں سے تعلقات پر تنقید کی تھی اور ملک کے ۴۰ فیصد بجٹ کو قرضے ادا کرنے کے لئے استعمال کرنے کو غیر اخلاقی قرار دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کی نئی حکومت امریکہ کے ساتھ چلنے والی تجارتی بات چیت کے مقاصد پر نظر ثانی کرے گی۔ ٹائمز نے لکھا کہ پلاسیو نے نشاندہی کی کہ وہ تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ان قرضوں کے لئے مختص کرنا چاہتے ہیں جو سماجی اخراجات کی مد میں حاصل کیا گیا ہے۔

مورالیس کے مطابق ایکواڈور کی صورتحال ان پالیسیوں کی تصدیق کرتی ہے جن کا وہ ماننے والا تھا۔ وہ اس صورتحال کو آنڈیز میں تبدیلی کا پیش خیمہ قرار دیتا تھا اور اس بات کا ثبوت

گردانتا تھا کہ یہ حالات اس کے جیسے نچلے طبقے سے اٹھنے والے رہنماؤں کے لئے بالکل صحیح ہیں جن کو عام معیارات سے مفلس یا غریب جانا جاتا ہے اور وہ سمجھتا تھا کہ اب اس جیسے لوگوں کو باگ ڈور سنبھال لینی چاہئے۔ اس کے بیان پر امریکہ نے سرکاری ردّعمل میں شدید غصے کا اظہار کیا تھا جبکہ لاطینی امریکہ کے نظریے کے مطابق اس طرح کا ردعمل ایک تصدیق کی حیثیت رکھتا تھا۔

واشنگٹن میں ابھرنے والی سوچ کی عکاسی نیو یارک ٹائمز کے اس مضمون سے ہوتی ہے:

''مورالیس کے صدارت تک پہنچنے کے خیال کو بش انتظامیہ منشیات کے خلاف جاری جنگ کے لئے ایک دھچکا گردانتی ہے اور اس سے کئی لاکھ ملین ڈالر کی امریکہ کی طرف سے انسداد منشیات، معاشی اور ترقیاتی منصوبوں کے لئے جاری کی جانے والی امداد کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔''

بولیویا اور دیگر لاطینی باشندے یہ سمجھ گئے تھے کہ وہائٹ ہاؤس اور امریکی میڈیا مورالیس کو بدنام کرنے کے لئے کسی حد تک بھی گر سکتا ہے۔ یہ ہتھکنڈے امریکی عوام کو بیوقوف بنا سکتے تھے مگر جیسے کہ روجا کے امریکی امداد روکنے کے بیانات نے ثابت کیا تھا کہ اگر مورالیس منتخب ہو گیا تو ایسی دھمکیاں بولیویا کے عوام پر مزید منفی اثرات ڈالیں گی۔

امریکہ میں ایک ایسی دعوت کے دوران جہاں کئی لاطینی طالب علم موجود تھے میں نے ایک لطیفہ سنا جو کچھ یوں تھا ''ہیوگو کو سب سے زیادہ شہرت دینے والا کون ہے؟''

''جارج بش''

''ایوو کو سب سے زیادہ مشہور کرنے والے کا نام کیا ہے؟''

''جارج بش''

''نہیں! جارج بش نمبر تین پر آتا ہے۔ وال اسٹریٹ جرنل اور نیو یارک ٹائمز نے اسے اس مقابلے میں ہرا دیا ہے۔''

باب نمبر:۲۶

خاندانی جذبات

کئی لاطینی امریکیوں کے لئے ایوو مورالیس کارپوریٹوکریسی مخالفت غریبوں کے لئے جدوجہد کی تحریک کی زندہ علامت تھا۔ اپنے روایتی آنڈین سویٹر، لمبے چوغے اور اونی ٹوپی میں ملبوس وہ متوسط پس منظر کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ بغیر کسی الجھن کے اپنے لوگوں کی عظمت کا دعویٰ دنیا بھر کے سامنے کرتا تھا۔ وہ مانتا تھا کہ صرف اس لئے کہ وہ لوگ صدیوں سے جبر و غلامی کی زندگیاں گزار رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے وقار اور اپنی زمینوں کے لئے لڑیں گے نہیں۔ استحصال کا مطلب کمتری نہیں ہوتا۔ معاشی غربت کسی بھی طرح اخلاقی جرأت کی کمی کی نشاندہی نہیں کرتی ہے۔

اس نے صدر کے انتخاب کے لئے امیدوار بننے کا اعلان کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان غیر ملکی کارپوریشنز سے لڑے گا جو اس کے ملک کے وسائل کو لوٹنا چاہتی ہیں اور امریکہ کے اس مطالبے کو رد کر دیا تھا کہ اس کا ملک کوکا کی فصلوں کو تباہ کر دے۔ اس نے زور دیا تھا کہ کوکا کا پودا مسئلہ اس صورت میں ہوتا ہے اگر اس سے کوکین بنائی جائے اور اسے بولیویا سے باہر لے جا کر بیچا جائے۔ اس نے اصرار کیا کہ وہ منشیات کے مسئلے کو اس کے استعمال کرنے والوں پر اثر انداز ہو کر حل کریں گے۔

دسمبر ۲۰۰۵ء میں ایوو مورالیس نے بولیویا کے پہلے ریڈ انڈین صدر بننے کے لئے بھاری اکثریت حاصل کر لی تھی۔ اس نے فوراً صدر کے عہدے کے لئے اپنی تنخواہ نصف کم کر دی تھی اور یہ فرمان جاری کیا تھا کہ کابینہ کا کوئی وزیر اس سے زیادہ تنخواہ نہیں لے گا اور بچنے والی رقم کو سرکاری اسکولوں کے استاد رکھنے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس کا نائب صدر الوارو گارسیا لینیرا تھا جو کارپوریٹوکریسی مخالف انقلابی تحریک کا رہنما رہ چکا تھا اور جیل میں چار سال گزار چکا تھا۔ تعلیمی لحاظ سے میکسیکو میں ریاضی دان کی تعلیم حاصل کر چکا تھا اور بعد میں لا پیز میسر ڈی سان آنڈریس یونیورسٹی میں عمرانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا جہاں پر وہ ایک مفکر اور سیاسی تجزیہ نگار مانا جاتا تھا۔ انصاف کی وزیر ایک خاتون جو ماضی میں ملازمہ رہ چکی تھیں، سینیٹ کا ایک

رہنما دیہی اسکول میں استاد تھا۔ اگرچہ وہ خود مقامی آبادی سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ اس کی جدوجہد بولیویا کی سارے غریب عوام اور حقوق سے محروم آبادی کے لئے ہے چاہے وہ جھونپڑیوں میں رہتے ہوں یا آنڈیز کی چوٹیوں پر آباد ہوں یا پھر اندھیرے جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہوں۔

امریکہ کا میڈیا امریکی عوام کو گمراہ کرنے میں مصروف تھا۔ انہوں نے بالکل ویسے ہی ایک مہم شروع کر رکھی تھی جیسے گوئٹے مالا پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے صدر اربینز کے خلاف چلائی گئی تھی۔ اس وقت میڈیا ایسا تاثر دے رہا تھا کہ مورالیس ایک ''کمیونسٹ'' اور ''کاسترو کا پرکارہ'' ہے۔

مورالیس کے انتخاب کے ایک ماہ بعد جنوری ۲۰۰۶ء میں بیک ٹیل بولیویا کے خلاف دائر مقدمے سے دستبردار ہوگئی تھی۔

چار ماہ سے کم عرصے میں مئی ۲۰۰۶ء کو مورالیس نے بولیویا کی فوج کو حکم دیا کہ وہ ملک بھر میں پھیلے تیل اور گیس کے کنوؤں پر قبضہ کرے اور انہیں سرکاری تحویل میں لے لے۔ اس نے کارپوریشنز کے عہدیداروں کو موجودہ معاہدوں پر حکومت نے مجھ سے بات چیت کرنے کے لئے ۱۸ دن کا عرصہ دیا تھا۔ اس نے اعلان کیا ''غیر ملکی اداروں کی لوٹ مار ختم کردی گئی ہے۔'' اس وقت ۸۰ فیصد کمپنیوں کو اور ۲۰ فیصد بولیویا کے عوام کے لئے درمیان منافع بانٹنے کے طریقے کو بدلنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ان اعداد کو بالکل الٹ کردیا جائے یعنی ۲۰ فیصد کمپنیوں اور ۸۰ فیصد عوام کے حساب سے بانٹا جائے۔

کچھ حلقوں نے بولیویا کے اس قدم کو متحدہ لاطینی کے محاذ کے نظریات سے متصادم گردانا تھا۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ اس سے سب سے زیادہ متاثر ارجنٹائن اور برازیل ہوں گے کیونکہ وہ بولیویا سے بڑی مقدار میں قدرتی گیس درآمد کرتے ہیں مگر شاویز نے مورالیس کے دفاع میں کہا ''ہم بولیویا کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ اس کا رجحان ویسا ہی ہے جیسا وینزویلا کا ہے۔ ہم نے اپنے قدرتی وسائل اور معدنی دولت کی باگ ڈور اذیت ناک اور طویل جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے جس کی قیمت ہمیں ایک بغاوت کی صورت میں ادا کرنی پڑی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں (بولیویا) سب اچھا ہوجائے گا۔''

مورالیس نے خود اپنی حکمت عملیوں کو واضح کردیا تھا۔ اس نے امریکہ اور لاطینی امریکہ کے

مقابلے میں قوم پرستی اور متحدہ محاذ کی حکمت عملی کی حمایت کی تھی۔ وہ بھی کارپوریشنز کے استحصال کے خلاف تھا چاہے وہ کسی بھی ملک کی ہو۔

''ہم قدرتی وسائل کا دفاع کریں گے، اگر آج سے پہلے بولیویا لاوارث تھا مگر وہ لاوارث نہیں ہے۔ یہ بولیویا کے عوام کی زمین ہے، بالخصوص اس کے جو مقامی ہیں اور یہاں پر صدیوں سے آباد ہیں۔ ادارے، تیل کی کمپنیاں یا ملٹی نیشنل کمپنیاں اگر وہ یہاں آنا چاہتی ہیں اور بولیویا کے قوانین کا احترام کرنے کو تیار ہیں تو ان سب کو میں خوش آمدید کہوں گا......
مگر ایسی کمپنیاں جو بولیویا کے قانون کا احترام نہیں کرسکتی جو قانون اور ریاست کی تابع رہ کر کام نہیں کرسکتی تو پھر ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوسکتا۔''

جنوری ۲۰۰۶ء میں چلی بھی ارجنٹائن، بولیویا، برازیل، ایکواڈور اور یوراگوئے کے نقش قدم پر چل پڑا جب میشل بیچلیٹ نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اس نے انتخابات میں چلی کے لئے خودمختاریت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ چلی کی پہلی خاتون صدر ہے۔ اس نے اقتدار میں آتے ہی اپنے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اپنی کابینہ کی نصف نشستوں پر خواتین وزیر نامزد کردی تھیں۔

یہ رہنما تو اپنی طاقت کا سرچشمہ ماضی کے ان رہنماؤں کو گردانتے ہیں جو ماضی میں سلطنتوں کے خلاف ڈٹ جانے کے لئے شہرت رکھتے ہیں مگر نئے ہزاریے سے پہلے عشرے میں دیگر معاملات بھی وقوع پذیر ہو رہے تھے اور ان معاملات کے عالمی اثرات رونما ہونے والے تھے۔

آج سے پہلے کبھی اتنے سارے ووٹرز نے ان لیڈروں کو اونچے عہدوں کے لئے منتخب نہیں کیا تھا جنہوں نے امریکہ کی ہوس کے خلاف عوام کے حقوق کے دفاع کی بات کی ہو۔ اس سے پہلے کبھی کسی بات پر اتنا اتفاق رائے نہ ہوسکا تھا، نہ ہی پہلے کبھی دیہی اور شہری غریبوں کے لئے اس قدر حمایت کا اظہار ہوسکا تھا اور نہ ہی مقامی آبادی پر اتنی توجہ کی گئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی بھی نوآبادیاتی ملکوں نے اپنے نوآبادیاتی دور کے مالکوں کو اتنا سخت پیغام بھیجا تھا۔ یہ مغربی براعظم میں نہیں ہوا تھا نہ ہی افریقہ اور ایشیاء میں ایسا کچھ ہوا تھا۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ ایسے جابروں کے خلاف مزاحمت ضرور کرتا رہا تھا مگر ان کی جدوجہد کے سب سے برے اثرات ان کے اپنے شعبے کے لوگوں پر مرتب ہوئے تھے۔ لاطینی امریکہ کی جدوجہد اس کے برعکس نہ صرف غیر ملکی استحصال

پسندوں کو ملک بدر کرنا چاہتی تھی بلکہ اس جدوجہد کے ذریعے وہ برابری، آزادی اور معاشی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اس کا زیادہ حصہ پرامن رہا تھا۔ اس کے اثرات ساری دنیا تک پہنچ رہے تھے اور یہ ایک مثال کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس نے ٹھوس کامیابیاں حاصل کی تھیں اور دنیا بھر کے لوگوں کو متاثر کیا تھا۔

نومنتخب صدور بھی کچھ ایسا کر رہے تھے جو اس سے پہلے براعظم کی تاریخ میں کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ دوسرے کا دفاع کر رہے تھے۔ وہ صرف ایک رہنما کے لئے متحد نہیں تھے جیسے کہ بولیور کے دور میں ہوا تھا بلکہ آئی ایم ایف، عالمی بینک اور امریکی حکومتوں کے خلاف باہمی رضامندی سے اپنے موقف کو مضبوط بنایا تھا اور اپنے دفاع کی بھی تدبیریں کر رہے تھے۔ برازیل، ارجنٹائن، چلی، پیرو اور وینزویلا جیسے ممالک نے اپنے عسکری اہداف غیرملکی کارپوریشنز کے دفاع سے ہٹا کر غیرملکی دراندازی کے خلاف اپنی سرحدوں کی حفاظت کو ترجیح دینا شروع کر دی تھی اور ساتھ ہی انہوں نے سنجیدگی سے عسکری تعاون کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے کے علاوہ لاطینی امریکہ کے ممالک نے انڈیا، چین اور دیگر کئی ایسے ممالک کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی بھرپور کوششیں شروع کر دی تھیں جو امریکہ پرستی کی تسلط پسندانہ حکمت عملیوں کی وجہ سے اعتماد نہیں کرتے تھے۔ نومبر ۲۰۰۵ء سے براعظم کے انتہائی اہم دورے کے دوران چین کے صدر ہیوجنتاؤ نے ارجنٹائن، برازیل، چلی اور کیوبا کا دورہ کیا اور میکسیکو کے صدر ویسینٹے فاکس اور پیرو کے صدر الیجانڈرو ٹولیڈو سے دوطرفہ معاملات پر بات چیت کی۔ چینی کاروباری اداروں نے خاموشی کے ساتھ کئی ایسے شعبوں میں امریکی کارپوریشنز کو شکست دینا شروع کر دی ہے جو ماضی میں امریکہ کا خاصہ سمجھے جاتے تھے۔ ایک چینی کمپنی نے پانامہ نہر کے اطراف واقع ملحقہ بندرگاہوں کی باگ ڈور سنبھالی ہوئی ہے۔ چین اور برازیل نے ۱۹۹۸ء میں مشترکہ طور پر ارتھ ریسورس سیٹلائٹ پروگرام خلا میں روانہ کیا تھا۔ اس دوران واشنگٹن نے اپنے کئی تجارتی معاہدے کرنے کی کوششیں کی تھیں جن میں امریکی کارپوریشنز کو فائدہ حاصل ہو سکے مگر لاطینی امریکہ کے رہنماؤں نے ایسی تمام کوششیں مسترد کر دی تھیں اور دوسری طرف زیادہ غیرمنافع بخش تجاویز قبول کر لی تھیں۔ بظاہر یہ بات اس سوچ کے متصادم محسوس ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ چین خود ایک ابھرتی ہوئی قیادت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر پھر بھی لاطینی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ چین امریکہ کے برعکس ماضی میں ان کے اندرونی

معاملات میں دخل دینے سے باز رہا ہے۔

چین آج کل ایسا ملک گردانا جاتا ہے جو طاقت کا توازن قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ امریکہ کی جارحیت کے خلاف معاون ثابت ہو سکتا ہے جیسے کہ سوویت یونین ساٹھ، ستر اور اسی کی دہائی میں کیا کرتا تھا۔ دنیا بھر میں پھیلے لاطینی سفارت کار دنیا بھر میں بہتر تجارتی تعلقات استوار کرنے کے غماز ہیں اگرچہ یہ بھی کارپوریٹوکریسی مخالف تحریک کا ایک حصہ ہے اور اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ ہمارے جنوبی پڑوسی امریکی تسلط کی ہرصورت میں مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔

لاطینی ممالک کے امریکہ کی دراندازی کے اندیشے، امریکی خفیہ کارروائیوں اور اعلانیہ حکمت عملیوں سے حق بجانب محسوس ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب مجھ سے کچھ کرائے کے قاتلوں نے رابطہ کیا جو مجھے اپنے حالیہ گناہوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

باب نمبر: ۲۷

کئی قتلوں کی تاریخ

میں صدر کے منتخب ہونے کے دو دن بعد ان کے دفتر میں پہنچا اور انہیں کامیابی پر مبارکباد دی۔ وہ ایک بڑے سے ڈیسک کی دوسری طرف مجھے چیشائر بلی کی طرح مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور کہا ''جناب صدر! یہاں میرے پاس آپ اور آپ کے خاندان کے لئے دو سو ملین ڈالرز ہیں اگر آپ اس کھیل میں شامل ہونا چاہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کو میرے تیل کی کمپنیوں کے مالک دوستوں پر خاص مہربانیاں کرنی ہوں گی۔ برائے مہربانی انکل سام کے ساتھ خوش دلی سے پیش آیئے۔'' پھر میں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے اپنی دائیں ہاتھ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، ان کے چہرے کی طرف جھک گیا اور سرگوشی کی ''یہاں میرے پاس ایک بندوق اور گولی ہے جس پر آپ کا نام لکھا ہے اگر آپ اپنی مہم کے دوران کئے وعدوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔''

میں پیچھے ہٹا، بیٹھا اور ان کے لئے ان تمام صدور کی مختصری سے فہرست پڑھ کر سنائی جو یا تو قتل کر دیئے گئے تھے یا برطرف کیونکہ انہوں نے انکل سام کو ناراض کیا تھا۔ اس فہرست میں ڈائم سے لے کر ٹوریجوس تک کے نام لکھے تھے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ایسے حالات میں معمول ہوتا ہے۔

وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔

بریٹ نے بیئر کا ایک گھونٹ گلے سے اتارا ''بس یہی ہوا تھا'' اس نے کہا اور یہ کہہ کر ایک سنہری بالوں والی خوبصورت خاتون کو پام بیچ گارڈنز فلوریڈا کے واٹر وے کیفے میں کشتی پر سوار ہوتا دیکھنے لگا اور پھر بولا ''میرا خیال ہے یہ بتانا کافی تھا۔''

جب بریٹ نے پہلی مرتبہ مجھ سے رابطہ کیا تھا تو اس نے اپنا تعارف ایک کرائے کی قاتل کی حیثیت میں کرایا تھا جو مجھ سے ایکوڈاور اور دیگر لاطینی امریکی ممالک کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فون اور ای میل پر زیادہ تفصیل بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس سے اپنے فلوریڈا والے گھر پر ملا تھا اور اس کے بعد کئی ریسٹورنٹس وغیرہ میں ملاقاتیں رہی تھیں۔ اگرچہ وہ

ابھی بھی معاشی تباہ کاری کے کاروبار سے وابستہ ہے اور اسی لئے اپنی شناخت کرانے سے قاصر ہے مگر وہ اپنے مالکان کے رویے سے شدید کوفت میں مبتلا تھا۔ ''بہت بدتمیز لوگ ہیں۔'' وہ بولا ''اور بے ایمان بھی ہمارے شہریوں کو اپنے منتخب کردہ عہدیداروں سے واقف ہونا چاہئے اور یہ بھی پتہ ہونا چاہئے کہ ان کے رویے کس طرح ہمارے پرانے دوستوں کو ہمارا مخالف بنا رہے ہیں۔'' اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ سالانہ نصف ملین ڈالر کے لگ بھگ کما لیتا ہے جو سارا کا سارا ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے مطابق یہ سب اس نے اس وقت شروع کیا تھا جب فیڈل کاسترو نے فلجینیو بتسٹا کا تختہ الٹ دیا تھا اور اس کے خاندان کو لاکھوں ملین ڈالر کا نقصان ہوا تھا اور نو عمری میں وہ کمیونزم سے خوفزدہ تھا۔ اس نے تاسف سے کہا ''کمیونسٹ تو چلے گئے اور یہ آج بھی میرا کام ہے۔ میں اپنے کام میں بے حد ماہر ہوں۔ مجھے اس بات پر اعتراض ہے کہ واشنگٹن میں بیٹھے پاگل بہت برا تاثر پیش کر رہے ہیں۔''

بریٹ کے متعلق تمام چیزیں بڑی مختلف تھیں۔ وہ گھٹیلے جسم کا مالک تھا۔ سونامی سے تباہ شدہ انڈونیشیا میں حفاظتی خدمات کے سربراہ نیل کے برعکس بریٹ پولیس والا معلوم ہوتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اختتام پر پانامہ اور ٹوریجوس اور دیگر جگہوں اور لوگوں کے متعلق اس کی بتائی ہوئی تفصیلات اور خاکے میری یادداشت کے مطابق کافی حد تک درست لگتے تھے جو کہ اس وقت اس نے یہ کام نیا نیا شروع کیا تھا۔ اس سے اس کے حالیہ شکاروں کے متعلق بات کرتے ہوئے میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا تھا۔ وہ مجھے حال ہی میں واقع ہونے والے معاملے کے متعلق آگاہ کرنے لگا جس میں اس نے نو منتخب رہنما کو اس کی اپنی وضع کردہ حکمت عملیوں کے برعکس کام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اس صدر کا نام نہیں یاد کر پا رہا تھا بلکہ اس نے مجھے بتایا کہ اپنے کئی اور کارناموں میں سے وہ اس معاملے کی تفصیلات بیان کرنا چاہتا ہے۔

اس کی بتائی ہوئی کسی بھی تفصیل پر مجھے ذرا سی بھی حیرت نہ ہوئی۔ مجھے ہمیشہ سے اس بات کا شک تھا کہ ان سات ممالک کے صدور تک یقیناً کسی ایسے شخص نے دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی جو میری طرح معاشی تباہ کار ہوگا اور وہ شخص صدر کے لئے بھی غیر مانوس نہ ہوگا۔ وہ یقیناً طاقت کے ایوانوں میں ہی گھومتا پھرتا نظر آتا رہتا ہوگا یا تو وہ عالمی بینک کا ملازم ہوگا یا پھر امریکی سفارت خانے یا پھر امریکی امدادی ادارے میں ملازم یا مشیر ہوگا اور انتخابات کے بعد ہی اس نے اپنا اصلی روپ ظاہر کیا ہوگا۔

جب مجھے کچھ ایسے لوگ ملا کرتے تھے جو صدور کی ہلاکتوں کی کہانیوں پر تو یقین کر لیتے تھے مگر معاشی تباہ کاروں کے وجود کے متعلق شک کا اظہار کیا کرتے تھے تو میں ان کی نشاندہی سامنے نظر آنے والی حقیقت کی جانب کراتا تھا۔ کوئی ہوش و حواس رکھنے والا آدمی کسی صدر کو قتل کرنے سے پہلے اس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش نہ کرے گا۔ کوئی سیاستدان یا سی آئی اے کا جاسوس اس طرح کے کام کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ مافیا کا کوئی رکن بھی اس کی ہمت نہیں رکھتا۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ جھنجھٹ بھی بہت ہے۔ اس میں غلطیوں کی کافی گنجائش موجود رہتی ہے۔ آپ ہمیشہ پہلے اپنے قاصد بھیجتے ہیں وہ ان رہنماؤں کو للچانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اگر یہ حربہ ناکام ہو جائے تو وہ تختہ الٹنے یا قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

جب مجھے ایسے فرائض کی انجام دہی کے لئے بھیجا جاتا تھا تو بریٹ کے مقابلے میں کافی نرمی سے پیش آتا تھا۔ میں ہمیشہ چوکنا رہتا تھا کہ سرکاری دفاتر میں آواز ریکارڈ کرنے کے آلات نصب رہتے ہیں۔ اگرچہ میرے پیغام کا مطلب بھی یہی ہوتا تھا۔ صدر کو واضح پتہ چل جاتا تھا کہ وہ اقتدار میں اس وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے گا وگرنہ اسے زندہ یا مردہ اس عہدے سے ہٹا دیا جائے گا۔

شاویز نے معاشی تباہ کاروں اور کرائے کے قاتلوں سے ہونے والی ملاقاتوں کا احوال وینزویلا کے ریڈیو پر بیان کیا تھا۔ بی بی سی نے اس موضوع پر ہونے والی شاویز کی بات چیت پیش بھی کی تھی۔

صدر نے کتاب ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ انہیں بھی ایک موقع پر ایسے لوگوں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں آئی ایم ایف سے رقوم کی پیشکش کی گئی تھی اگر وہ جاسوسی پروازوں اور امریکی مشیروں کی موجودگی کے لئے مان جاتے ہیں۔ اگرچہ اس نے ان کی جانب سے کی جانے والی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تھا مگر ان معاشی تباہ کاروں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور مجھ پر کنز ور سرکاری افسروں، قوانین حتیٰ کہ فوجی افسران کے ذریعے سے بھی دباؤ ڈالنے کی کوشش کیں۔ شاویز نے کہا کہ جیسا کہ پرکنز نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے کہ کرائے کے قاتل اس وقت منظر عام پر آتے ہیں جب معاشی تباہ کار اپنی سازشوں میں ناکام ہو جاتے ہیں اور تختہ الٹنے یا قتل کرنے کی سازشوں کا استعمال کرتے ہیں اور اگر وہ دوبارہ یہاں آنے کے بارے میں سوچیں گے تو ہم انہیں پھر ہرائیں گے۔'' اس عزم کا اظہار سنتے ہی

عوام نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

صدر گوٹیریز کی برطرفی کے بعد مجھ سے کچھ ایکواڈورین صحافیوں نے رابطہ کیا۔ میں نے انہیں بریٹ کے ساتھ ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا اور اس بات کی نشاندہی کی کہ ہو سکتا ہے کہ سابق صدر سے ایسے کسی شخص نے ملاقات کی ہو۔ ایسے تمام انٹرویوز کے دوران میں نے یہ حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرا مقصد کسی لاطینی سیاستدان کو تنقید کا نشانہ بنانا نہیں ہے بلکہ میں امریکی عوام سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ہماری حکومت اور کارپوریشنز سے یہ اصرار کریں کہ وہ جمہوریت روکنے سے باز آجائیں۔

ان میں سے کم از کم ایک انٹرویو تو ایکواڈور کے پریس نے بھی شائع کیا تھا۔ ۳ مارچ ۲۰۰۶ء کو مجھے ایک غیر منافع بخش تنظیم پاچاماما الائنس کے چیئرمین بل ٹوئسٹ کی جانب سے ای میل موصول ہوئی جس سے ماضی میں میں بھی وابستہ رہا تھا۔ اس ای میل کے ساتھ اس تنظیم کے ایکواڈور کے دفتر میں ملازم ایک افسر کی ای میل بھی منسلک تھی جس میں کوئیٹو کے روزنامچے ایل کامرسیو میں چھپنے والا ایک مضمون کا حوالہ تھا جس کا عنوان کچھ یوں تھا ''لوسیو گوٹیریز نے جان پرکنز پر ہتک عزت کا الزام لگایا ہے۔'' یکم مارچ ۲۰۰۶ء کو اس افسر نے مضمون کا خلاصہ بھی ای میل کیا تھا جو کچھ اس طرح تھا ''جان کے انٹرویو نے یہاں افراتفری برپا کر دی ہے آج کے کامرسیو میں گوٹیریز کی سیاسی جماعت کے ڈائریکٹر نے اعلان کیا ہے کہ سابق صدر اس کے خلاف ہتک عزت کے مقدمے میں قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ یہ کافی گرما گرم معاملہ ہے کیونکہ یہ انتخابات کا موسم ہے اور گوٹیریز کی لڑکھڑاتی سیاسی جماعت کی سلامتی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

''ایل کامرسیو'' نے جوابی انٹرویو کے لئے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے اس اخبار کے صحافی سے بھی اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ مجھے ایکواڈور کی سیاست میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے اور میرا مقصد کبھی بھی گوٹیریز پر الزام لگانا نہیں تھا بلکہ میرا مقصد تو یہ تھا کہ میں امریکی عوام کو اس بات سے آگاہ کر سکوں کہ ہماری حکومت اور کارپوریشنز اکثر اوقات اپنے اختیارات سے تجاوز کر جاتی ہیں اور ہمیں طاقت کے اس بے جا استعمال کو ختم کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اگرچہ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ گوٹیریز کی ملاقات کسی معاشی تباہ کار سے ہوئی ہو گی مگر میں نے خود ماضی میں سرکاری عہدیداروں پر اس طرح کے دباؤ ڈالے ہیں۔

اس کے بعد میں گوٹیریز کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا سکا مگر ''معاشی تباہ کار کے

اعترافات‘‘ اور ایل کامرسیو میں شائع شدہ مضامین کی وجہ سے امریکی فوج کے کئی ارکان نے مجھ سے رابطہ کر کے مجھے کولمبیا کی سرزمین سے وینزویلا پر حملہ کرنے کی کارستانیوں کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ بریٹ کی طرح وہ بھی اپنے ملک کی حکمت عملیوں کے بارے میں تفصیلات میں شدید فکرمند تھے۔ ان میں عوام میں جا کر ان باتوں کا اعتراف کرنے کی ہمت نہ تھی مگر وہ چاہتے تھے کہ امریکی عوام ان کے تجربات کے بارے میں جانیں۔

کولمبیا ان چند ممالک میں سے تھا جو براعظم میں چلنے والی کارپوریٹوکریسی مخالف تحریک کا حصہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو امریکہ کا نائب بنا رکھا تھا۔ امریکہ کے ٹیکس ادا کرنے والوں کی معاونت اور کارپوریٹ اداروں کے تعاون سے بنائی گئی جاسوسوں کی فوج اور باضابطہ عسکری حمایت کی وجہ سے یہ ملک واشنگٹن کا علاقائی تسلط بحال کرنے کی کوششوں میں قریبی حلیف تھا۔ اگرچہ امریکی مداخلت کی اصل وجہ منشیات کا خاتمہ بیان کیا جاتا تھا مگر دراصل تیل کے وسائل کا استحصال کرنے والی قوتوں کے سدباب کے لئے زور پکڑتی تحریکوں کو کچلنے کی ایک ترکیب تھی۔

راؤل زیبچی جو ہفت روزہ ’’بریچاڈی مونٹیوڈیو‘‘ کا ادارتی شعبے کا رکن لاطینی امریکہ کی فرانسسکن ملٹی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس نے ایک موقع پر یہ نشاندہی کی تھی کہ کولمبیا اب مصر، اسرائیل اور عراق کے بعد امریکہ سے عسکری امداد لینے والا چوتھا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے (ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق کولمبیا تیسرے نمبر پر ہے) اور یہ بھی کہ بوگوٹا میں امریکی سفارت خانہ عراق کے بعد دنیا میں سب سے بڑا سفارت خانہ ہے۔ اس نے لکھا کہ وہ اور دیگر تجزیہ نگار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ واشنگٹن پینٹاگون کی قیادت میں جنوبی امریکہ کی متحدہ فوج بنانے میں مشغول ہے جو مجوزہ فری ٹریڈ ایریا آف دی امریکاز (ایف آئی اے اے) کی عسکری شکل ہوگی جس کا ہیڈ کوارٹر کولمبیا میں ہے۔

مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے فوج کے دو ملازمین اور ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ نے پروفیسر زیبچی کے الزامات کی تصدیق کی تھی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انہیں کولمبیا میں تعینات کرنے کی اصل وجہ امریکی موجودگی کو مستحکم کرنا اور لاطینی فوجیوں کو تربیت دینا تھا تاکہ وہ امریکہ کی زیرنگرانی سدرن یونیفائیڈ آرمی میں شامل ہو سکیں (اس اصطلاح کو ان تین میں سے دو حضرات نے استعمال کیا تھا)

لیفٹیننٹ نے مجھے آگاہ کیا کہ ’’ہم کولمبیا میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے کولمبیا میں جاری

منشیات کا کاروبار مزید پھلتا پھولتا ہے۔‘‘ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہاں حالات کیوں خراب ہو رہے ہیں؟ کیونکہ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ ہم منشیات کی اسمگلنگ میں شامل ہیں، جیسے سی آئی اے ایشیا کے گولڈن ٹرائینگل میں شامل تھی اور وسطی امریکہ اور ایران کے درمیان ایران کونٹرا کے وقت میں شامل تھی۔ جس طرح برطانوی چین میں افیون کے کاروبار میں شامل تھے۔ امریکی حکومت خفیہ کارروائیوں اور فوجوں کے اضافہ کے لئے بے تحاشہ پیسہ فراہم کرتی ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا جان سکتے ہو؟ ہم وہاں موجود ہیں میرے جیسے وردی والے تاکہ تیل کو محفوظ کر سکیں اور وینزویلا میں حملہ کر دیں۔ منشیات کا کھیل ایک بہانہ ہے۔‘‘

ماحولیاتی تحفظ سے متعلق سابق امریکی افسر بیرٹ نے مجھے بتایا کہ وینزویلا کی سرحد کے ساتھ گیانا میں خفیہ فوج پہنچ چکی تھی۔ اس نے مزید کہا کہ تمام فوجی جنگ کے آزمودہ اور پیراشوٹ کے ذریعے داخل ہو گئے تھے جن کو جنگل میں لڑنے اور ہسپانوی زبان کی تربیت دی گئی تھی۔

’’افغانستان اور عراق میں ہماری جنگیں جاری ہیں۔ وہاں جنگل نہیں ہے۔ وہاں کوئی ہسپانوی نہیں بولتا تو پھر اس تربیت کا کیا مطلب ہے؟ مگر سوچو کہ کہاں جنگل زیادہ ہیں؟ وینزویلا میں اور زبان بھی وہ ہسپانوی بولتے ہیں۔ میرے جیسے لوگوں کے علاوہ وہاں پر امریکی، برطانوی اور جنوبی افریقہ کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ گیانا میں لاطینی فوجوں کے کئی افراد تعینات ہیں جن میں سے زیادہ تر ویسٹرن ہیمیسفیئر انسٹیٹیوٹ فار سیکورٹی کوآپریشن سے سند یافتہ تھے۔

ویسٹرن ہیمیسفیئر انسٹیٹیوٹ فار سیکورٹی کوآپریشن جو ماضی میں اسکول آف امریکاز کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لاطینی فوجیوں کو جنگی مہارت، بغاوت کچلنے کے طریقوں، تفتیشی کارروائیاں تشدد، جاسوسی، مواصلات اور قتل کرنے کی تربیت دیا کرتا ہے۔ اس سے تحصیل شدہ طالب علموں میں براعظم کے بدنام ترین آمر اور جنرل شامل ہیں۔ اسکول آف امریکاز اس وقت تک پانامہ فیر کے زون میں واقع تھا۔ جب تک ٹوریجوس نے اس کی منتقلی پر اصرار شروع نہیں کیا تھا۔ ٹوریجوس کی موت کے بعد نوریگا نے اسے واپس اسی علاقے میں منتقل کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اسی وجہ سے امریکہ نے اسے انتہائی مطلوب افراد کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ ٹوریجوس اور نوریگا دونوں اسکول آف امریکاز سے سند یافتہ تھے اور دونوں اس غیر جمہوری ادارے کی طاقت سے بخوبی واقف تھے۔ پھر اسے فورٹ بیننگ، جارجیا منتقل کر دیا گیا اور ۲۰۰۱ء میں بڑھتی تنقید کو ما، کرنے کے لئے اس کا نام تبدیل کر دیا گیا تھا۔

ایل کامرسیو میں چھپنے والے مضامین سے جنم لینے والے تنازعہ کے دوران مجھے مارٹا رالڈاز
نے ایکواڈور سے ایک ای میل کی تھی۔ وہ امریکہ آ رہی تھی اور وہ مجھ سے مل کر اپنے والد یعنی
ایکواڈور کے صدر جیمی رالڈاس کی موت کے بارے میں بات چیت کرنا چاہ رہی تھی جنہوں نے
مجھے اور دوسرے کئی اور معاشی تباہ کاروں کے دباؤ اور لالچ کو ٹھکرا دیا تھا اور مئی ۲۴/۱۹۸۱ء کو
طیارے کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ نئی اطلاعات کے طابق ان کا طیارہ پہاڑ سے ٹکرایا
تھا۔ مگر مستند ذرائع نے میرے اس شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا سی آئی اے نے
اس کو قتل کرایا تھا۔ اپنی کتاب ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' میں ایک جگہ میں نے لکھا تھا
''واشنگٹن اور تیل کی کمپنیوں کی اس سے نفرت کے علاوہ دیگر کئی عوامل بھی ان الزامات کو درست
ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔'' مارٹا مجھ سے ان ہی حالات اور عوامل کے بارے بات کرنا چاہتی
تھی۔

وہ ۱۶/مارچ ۲۰۰۶ء کو میامی پہنچی تھی اور شمال کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے پام بیچ کاؤنٹی
میں واقع میرے گھر کے قریب میں واقع ریسٹورنٹ پہنچی تھی۔ میری بیٹی جو اس وقت ۲۳ برس کی تھی
اور میں اس سے ریسٹورنٹ کے کھلے صحن میں ملا تھا جہاں بیٹھ کر ہم نے گھنٹوں بات چیت کی تھی۔
مارٹا نے بتایا کہ وہ دراصل امریکہ اس لئے آئی تھی کہ وہ جیمی رالڈاس لائبریری تعمیر کرانے میں کچھ
مدد حاصل کر سکے۔ یہ ایکواڈور میں اپنی نوعیت کی پہلی لائبریری ہوگی جو ایک نہایت مقبول صدر کی
یاد میں تعمیر کی جائے گی جو اپنے عہدے کی مدت کے دوران انتہائی افسوسناک حادثہ کا شکار ہوئے
تھے۔ اس نے نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''بالکل جان ایف کینیڈی لائبریری کی طرح
قائم ہوگی۔'' اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ اس لائبریری میں اس کے والد کی موت
سے متعلق میں وہ تمام مواد رکھ جاؤں گی جو اس سے پہلے عوام کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اس
دوران اس نے کہا کہ ''مجھے پکا یقین ہے کہ وہ ایک قتل تھا جہاز کا پائلٹ اپنے کام میں ماہر اور
میرے والد کا اچھا دوست تھا۔ اس کا اپنا خاندان اور بچے تھے۔ وہ میری والدہ کی بہت قدر کرتا تھا
جو اس وقت جہاز میں سوار تھیں۔ وہ کسی بیوقوفی کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ جیسے کہ حادثے کے بعد کی
اطلاعات میں دعویٰ کیا گیا تھا۔ پریس کی اطلاعات کے برعکس اس جہاز کو جس راستہ سے گزرنا تھا
وہ ایکواڈور کے معیارات سے ناہموار ہرگز بھی نہ تھا اور اس دن موسم بھی خاصا صاف تھا جبکہ جہاز
نے اپنا راستہ تبدیل کیا تھا اور س کی کہیں کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی۔''

اس کے بعد مارٹا نے ان تفصیلات کا ذکر کیا جو اس وقت عوام سے چھپائی گئی تھیں۔ ہر قسم
کے حکام کو حادثے کی جگہ داخلے کے لئے بند کر دیا گیا تھا، مقامی پولیس کو سارے معاملے سے دور
رکھا گیا تھا۔ صرف ایکواڈور اور امریکی فوجی عملہ کو اس جگہ تک رسائی حاصل تھی۔ دو عینی شاہدین کو
گاڑی کے حادثے میں اس سے قبل قتل کر دیا گیا تھا جب وہ حادثے کی تباہی کے حوالے سے چلنے
والی سماعت میں گواہی دینے والے تھے جہاز کے انجنوں میں سے ایک انجن کو سوئٹزرلینڈ کی
لیبارٹری میں جائزہ کے لئے بھیجا گیا تھا جو یہ ثابت کرتا تھا کہ وہ انجن جہاز کے پہاڑ سے ٹکرانے
سے پہلے ہی کام کرنا بند کر چکا تھا۔ مارٹا حادثے کے وقت صرف سترہ برس کی تھی اور اس کے دونوں
والدین حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ کئی سالوں تک
اس کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ پھر جب وہ اکتالیس برس کی ہوئی تو اسے احساس ہوا
کہ اسی عمر میں اس کے والد کا انتقال ہوا تھا اور اب اسے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔
وہ بولی آپ نے اپنی کتاب میں ان اثرات کے متعلق لکھا ہے جو کہ میرے والد کی موت کی
صورت میں او مارٹو ریجوس پر اثر انداز ہوں گے۔ میں اس بات کو صحیح گردانتی ہوں۔ میں نے او مار
کے بھانجے سے شادی کی تھی اور وہ میری دس سالہ بچی کا باپ ہے۔ میرے والد کے قتل نے او مار کو
بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے شوہر اور دیگر کئی افراد کو یہ بتایا تھا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی
موت بھی میرے والد کی طرح ہوگی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ مرنے کے لئے تیار ہیں کیونکہ وہ
کامیاب ہو چکے ہیں کیونکہ انہوں نے نہر پانامہ پانامہ کے عوام کے حوالے کر دی ہے اور اسکول
آف امریکاز کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا ہے۔
او مارٹو ریجوس جیمی رالڈاس کے قتل کے دو ماہ بعد ۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء کو طیارے کے حادثے
میں مارے گئے۔

مارٹا سے ملاقات کے بعد گھر واپس پہنچتے ہی میں نے اس ملاقات کا تمام ریکارڈ ٹائپ کر لیا
تھا۔ میں نے وہ جیسیکا کو پڑھوایا، ہفتے بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا، اس کا دوبارہ جائزہ لیا اور
جب مجھے یقین ہو چلا کہ مارٹا واپس آ گئی ہے تو اسے ایکواڈور ای میل کر دیا تھا۔ مجھے اس کا کوئی
جواب نہ ملا۔ میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ جون میں میں اور میری بیوی
نیو انگلینڈ میں واقع ہماری گرمیوں کی رہائش گاہ منتقل ہو گئے تھے۔ میں نے اسے وہاں سے بھی ای
میل کی جس میں میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ اسی کا پتہ ہے۔ اس نے جواب لکھا ''ہاں! میں

میں، مارتا ہی ہوں۔'' پھر اس نے اسے ہماری ملاقات کے ریکارڈ کے حوالے سے ای میل کی جس میں اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ کچھ تبدیلی کرنا چاہتی ہے یا مزید کچھ درج کرنا چاہتی ہے۔ پھر اس کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ دو ہفتے بعد مجھے اس کے ای میل ایڈریس سے ایک پیغام موصول ہوا۔ میں اس کا پیغام پا کر بے حد خوش ہوا مگر پیغام کھولنے پر پتہ چلا کہ مجھے بھی اور کئی لوگوں کی طرح ایکواڈور کے تھیٹر کے معمولات سے آگاہ کیا گیا تھا۔ میں نے اسے جواب میں دوبارہ اس ریکارڈ کے متعلق پوچھا تھا اور اس سے اس کے تاثرات دریافت کیے تھے مگر پھر کوئی جواب نہ آیا۔

اس دوران میں نے نارتھمپٹن، میساچوسٹس کے ہائی اسکول میں ۱۱ جون ۲۰۰۶ء کو منعقد ہونے والی افتتاحی تقریب سے خطاب کرنے کی دعوت قبول کی تھی۔ اس تقریب میں میرے اسکول کے ہسپانوی استاد جوان کارلوس کاریبو سے دوستی ہوئی جو ایکواڈور کے رہنے والے تھے اور جن کے چچا ایکواڈور کے نہایت قابل احترام مفکر اور کئی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر جیمی گالا رزا زاوالا تھے جنہوں نے ''جیمی رالڈاس کو کس نے قتل کیا'' نامی کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ وہ آج کل ایکواڈور کے ایل اوروصوبے میں واقع کاساڈی لاکلچرا ایکواٹوریانا نامی ملک کے اعلیٰ ترین ثقافتی ادارے کے صدر ہیں۔ جو ایکواڈور سے برآمد ہونے والے کیلے کے لئے مشہور ہے۔ اگست ۲۰۰۶ء میں جوان کارلوس نے مجھے بتایا کہ اس کے چچا نیویارک میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

۱۴/ اگست کو میری بیوی وینفریڈ اور میں نارتھمپٹن کے ایک ریسٹورنٹ لاکیز وکلا پہنچے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم نے جوان کارلوس اور اس کے چچا کو ڈھونڈنے لگے۔ وہ اتوار کی شام تھی اور ریسٹورنٹ تقریباً خالی پڑا ہوا تھا اس کے باوجود انہوں نے دوسری میزوں سے ہٹ کر پچھلے حصے میں بیٹھنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ اتفاق تھا یا جاسوسوں کی وجہ سے احتیاط برتی گئی تھی۔

کچھ دیر بات چیت کے بعد جیمی نے مجھے بتایا کہ ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' نے ایکواڈور میں کافی ہلچل مچا رکھی ہے اور اس کی خریداری تقریباً ناقابل عمل ہے۔'' جیسے ہی وہ کتابوں کی دکانوں تک پہنچا تھا کسی نے ساری جلدیں خرید لی تھیں۔'' یہ کہہ کر وہ جھینپتے ہوئے مسکرائے اور پھر مخاطب ہوئے ''یہ میری بھی کچھ کتابوں کے ساتھ ایسا ہی ہو چکا ہے بالخصوص جس کتاب میں میں نے رالڈاس کے قتل کے سلسلے میں سی آئی اے، اسرائیلی حکومت، ایکواڈور کے اعلیٰ فوجی

عہدیدار اور دائیں بازو کی سیاسی قوت کے ملوث ہونے کے حوالے سے تفصیلات درج کی تھیں۔'' رالڈاس کی طرح ڈاکٹر گالارزا بھی گایا کوئل یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکے تھے اور رالڈاس کے بہت خاص دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ صدر منتخب ہونے کے بعد رالڈاس نے انہیں اپنے قتل ہونے کے خدشات سے آگاہ کیا تھا۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ مجھے ایک ایسا واقعہ کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں جو میرے لئے کافی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

مئی ۱۹۸۱ء میں جیمی تیل کی کمپنی کے ادارے کے عہدیداروں سے خفیہ ملاقات کے لئے ہیوسٹن گیا تھا۔ وہاں کئی اعلیٰ سرکاری افسران بھی اس سے ملے تھے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ کافی معاون ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ پہلے تیل کی کمپنیز میں کام کر چکا تھا۔ جیمی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اچھا دوست ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر گالارزا نے ٹھنڈی آہ بھری، مگر وہ کتنا غلط تھا۔ ہر صورت میں یہ وہی وقت تھا۔ وہاں صرف کچھ ایکواڈورین تھے اور تیل کی کمپنی والے جنہوں نے اس سارے معاملے کو اخفائے راز میں رکھنے پر اصرار کیا تھا نہ کوئی پریس کا نمائندہ تھا نہ کوئی پریس کانفرنس ہوئی تھی۔ امریکیوں نے ایکواڈوریوں کو اپنی پیشکش سے آگاہ کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جیمی نے اپنی انتخابی مہم میں اپنے عوام سے ان پر قابو پانے کا وعدہ کیا تھا مگر پھر بھی وہ اسی طرح کے معاہدے کے لئے خواہش مند تھے جیسے وہ ایکواڈور اور دیگر کئی اور ممالک میں ماضی میں کرتے رہے تھے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ تیل کی ابتدائی تلاش کریں گے اور ایکواڈور اس کی قیمت خام تیل یا ڈالرز کی صورت میں ادا کرے گا۔

جیمی نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ تمام خدمات کا معقول معاوضہ ڈالرز میں ادا کرنے کے لئے تیار ہے مگر وہ خام تیل کی صورت میں ادائیگی نہیں کر سکتا۔ جیمی نے انہیں بتایا کہ ''میں اپنے ملک میں پیٹرو کیمیکل کمپلیکس بنوانا چاہتا ہوں تاکہ میرے عوام دیگر مصنوعات سے بھی فائدہ حاصل کر سکیں اور اس کے لئے ہم خام تیل اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔'' یہ سن کر عہدیداران طیش میں آگئے، یہ ویسا معاہدہ ہرگز نہ تھا جیسے وہ پچھلی حکومتوں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور پھر یہ ان کی عالمی حکمت عملیوں سے بھی میل نہ کھاتا تھا۔ ماحول تناؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ جیمی کے مطابق وہ ملاقات نہایت کشیدہ ہو گئی تھی۔ آخر کار اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ وہ امید کر رہا تھا کہ اس کے باقی نمائندے بھی ایسا ہی کریں گے مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ میرا دوست صدر جیمی کوئیٹو واپس آ گیا اور اپنے قریبی مشیروں کو فوراً طلب کیا گیا۔ انہوں

نے اسے بتایا کہ انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ نہایت خطرناک صورتحال میں ہیں اور اس کی جان کو
بھی خطرہ ہے مگر وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے ٹی وی
پر بیان دیا کہ وہ تمام غیر ملکی کمپنیوں کو قومیا لے گا اگر انہوں نے ان منصوبوں کو نافذ نہ کیا جو ایکواڈور
کے عوام کی بہتری کے لئے ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس نے اتا ہوالپا اولمپک اسٹیڈیم میں اپنی تقریر
کے دوران ریاست کی ذمہ داریوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا جو اس کے باشندوں بالخصوص غریب
افراد کی فلاح و بہبود کے اصول وضع کرتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ اور اس کی اہلیہ ایک
چھوٹے سے جہاز کے ذریعے نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے جہاں وہ کبھی پہنچ نہ سکا۔ وہ
دونوں ہیوسٹن میں منعقدہ خفیہ ملاقات کے ایک ماہ کے کم عرصے میں ۲۴ مئی ۱۹۸۱ء کو طیارے کے
حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور اس میں قطعاً کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جیمی رالڈاس کو قتل کیا
گیا تھا۔

اس کے بعد ہم چاروں کافی دیر تک کوئی بات شروع نہ کر سکے۔ میرے ذہن میں جیمی
رالڈاس اگٹیلرا کا وہ خاکہ ابھر رہا تھا جس میں پہلی بار اس سے کوئیٹو میں ایک دعوت کے دوران ملا
تھا۔ میں اس کی توانائی، کشش، حس مزاح اور قوت ارادی سے بے حد متاثر ہوا تھا جس کے ذریعے
وہ ایکواڈور کو براعظم کے غریب ترین ملکوں کی دلدل سے نکالنا چاہتا تھا۔ بالآخر میں ڈاکٹر گالارزا
کی طرف مڑا اور انہیں رالڈاس سے مارچ میں ہونے والی میری ملاقات سے آگاہ کیا۔ میں نے
اس کے لگائے ہوئے الزامات کا مختصراً تذکرہ کیا جس کے مطابق رالڈاس کا حادثہ ایک قتل تھا۔

ڈاکٹر گالارزا اپنے بھانجے کی طرف مڑے اور کہنے لگے ہاں کیا یہ واقعی حیرت انگیز بات
نہیں تھی؟ ہمارے ملک میں ہماری پولیس کو حادثے کے اس مقام سے دور رکھا گیا تھا جہاں ہمارا
اپنا صدر ہلاک ہوا تھا۔ امریکی عہدیداروں کو اجازت دے دی گئی مگر ایکواڈور کے تفتیشی افسروں
کو اجازت نہ مل سکی۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں۔

پھر میں نے انہیں بتایا کہ میں نے مارٹا کو ہماری ملاقات کے بعد بذریعہ ای میل رابطہ کرنے
کی کافی کوششیں کیں ”میں اس سے ہونے والی بات چیت کے مندرجات پر بحث کرنا چاہتا تھا اور
چاہتا تھا کہ اگر اس نے مزید کچھ بتانا ہے مگر اس نے جواب ہی نہیں دیا۔“

وہ ہنسے اور کہنے لگے ”وہ رابطہ نہیں کرے گی۔“ اس کے چچا جیمی رالڈاس کے بھائی لیون
صدر کا انتخاب لڑ رہے ہیں اور جب تم اس سے ملے تھے اس کے بعد وہ خود بھی سرکاری عہدہ کے

لئے امیدوار ہے۔ تم جانتے ہو اس کے والدین کے انتقال کے بعد وہ اور اس کا بھائی لیون کو اپنا
باپ مانتے ہیں۔ وہ سب اس حادثے سے خوفزدہ اور افسردہ تھے اور ہو سکتا ہے اب بھی ہوں۔ مارٹا
سے تمہاری اور تمہاری بیٹی کی ملاقات کے بعد ایکواڈور میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ میرا ملک
افراتفری کا شکار ہے۔ گوٹیریز کی جگہ اس کے نائب صدر پلاسیو نے لے لی ہے اور پلاسیو تضادات
کا آدمی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے کیا سوچتے ہیں۔ لیون اور مارٹا جیسے لوگ خوفزدہ ہیں۔
انہیں معلوم ہے کہ جیمی رالڈاس کے قتل کے پیچھے طاقتور عالمی مفادات سرگرم عمل ہیں اور اب وہ ان
چیزوں کے متعلق تم سے بات نہیں کرے گی۔“

باب نمبر: ۲۸

لاطینی امریکہ سے حاصل کردہ کچھ سبق

مجھے دسمبر ۲۰۰۶ء میں بولیویا آنے کی دعوت موصول ہوئی تھی۔ سینما لائبرا اسٹوڈیوز کے فلب ڈیاز اور بیتھ پورٹیلو نے مجھے غربت کے حوالے سے بننے والی دستاویزی فلم میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی۔ میں اس دورے میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ ایوو مورالیس کے عہدہ سنبھالنے کے بعد بولیوین عوام کے اس بارے میں کیا احساسات ہیں۔ میں نے مورالیس کے بہت سے انٹرویوز اور تقاریر پڑھی تھیں مگر اب میں قریب سے معلوم کرسکتا تھا کہ اس کے مخالفین اور حمایتی اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

اس دورے کے دوران میں ٹیکسی چلانے والے، دکاندار، بیرے، ہوٹلوں کے مالکان، بے زمین کسانوں، سابق کان کنوں، صدر سانچیز کو عہدہ سے ہٹانے کے لئے ہڑتالیں کرانے والوں سمیت مشہور اداکارہ کارلا اورٹیز سے بھی ملا تھا۔ کارلا مقامی آبادیوں کی سرگرمیوں میں کافی متحرک تھی اور اس کے علاوہ میری ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی تھی جس نے اپنے بھائی ایک فوجی کی گولی سے تکلیف دہ انداز میں ہلاک ہوتے دیکھا تھا۔ دستاویزی فلم کی تکمیل کے دوران میں نے مورالیس کے حمایتی سرکاری عہدیداروں، ناراض تاجروں اور ایک سابق صدر جو اب مورالیس کے لئے حزب اختلاف کا کردار نبھار ہے ہیں جارگ ''ٹوٹو'' کوٹیروگا رامیریز کے انٹرویو کیمرہ بند کئے تھے۔

یہ واضح تھا کہ نئے صدر کو ان گنت مسائل درپیش تھے۔ تجارتی اور اعلیٰ طبقے کے اکثریتی حلقے اس کی معاشی اور سماجی اصلاحات کو منسوخ کرانا چاہتے تھے۔ اس کے حمایتی بشمول مقامی آبادیوں کے ان تمام حکمت عملیوں کا خاتمہ چاہتی تھیں جن کی بنیادیں سالوں پہلے رکھی گئی تھیں۔ مجھے قطعاً کوئی شبہ نہ تھا کہ تمام تر مقامی دباؤ کے علاوہ مورالیس معاشی تباہ کاروں کی جانب سے رشوتوں اور دھمکیوں کا بھی نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ کرائے کے قاتل بھی اشارے کے منتظر ہیں۔

ایک دوپہر میں صدارتی محل میں تقریبی کمرے میں نائب صدر الوارو گارسیا لینیرا سے بات

چیت کررہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ اگرچہ مورالیس عوامی رائے منظر عام پر لایا ہے مگر پس منظر میں اس کا اصل محرک نائب صدر تھا۔ بڑے بڑے وعدوں اور باتوں کو مثبت حکمت عملیوں میں تبدیل کرنے والا یہ شاندار کمرہ میڈرڈ کے شاہی محل کا بھی ہوسکتا تھا۔ چھتیں دومنزلہ اونچی تھیں۔ تین منفرد بیٹھکوں کو اٹھارویں صدی کی فرانسیسی بارونق طرز کی کرسیوں، صوفوں اور ایرانی قالینوں سے سجایا گیا تھا۔ یہاں پر میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی تھی جس کی وجہ شہرت اس کا گوریلا جنگجو ہونا تھی اور جو قید میں اذیت ناک چار سال گزار چکا تھا اور جس ہال میں ہم ملے تھے وہ بادشاہوں کے لئے ترتیب دیا گیا تھا۔

نائب صدر گارسیا لینیرا کی شخصیت بھی اپنی شہرت سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ جسمانی طور پر کمزور آدمی تھا جس نے استری شدہ کالی پتلون، کالی قمیص جو کالر سے کھلی ہوئی تھی اور سلی ہوئی سیاہی مائل جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ باغی کی بندوق سے زیادہ پیانو کے لئے موزوں تھے۔

اس سے انتظامیہ کی حکمت عملیوں کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں گفت وشنید کرنے کے بعد ہم لوگ دیگر ملکوں کے لئے قابل تقلید مثال کا روپ اختیار کرنے کے لئے بولیویا کے کردار پر کرنے لگے۔ نائب صدر نے واضح طور پر کہا ''یا تو سب کو آزاد ہونا چاہئے یا پھر کوئی بھی آزاد نہ ہو۔'' میرے اور تمہارے ملک میں عوام کی بہتری کے لئے ہمیں یہ یقینی بنانا ہوگا کہ پوری دنیا مستحکم ہو۔'' اس نے '' سرمایہ دارانہ نظام کے بعد کی دنیا'' کا خاکہ پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق یہ ایک ایسی دنیا ہوگی جس کا بنیادی مقصد اس کے تمام شہریوں کے لئے خوشگوار زندگی فراہم کرنا ہوگا۔'' اب ریاستوں کو امیروں اور بڑی کارپوریشنز کے مفادات کا تحفظ پیش کرنا چاہئے۔ اس کو بشمول نہایت پسماندہ طبقے کے سارے عوام کی خدمت کرنی چاہئے۔''

بولیویا میں میرے قیام کے دوران ایک انٹرویو کے بعد دوسرے انٹرویو میں عوام کی یہی رائے سامنے آرہی تھی کہ جس طرح براعظم میں سیاسی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اس سے محسوس ہوتا ہے کہ چیزیں دوبارہ کبھی اتنی خراب نہ ہوں گی جتنی ماضی میں تھیں۔ ایک خاتون نے انٹرویو میں بتایا ''میں ایمارا کی تاریخ پر شرمندہ ہوا کرتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ ایوو نے ہم سب کو احساسِ تفاخر میں مبتلا کردیا ہے۔''

اس کے شوہر نے کہا ''ہم اب کبھی غلامی قبول نہیں کریں گے نہ تو ہسپانوی جاگیرداروں کی

اور نہ ہی امریکی کارپوریشنز کی۔ بہرحال ایک منفی پہلو بھی ابھرا تھا۔ مورالیس کے بہت سے حمایتیوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ واشنگٹن کے دباؤ تلے دب گیا ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا نہیں کیا ہے۔ ایک بات جو بار بار انکار کرتے تھے ''یہ شاویز نہیں ہے'' اس کے مخالفین کہتے تھے کہ وہ وینزویلا کے صدر کا قرب حاصل کرتا جارہا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ مورالیس اپنے آپ کو ان تمام مقاصد کا بنیادی کردار ثابت کرتا جارہا ہے جن کا اعادہ شاویز نے براعظم کی قیادت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ ایک نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''پہلے بولیویا، پھر ایکواڈور، اس کے بعد پیرو اور کولمبیا۔ شاویز پورے جنوبی امریکہ کی گیس اور تیل پر دسترس چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جدید دور کا بولیور ہے۔''

میں نے نئے سال کا جشن صدارتی محل میں منایا تھا۔ ایو مورالیس آدھی رات سے کچھ پہلے ٹہلتا ہوا داخل ہوا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ۲۰۰۷ء کا استقبال اپنے نئے منصوبوں کے اعلان کے ساتھ کرے گا۔ وہ جیسے ہی ٹیلیویژن کیمروں کے سامنے آیا میں نے اس شاندار عمارت پر ایک نظر ڈالی اور پریس کے ارکان کی طرف دیکھا جس میں برطانیہ کے رسالہ اکانومسٹ کی ایک خاتون صحافی، ایسوسی ایٹڈ پریس کا امریکی نمائندہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے صحافی تھے۔ مورالیس تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیسا محسوس کررہا ہوگا وہاں اکیلا کھڑا ہوا۔ ایک ایسا شخص جو نہایت متوسط طبقے کی پیداوار تھا اور آج پوری دنیا کے لئے شہ سرخیوں کا باعث بنا ہوا۔ ایک چیز یقینی تھی کہ صدارت......اس کے لئے آسان نہ ہوگا۔

۲۰۰۷ء کے آغاز پر لاپیز سے میامی جاتے ہوئے ۱۹۹۲ء میں گوئٹے مالا میں ہسپیے جیرامیلو کے ساتھ گزرے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندازے کے برعکس وہ تمام حالات اب کافی اہمیت اختیار کرچکے تھے۔ میں وہاں امریکی کارپوریشن کے نمائندے کی حیثیت سے گیا تھا تاکہ مایانی وسائل کا استحصال کرنے کے مواقع کا جائزہ لے سکوں مگر میں ان دنوں ایک غیر منافع بخش تنظیم کے لئے بھی کام کررہا تھا جو مایان کی زمینوں کا تحفظ اور ان کی ثقافت کی بقاء کے سلسلے میں کام کررہی تھی۔ میں اپنی دہری ذمہ داریوں کے بارے میں زیادہ اطمینان محسوس نہیں کرتا تھا اور نہ ہی میں اپنی زندگی کے تضادات کو سمجھ پاتا تھا جو بالکل میرے ملک کے رویوں کے آئینہ دار تھے۔

بولیویا سے واپسی کی اس پرواز پر اس دور کی طرح میں اس تہذیب کی طرف لوٹ رہا تھا

جس کی تعلیمات انسانی حقوق کا درس دیتی تھی اور ساتھ ہی اس مادہ پرستی کے بھی مزے لوٹتی تھی جس کی بنیادیں دوسرے ملکوں کے مزدوروں کے استحصال پر رکھی گئی تھیں۔ میں ایک ایسی قوم کا حصہ تھا جو دنیا کی کل آبادی کا پانچ فیصد ہے مگر اس کے ۲۵ فیصد وسائل کو استعمال کرتی ہے۔ ماحولیاتی اصولوں کی حمایت کرتی ہے مگر دنیا کی بدترین ماحولیاتی آلودگی کے ۳۰ فیصد سے زائد کا باعث بنتی ہے۔ میں جس جہاز میں سفر کررہا تھا وہ کسی دوسرے ملک سے حاصل کیا گیا ہوگا میرے کپڑے سویٹ شاپس میں تیار ہوئے ہوں گے۔ میری زندگی بالکل تصویر کی مانند تھی جس کو شوار کے علاقے میں آباد ایک بزرگ آدمی نے اس وقت بنایا تھا جب میں ۱۹۹۱ء میں ایہود اسیرلنگ کے ساتھ اس علاقے میں آیا تھا اور اس نے کہا تھا ''تم لوگ بڑی فیکٹریوں، اونچی عمارتوں اور دریا میں موجود پانی کے قطروں کے برابر گاڑیوں کے خواب دیکھتے ہو مگر اب تمہیں لگ رہا ہے کہ تمہارے خواب ایک بھیانک حقیقت ہیں۔''

۱۹۹۲ء میں پیپے نے مقامی آبادیوں سے خوف کا اظہار کیا تھا۔ اگلے دو عشروں نے اس کے اندیشوں کو درست ثابت کردیا ہے۔ بارانی جنگل میں ملنے والے بوڑھے آدمی نے مستقبل کی ایک جھلک پیش کی تھی۔ جب میں نے اس سے اس بربادی کو روکنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس نے کہا تھا ''بہت آسان ہے۔ اب تم لوگوں کو صرف تبدیلی کا خواب دیکھنا ہے۔ تم لوگوں کو نیا بیج بونا ہوگا۔ اپنے بچوں کو نئے خواب دیکھنے کا طریقہ بتانا ہوگا۔''

لاطینی امریکہ کے لوگوں نے اس تصور کو سنجیدگی سے لینا شروع کردیا ہے۔ مقامی آبادیوں، دیہی غریبوں اور شہری کیمپسینوز کی قیادت میں ان لوگوں نے اس تبدیلی کے خواب کو حقیقت میں بدلنا شروع کیا تھا۔ انہوں نے اپنی تہذیبوں اور زمینوں کے تحفظ کی تحریکوں کا آغاز کردیا ہے۔ انہوں نے ماضی کے آمروں کو برطرف کرکے ان کی جگہ ایسے سربراہان کو منتخب کیا ہے جنہوں نے مقامی وسائل کو لوگوں کی بھلائی کیلئے استعمال کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور ایک الگ ڈھنگ سے ہمیں اپنے ملک امریکہ میں اپنے آپ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ کارپریٹوکریسی کو ناراض کرکے انہوں نے ہماری توجہ، ہماری بداعمالیوں کی جانب کرائی تھی۔ انہوں نے ایک قابل تقلید مثال پیش کی تھی۔

اس کے علاوہ لاطینیوں نے کچھ اور بھی کیا تھا اور وہ انہوں نے ریوگرانڈے کے جنوب میں نہیں بلکہ ہمارے درمیان امریکہ میں کرکے دکھایا تھا۔ ہم سب امریکی پنشن، تعلیم، سماجی تحفظ

صحت کی رقوم میں کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ عراق جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات پر پریشانی کا اظہار کرتے ہیں اور نیو اورلینز میں حکومتی غداری کی مذمت کرتے ہیں لیکن شکایتیں کرنے کے بجائے لاطینی باشندوں نے سکونت پذیری کے غیر منصفانہ قوانین پر احتجاج کرنے کے لئے سڑکوں پر آنے کو ترجیح دی۔ ہم اپنے گھروں میں بیٹھے حکومت کی بے حسی پر کڑھتے رہتے ہیں اور چینل پر چینل بدلتے رہتے ہیں اور کچھ عمل نہیں کر پاتے مگر انہوں نے ان حقوق کو استعمال کیا جو انہیں آئین نے عطا کئے تھے۔ وہ چیختے چلاتے واشنگٹن ڈی سی کی سڑکوں پر آ گئے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ ان کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں آپ کو ان کے مطالبات پر توجہ دینی ہوگی اور ان کی ہمت اور تبدیلی لانے کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔

وسطی ایشیاء کے عوام بھی تبدیلی لانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اگرچہ اس تسلط سے لڑنے کا ان کا طریقہ کار لاطینی امریکہ کے رویے سے بنیادی طور پر حد درجہ مختلف ہے۔

(حصہ دوئم کا اختتام)

دیوالیہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ

پیٹرولیم اکیسویں صدی کے پہلے حصے میں تاریخ کا سب سے قیمتی وسائل بن کر ابھرا ہے۔ وہ ترقی کے پہیئے کو چلائے رکھنا کا سب سے بڑا جواز ہے، قابل اعتماد وسائل کا حصول خارجہ پالیسی کا مرکزی نکتہ بنتا جا رہا ہے۔ پرل ہاربر پر حملہ کرنے کے فیصلہ میں جاپان کی تیل کی ہوس کا عمل دخل تھا۔ جنگ عظیم دوئم نے تیل کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ کر دیا تھا۔ تیل ٹینک چلاتا تھا، بحری اور ہوائی جہاز اس کے محتاج تھے اور اس وقت تیل کے بغیر کوئی بھی جنگی ملک برباد ہو سکتا تھا۔

تیل کارپریٹوکریسی کا بھی سب سے اہم ہتھیار کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد امریکی تیل کی کمپنیوں کے فیصلہ سازوں نے ایک ایسا منصوبہ ترتیب دیا تھا جو تاریخ کا رخ بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ان کے اپنے اور ملک کے بہترین مفاد میں ہے کہ صدر اور کانگریس تیل کے امریکی ذخائر کو مستقبل کی جنگوں اور آفتوں کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ تیل کے مقامی کنویں کھودنے کی کیا ضرورت جب وہ دوسرے براعظموں کے وسائل کا استحصال کر سکتے ہیں؟ برطانوی اور دیگر یورپی کمپنیوں کے اشتراک سے انہوں نے حکومتوں کو انہیں ٹیکس میں رعایت دینے اور دیگر کئی ایسی سہولیات دینے کے لئے تیار کر لیا کرتے کہ جن کے بغیر وہ تیل کے عالمی ذخائر پر مکمل قابو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

اس فیصلے کی تائید اس وقت سے لے کر آج تک تمام صدور اور کانگریس نے کی ہے جس کی وجہ سے کئی بار عالمی حدود کا نقشہ تبدیل ہوا، سلطنتیں تعمیر کی گئیں اور حکومتیں زوال پذیر ہوئیں۔ سونے کی طرح تیل بھی طاقت کی علامت بن گیا اور کرنسیوں کی قدر و قیمت کے تعین کا بھی معیار مانا جانے لگا جبکہ سونے کے برعکس وہ جدید ٹیکنالوجی کی انتہائی اہم ضرورت تھا جیسے کہ پلاسٹک، کیمیکلز اور کمپیوٹر کے کاروبار وغیرہ۔

شروع شروع میں ایسا محسوس ہوا جیسے تیل کے عہدیداران کے فیصلے تیسری دنیا کے ممالک پر دولت کی بارش کر دیں گے جبکہ سونے کی طرح تیل بھی ایک مجبوری بن چکا تھا۔ تیل سے مالا مال ملکوں کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے پرانے مغرب کے امیر قصبے کو معدنیات ڈھونڈنے وال

کی جیسی تھی کہ جیسے ہی انہوں نے ملکیت کے دعوے دائر کیے چوروں اور لٹیروں نے ان پر دھاوا بول دیا۔

لگ بھگ عین اسی وقت سوویت یونین کو عوام دشمن کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ جس وقت تیل دنیا کی سب سے بڑی قوت کے طور پر منظر عام پر ابھر رہا تھا مؤرخین اس بات کے گواہ ہیں کہ بڑی سلطنتوں کے معماروں کو بیرونی خطرات کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ سوویت یونین نے امریکہ کے لئے یہ کردار بخوبی اور باآسانی نبھادیا تھا۔ ماسکو کے نیوکلیئر ذخائر نے کارپریٹوکریسی کے ان دعوؤں کو سچ ثابت کر دیا تھا کہ سرد جنگ میں کامیابی کے لئے سفارت کاری کے نت نئے طریقوں کی ضرورت پڑے گی۔

اور یہ بات قطعاً حیران کن نہیں تھی کہ سرد جنگ کا تیل کے سلسلے میں پہلا اصل معرکہ دنیا کے اس حصے مشرق وسطیٰ میں وقوع پذیر ہوا جو تیل کے ذخائر سے مالا مال تھا۔ اپنے علاقوں سے حاصل ہونے والے تیل کے منافع میں حصہ کا مطالبہ کرتے ہوئے جمہوری منتخب اور نہایت مقبول ایرانی وزیراعظم محمد مصدق (۱۹۵۱ء میں ٹائم میگزین کے ''مین آف دی ایئر'') نے برٹش پیٹرولیم کمپنی کے اثاثے قومیا لئے تھے۔ بپھرے ہوئے برطانیہ نے اپنے جنگ عظیم دوئم کے حلیف امریکہ کی مدد چاہی۔ دونوں ممالک کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ عسکری قوت کا استعمال سوویت یونین کو ایٹمی صلاحیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ فوج کے بجائے واشنگٹن نے سی آئی اے ایجنٹ کرمٹ روز ویلٹ جونیئر کو روانہ کر دیا (تھیوڈور روز ویلٹ کا پوتا) چند لاکھ ڈالر کے عوض روز ویلٹ نے پرتشدد مظاہروں کا انتظام کیا جس کے نتیجے میں مصدق کو حکومت چھوڑنا پڑی اور جمہوری طور پر منتخب صدر کی جگہ سی آئی اے نے محمد رضا پہلوی (شاہ ایران) کو سند اقتدار پر بٹھادیا جو بگ آئل کا جابر مزاج دوست تھا۔

جیسے کہ ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' میں ذکر کیا گیا تھا کہ روز ویلٹ کی کامیابی نے ایک نیا پیشہ متعارف کرادیا تھا جسے بعد میں میں نے بھی اپنایا، ایران سے حاصل ہونے والے سبق واضح تھے کہ سلطنت کی تعمیر جنگوں کا خطرہ مول لئے بغیر نسبتاً کم اخراجات میں ممکن ہے۔ سی آئی اے کے حربے ان تمام علاقوں میں استعمال ہوسکتے تھے جہاں کارپریٹوکریسی کے من پسند وسائل موجود ہوں، صرف ایک مسئلہ تھا۔ کرمٹ روز ویلٹ سی آئی کا ملازم تھا اور اگر وہ پکڑا جاتا تو اس کے بھیانک نتائج برآمد ہوسکتے تھے۔ تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری اہلکاروں کی جگہ نجی شعبے کے پرکاروں

کو استعمال میں لایا جائے گا۔ ایسے ہی ایک ادارے کا نام ''مین'' (Main) تھا۔

بہت جلد ہم معاشی تباہ کاروں کو احساس ہوگیا تھا کہ ہمیں اس بات کا انتظار کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی کہ وہ ممالک تیل کے کنوؤں کو قومیائے اور پھر ہم اپنی چالوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ہم نے عالمی بینک، آئی ایم ایف اور دیگر ملٹی نیشنل اداروں کو نوآبادیاتی علاقے تعمیر کرنے کیلئے استعمال کیا۔ ہم نے امریکی کارپوریشنز کے لئے فائدہ مند معاہدے حاصل کئے، ہم نے آزاد تجارت کے معاہدے شروع کر کے تیسری دنیا کے برآمدکنندگان کو نقصان پہنچا کر اپنے برآمدکنندگان کو فائدہ پہنچایا اور دوسرے ملکوں کو بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دبا ڈالا تھا۔ دراصل ہم نے ایسی ماتحت حکومتوں کو جنم دیا جو دنیا کے لئے اپنے عوام کے مفادات کا تحفظ کرتی دکھائی دیتی تھیں مگر اصلیت میں ہماری غلام تھیں۔ کچھ مثالوں میں ایران، اردن، سعودی عرب، کویت، مصر اور اسرائیل شامل تھے۔

معاشی تباہ کاروں کی عالمی سیاست پر تسلط بڑھانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ کارپریٹوکریسی نے تیل کا استعمال بڑھانے کے لئے نت نئی مہموں کا آغاز کر دیا تھا۔ منشیات کے تاجروں کی طرح عوامی رابطے کے ماہرین پورے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے تھے جو لوگوں کو کارپوریشنز کی بنائی ہوئی ان مصنوعات کو استعمال کرنے کے لئے اکساتے تھے جن کی تیاری میں تیل زیادہ استعمال ہوتا تھا پھر وہ تیسری دنیا کے سویٹ شاپس کے کربناک حالات میں تیار کی جاتی تھیں۔

ایرانی بغاوت کے بعد گزرنے والے عشروں کے دوران معاشی ماہرین غربت کے خاتمے کے ثبوت کے طور پر معاشی ترقی کی مثالوں کو پیش کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ جیسے ہم نے ایشیاء میں دیکھا کہ اعداد گمراہ کن تھے۔ دگرگوں سماجی اور ماحولیاتی حالات کو نظرانداز کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اعدادوشمار دوررس مسائل کے حل بھی پیش نہیں کرپاتے تھے۔

روز ویلٹ کی ایرانی مہم جوئی کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اس دگرگوں صورتحال کی منہ بولتی مثال تھے۔ اس بغاوت کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ ایک تیل فراہم کرنے والا آمر دوست منظر عام پر آ گیا ہو مگر ساتھ ہی مشرق وسطیٰ میں امریکن مخالف تحریکوں نے بھی جنم لے لیا تھا۔ ایرانی امریکہ کی جمہوری طور پر منتخب مقبول وزیراعظم کو برطرف کئے جانے والی حرکت کو کبھی معاف نہیں کرپائے تھے اور نہ ہی پڑوسی ملکوں میں اس حکمت عملی کو قابل قدر نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ سیاسی تاریخ کے مفکرین اکثر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ کون سا آسمان گر پڑتا اگر واشنگٹن

مصدق کی حمایت کرتا اور تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ایران کے عوام کے حالات بدلنے میں صرف کرنے کے مقصد میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا۔ کچھ کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس حوصلہ افزائی کی صورت میں دیگر کئی اور ممالک بھی جمہوریت کے لئے کوششیں کرتے اور اس خطے میں برپا تشدد کو ختم کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کرتے۔ بجائے اس کے کہ ایسے رویوں کی پشت پناہی کی جاتی امریکہ نے یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ ایک ناقابل اعتبار ملک ہے اور جمہوریت کے دفاع کے سلسلے میں ہرگز سنجیدہ نہیں ہے جیسا کہ اپنے آپ کو پیش کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ ہمارا مقصد تیسری دنیا کی مدد کرنا ہرگز نہیں ہے۔ ہم صرف وسائل کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

اسی عرصے کے دوران امریکہ کو داخلی محاذ پر بھی بے تحاشا مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کارپوریٹوکریسی کے اثر ورسوخ کو وسعت دینے کی کوششوں کے نتیجے میں ہماری قوم قرضوں کے شکنجے میں جکڑتی جا رہی تھی۔ زیادہ تر ایسے کارخانے جو ہماری مصنوعات تیار کرتے تھے اور ساتھ ساتھ تیل کے کنوئیں بھی دوسرے ممالک میں واقع تھے۔ غیر ملکی قرض خواہوں کا مطالبہ تھا کہ انہیں ادائیگی سونے کی صورت میں کی جائے۔ نکسن انتظامیہ نے اس مسئلے کا یہ حل سوچا کہ سونے کے معیارات کو ختم کر دیا جائے۔

لیکن اب واشنگٹن کو ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ اگر آپ کے قرض خواہ دوسری کرنسیوں کا رُخ کرتے ہیں تو اس صورت میں کارپوریٹوکریسی کو مجبوراً سونے کے اس معیار کے حساب سے قرضے چکانے ہوں گے جو قرضے لیتے وقت قابل عمل تھے، یہ تباہ کن ہو سکتا تھا کیونکہ کارپوریٹوکریسی کے ذخائر میں اتنی دولت موجود نہیں تھی کہ وہ قرضے ادا کر سکیں۔ اس سلسلے میں ایک واحد راستہ جو امریکہ کو دیوالیہ ہونے سے روک سکتا تھا وہ تھا امریکی زرکثیر جو ڈالرز چھاپنے اور اس کی قدر طے کرنے کی صلاحیت پر منحصر تھا۔ اب یہ لازم تھا کہ دنیا ڈالر کو ہی طاقتور اور قابل اعتماد کرنسی کے طور پر استعمال کرتی رہتی۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں میں نے سعودی عرب کے گرد گھومتے حل کو مختصراً بیان کیا ہے۔ یہ اس کا مختصراً بیان ہے۔ طوالت سے بیان کئے گئے حل میں مشرق وسطیٰ میں واقع ان دو حلیفوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ان حالات میں نادانستہ طور پر امریکہ کی مدد کرنے آگے بڑھے تھے۔

باب نمبر: ۳۰

ڈالر بادشاہ

مین (Main) کے صدر جیک ڈاؤبر نے ۱۹۷۱ء کے سونے کے معیارات کی تنسیخ کے تاریخی فیصلے کے کچھ عرصے بعد بڑے ڈرامائی انداز میں پوچھا ''تو پھر ڈالر کا کیا ہوگا؟'' پھر خود ہی جواب میں بولا ''میرا خیال ہے اس کی قدر تیل سے طے کی جائے گی۔''

دراصل مجھے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل انڈونیشیا ڈاؤبر کے ساتھ رات کے کھانے کی دعوت دی گئی تھی جہاں پر یہ لوگ مشرق وسطیٰ کے سفر کے دوران اکثر رکا کرتے تھے۔

''نکسن کو کسنجر، شولٹز اور ڈک چینی کی صورت میں بڑے عمدہ لوگ میسر ہیں۔'' جیک نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ''میں اس دن کے بارے میں اکثر سوچا کرتا ہوں جب میں اور تم اپنے آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہم اس شاندار مہم کا حصہ تھے۔ امریکہ دنیا کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کرنے جا رہا ہے اور ہمیں اگلی چند نشستوں پر بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔''

جیک کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ سکا۔ اس دورے کے کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کا متبادل اس کا ماتحت برونو زامبوٹی بن گیا۔ بہرحال ڈالر کے مستقبل کے بارے میں اس کا تجربہ درست ثابت ہوا تھا۔ نکسن کے لوگ صرف عمدہ ہی نہ تھے بلکہ نہایت عیار بھی تھے۔

ڈالر کی طاقت کو تحفظ دینے کی واشنگٹن کی کوششوں میں اس کا پہلا حلیف اسرائیل تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جن میں کئی اسرائیلی بھی شامل ہیں کہ تل ابیب کی سرحد پر تعینات مصر، شام اور اردن کے حملوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی سرحدوں کے تحفظ کو یقینی بنانا چاہتا تھا (اس جنگ کو ۱۹۶۷ء کی چھ دن طویل جنگ کہا جاتا ہے) علاقائی وسعت تو ایک ممکنہ نتیجہ تھا ہی جیسے کہ اس خونی ہفتے کے اختتام پر اسرائیل نے مشرقی یروشلم، مغربی پٹی کے حصے، مصر کا سینائی اور شام کے گولان ہائٹس کے لوگوں کی پریشانی کے عوض اپنے زمینی رقبے میں چار گنا اضافہ کر لیا تھا۔

عرب اپنے علاقوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر شدید غم وغصے کی حالت میں تھے۔ وہ دراصل امریکہ سے ناراض تھے، انہیں معلوم تھا کہ اسرائیل اتنی بڑی کامیابی امریکہ کی معاشی اور

سیاسی حمایت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں تھی کہ امریکہ نے یہ بتا دیا تھا کہ ہمارے دستے بھی ہر طرح کی صورتحال کے لئے تیار ہیں اگر غلطی سے اسرائیل کو ان کی ضرورت پڑ گئی بہت کم عربوں کو یہ اندازہ تھا کہ واشنگٹن کے اسرائیلی سرزمین کو تحفظ دینے کے علاوہ بھی گھناؤنے عزائم ہیں یا یہ کہ وہائٹ ہاؤس عربوں کے حصے کو اپنے حق میں استعمال کرے گا۔

نکسن کا دوسرا اور غیر معمولی حلیف پورا اسلامی مشرق وسطیٰ تھا۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ کے جواب میں مصر اور شام نے ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بیک وقت اسرائیل پر حملہ کر دیا تھا (یام کپیر، یہودیوں کے مقدس دن کے موقع پر) یہ جانتے ہوئے کہ جغرافیائی لحاظ سے سعودی عرب غیر محفوظ ہے۔ مصر کے صدر انور سادات نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل پر امریکہ اور اسرائیل پر ایک نئے ڈھنگ سے حملہ کرنے کے لئے دباؤ بڑھایا جس کو اس نے ''تیل کا ہتھیار'' کا نام دیا تھا۔ ۱۶ اکتوبر کو سعودی عرب اور خلیج فارس کے چار اور عرب ممالک نے تیل کی طے شدہ قیمتوں میں ۷۰ فیصد اضافے کا اعلان کر دیا تھا۔ ایران جو ایک مسلم فکر غیر عرب ریاست تھی وہ اسلامی یکجہتی کے لئے اس اتحاد کا حصہ بن گئی۔ اگلے چند دنوں کے دوران عرب ممالک کے تیل کے وزراء نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ امریکہ کو اسرائیل کی حمایت کرنے کی سزا دی جانی چاہئے اور انہوں نے تیل کی برآمد پر پابندی لگانے کی تجویز کی حمایت کر دی۔

یہ سیاسی شطرنج کا ایک دلچسپ کھیل تھا۔ صدر نکسن نے ۱۹ اکتوبر کو اسرائیل کی امداد کے لئے کانگریس سے ۲۰۲ بلین ڈالر کا مطالبہ کر دیا۔ اگلے ہی دن سعودی عرب کی قیادت میں تیل پیدا کرنے والے تمام عرب ممالک نے امریکہ کو تیل کی ترسیل پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ اس وقت بہت کم لوگوں کو امریکہ کی اس حکمت عملی کے پیچھے چھپی عیاری کا اندازہ تھا یا اس حقیقت کا علم تھا کہ اس سارے کھیل کا اصل مقصد کمزور پڑتے ڈالر کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔

سنگین اثرات رونما ہونے لگے۔ سعودی تیل کی قیمت فروخت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ یکم جنوری ۱۹۷۴ء تک اس کی قیمت چار سال پہلے کی قیمت سے تقریباً سات گنا بڑھ چکی تھی۔ میڈیا نے آگاہ کیا تھا کہ امریکی معیشت بیٹھ سکتی ہے ملک بھر میں گیس اسٹیشنز پر گاڑیوں کی طویل قطاریں لگی رہتی تھیں جبکہ ماہرین معاشیات ۱۹۲۹ء کے طرز کے کساد بازاری کے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے۔ تیل کے ذخائر کا تحفظ کرنا ہماری اوّلین ترجیح تھی لیکن اچانک یہ جنون کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

آج ہم اس بات سے واقف ہیں کہ تیل کو اس کی بلند ترین سطح پر لانے میں کارپریٹوکریسی نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر تجارتی اور سیاسی رہنما بشمول تیل کی کمپنیوں کے عہدیداران غصے کا اظہار کرتے رہے تھے مگر دراصل یہی اس پتلی تماشے کے اہم کردار تھے۔ نکسن اور اس کے مشیروں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اسرائیل کے لئے ۲۰۲ بلین ڈالرز کا امدادی پیکیج عربوں کو اس قدر ناراض کر دے گا کہ وہ سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسرائیل کی بھی حمایت کر کے انتظامیہ نے ایسی صورتحال پیدا کر لی تھی جس کے نتیجے میں اکیسویں صدی کا سب سے اہم اور خطرناک معاہدہ عمل میں آ گیا تھا۔

امریکی وزارت خزانہ نے مین (Main) اور دیگر ایسے اداروں سے رابطہ کیا جو کارپریٹوکریسی کے حمایتیوں کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ہمارے ذمہ لگائے گئے کام کے دو پہلو تھے ایک تو یہ تھا کہ ایسی حکمت عملی ترتیب دی جائے جو اس بات کو یقینی بنائے کہ اوپیک اس تمام دولت کو واپس امریکی کارپوریشنز تک پہنچائے جو ہم تیل پر خرچ کیا کرتے تھے اور دوسری ذمہ داری یہ بتائی گئی تھی کہ سابق سونے کے معیارات کی جگہ تیل کے معیارات کو نافذ کیا جائے۔ ہم معاشی تباہ کار جانتے تھے کہ کسی بھی ایسے منصوبے میں سعودی عرب کا کردار نہایت اہم ہوگا کیونکہ وہاں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ تیل کے ذخائر موجود تھے پھر اسے اوپیک پر مکمل دسترس حاصل تھی اس کے علاوہ سعودی شاہی خاندان نہایت بدعنوان اور آسانی سے لالچ کا شکار ہو سکتا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح سعودی عرب بھی نوآبادیاتی طرز کی سیاست سے واقف تھے کیونکہ شاہی خاندان کو بادشاہت برطانیہ نے عطا کی تھی۔

اس حکمت عملی کی تمام تفصیلات جن میں سے ایک سعودی عرب منی لانڈرنگ کا معاملہ تھا جس کا ذکر میں نے ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' میں کیا تھا مختصراً اس کی چند تفصیلات میڈیا کے مطابق ایسی تھیں کہ سعودی خاندان تین اہم شرائط مان گئے تھے۔ (۱) تیل سے کمائے جانے والے ڈالرز امریکہ کی سرکاری سیکورٹیز میں لگایا جائے گا۔ (۲) امریکی وزارت خزانہ کو اس بات کی اجازت دی جائے گی کہ ان سیکورٹیز سے حاصل ہونے والے کھربوں سود کی رقم کو سعودی عرب کی ترقی کے لئے صرف کی جائے گی اور اس مقصد کے لئے امریکی کارپوریشنز کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ (۳) تیل کی قیمتوں کو کارپریٹوکریسی کی قابل قبول حدوں تک محدود رکھا جائے گا اور اس سب کے عوض امریکی حکومت نے سعودی شاہی خاندان کو حکمرانی کا پورا موقع فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک معاہدہ اور یہ بھی کیا گیا تھا جو شہ سرخیوں میں تو جگہ نہ بنا سکا مگر وہ کارپریٹوکریسی کی ڈالر کو قابل قبول عالمی کرنسی کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی ضرورت کیلئے نہایت اہم تھا۔ سعودی عرب تیل کی تمام خرید وفروخت صرف اور صرف امریکی ڈالر میں کرنے کیلئے پرعزم تھا۔ قلم کے ایک جھٹکے سے ڈالر کی طاقت کو نئی زندگی فراہم کردی گئی تھی۔ سونے کی جگہ تیل کرنسی ناپنے کا پیمانہ بن چکا تھا۔

جیسا کہ میں نے پیش لفظ میں ذکر کیا ہے کہ ایک اور فائدہ جس کو صرف مشاق ماہر معاشیات قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کے ذریعے واشنگٹن غیر ملکی قرض خواہوں پر پوشیدہ ٹیکس عائد کرنے کا سلسلہ برقرار رکھ سکا تھا کیونکہ ڈالر بہت طاقتور ہوگیا تھا۔ اس لئے ہم ان کی مصنوعات اور خدمات قرض پر خریدا کرتے تھے۔ جس وقت وہ اس پیسے سے تیل اور دیگر مصنوعات کو دیگر اداروں سے خریدتے تھے اس وقت تک افراط زر کی وجہ سے ان کے ذخائر کی مالیت زوال پذیر ہو چکی ہوتی تھیں۔ دونوں رقموں کا فرق کارپریٹوکریسی کو نقد صورت میں مل جایا کرتا تھا جو ایک ایسا ٹیکس تھا جو ٹیکس جمع کرنے والوں کے بغیر ہی جمع ہو جایا کرتا تھا۔

جیک ڈاؤبر کی وہ پیشین گوئی درست ثابت ہوگئی تھی کہ ڈالر کی قدر تیل سے ناپی جائے گی۔

جب تل ابیب اور واشنگٹن نے انہیں دیوار سے لگادیا تھا تو عربوں کے پاس سوائے جارحیت کے اور کوئی حربہ نہیں بچا تھا اور اس وجہ سے انہوں نے یام کپور جنگ اور تیل کی تجارت پر پابندی لگائی تھی۔ اس رویے کے ردعمل میں امریکی وزارت خزانہ حرکت میں آیا تھا۔ معاشی تباہ کاروں کو سعودی عرب کے ساتھ مل کر ایسا معاہدہ تشکیل دینے کا کام دیا گیا جس کے ذریعے ڈالر کو تیل سے منسلک کردیا گیا۔ ڈالر کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور وہ آج تک حکومت کررہا ہے۔

سعودی عرب منی لانڈرنگ افیئر نے علاقے کی جغرافیائی سیاست کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے سوویت یونین کو برباد کرنے، امریکہ کی بالادستی کو مسلمہ حیثیت دینے اور ۹/۱۱ کے منصوبہ ساز سعودی ارب پتی اسامہ بن لادن کو اشتعال میں لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اب میں ماضی کی جانب دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ہماری آنکھوں پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ قسمت ہماری زندگیوں میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور ہمارا ردعمل بھی مستقبل متعین کرتی ہے اور میں اس جیسی مشکل ذمہ داری کبھی نہ نبھا سکتا تھا اگر مجھے وہ تربیت نہ حاصل ہوتی جو میں نے چند سال پہلے لبنان میں حاصل کی تھی۔

باب نمبر:۳۱

ساز باز کرنے والی حکومتیں

انڈونیشیا میں پہلی دفتری ذمہ داری کے دوران میں نے اپنے افسران کو دکھا دیا تھا کہ میں وہ خوش نما اور بلند وبالا معاشی تجزیے بنانے کے لئے تیار ہوں جن کی ان کو ضرورت اور خواہش تھی۔ بدلے میں انعام کے طور پر مجھے ماہرین معاشیات کا سربراہ مقرر کردیا گیا تھا (جبکہ میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں صرف گریجویٹ تھا اور اس وقت ادارے کا اکیلا ماہر معاشیات تھا) تنخواہ میں اضافہ کیا گیا تھا اور مشرق وسطیٰ مزید معاملات دیکھنے کے لئے روانہ کردیا گیا تھا۔

میں اس سے پہلے ایران، کویت اور سعودی عرب کے متعلق تجزیے تحریر کرچکا تھا مگر میری تمام تحقیق لائبریریوں اور بوسٹن میں ہمارے لئے کام کرنے والے ان ملکوں کے باشندوں سے ملاقات کے دوران اخذ کئے گئے نتائج پر مبنی تھی۔ یہ پہلا مختصر دورہ دراصل ایران کو قریب سے جاننے اور اس کے توانائی کے شعبے کے بارے میں سیر حاصل تجزیہ مرتب کرنے کیلئے تھا۔ انڈونیشیا میں میرے پراجیکٹ منیجر چارلی النگورتھ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں دو دن کیلئے بیروت میں ضرور رکوں۔ اس وقت تک بیروت ایک بہترین تفریحی مقام کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ چارلی نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ بیروت پرسکون ہونے کیلئے بہترین جگہ ہے اور اس دوران دو خطوں کے درمیان وقتوں کے فرق سے ہم آہنگ ہوسکتا تھا اور میں مشرق وسطیٰ کے ماحول سے آشنا ہو پاؤں گا۔ وہ بیروت کی سفارت خانے میں کسی سے واقف تھا جو مجھے شہر بھی گھما پھرا سکے گا۔

جنگِ عظیم دوئم کے بعد لبنان سونے کی کان بن چکا تھا۔ زرعی اور چھوٹے درجے کی صنعتوں نے کافی ترقی کی تھی۔ بیروت ایک نہایت دولت منداور وسیع المشرب شہر بن کر ابھرا تھا۔ یہ مشرق وسطیٰ کی تجارت اور بینکاری کا مرکز تھا۔ اپنی روانگی سے پہلے میں نے اس ملک کے بارے میں کچھ مواد کا مطالعہ کیا تھا اور مجھے یہ جان کر تجسس محسوس ہوا تھا کہ اکثر جگہ اس کا موازنہ سوئٹزرلینڈ اور پیرس سے کیا جاتا تھا۔ میں یہ جان کر بہت حیران ہوا تھا۔ دریائے نیل کا وہ ایک ایسا شہر تھا جس کا تصور میں نے ریگستان کے کنارے بیٹھ کر کیا تھا۔ اس کی رقص گاہیں اور آرٹ گیلریز پیرس سے مقابلے کی تھیں۔

میں نے لبنان کی تنگ و تاریک تاریخ کے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ ماضی سے ہی ایسا پراسرار سا تھا جو گزرتے ہر لمحے کے ساتھ مزید اسرار انگیز ہوتا جا رہا تھا۔ مذہبی فرقوں کے درمیان کشیدگی صدیوں سے سلگ رہی تھی۔ ساحلی علاقوں پر میرونائٹ عیسائیوں کی حکمرانی تھی۔ دروزی فرقہ جنوبی پہاڑوں پر قابض تھا جبکہ روایتی سنی فرقہ زرخیز وادی بیکا پر حکومت کرتے تھے۔ زیادہ تر میرونائٹ مصری تھے جس کی وجہ سے عرب مسلمانوں میں زیادہ بے چینی پائی جاتی تھی۔ ان تمام اچھوتی خوبیوں کے باوجود مجھے لبنان مشرق وسطیٰ کا عالم اصغر محسوس ہوتا تھا۔

یورپ نے لبنان پر صلیبی جنگوں کے دور سے نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ اس کو اپنی بستی بنانے کی کوششیں صدیوں سے جاری تھیں۔ عیسائی آبادیوں کے تحفظ کا دعویٰ کرتے ہوئے فرانسیسیوں نے ۱۷۰۰ء کے اوائل میں اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ پیرس نے مخصوص حاکمانہ انداز میں اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی اور ۱۸۰۰ء کے دوران کئی بار اپنے دستوں کو یہاں روانہ کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں لبنانی جمہوریت کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس کا انتظام مصر کے فرانسیسی منشور کے مطابق چلاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں بیروت کے فرانسیسی حکمرانوں نے نازیوں کے زیر اثر وچی حکومت سے الحاق کرنے کا اعلان کیا تھا۔ فرانس پر جرمنی کے قبضے کے بعد وچی حکومت نے ۱۹۴۱ء میں جرمنی کو مصر کے راستے عراق میں ہوائی جہاز اور دیگر ساز و سامان لے جانے کی اجازت دے دی تھی جو وہاں پر برطانیہ کے خلاف استعمال کئے جاتے تھے۔ اس پر برطانیہ کو یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ نازی فوجیں وچی حکومت پر دباؤ ڈال کر مصر اور لبنان کا مکمل قبضہ نہ حاصل کر لیں اور اس صورت حال کو روکنے کیلئے انہوں نے اپنی فوجیں مصر اور لبنان بھیجیں تھی۔

جنگ عظیم دوئم کے دوران کئی ملکوں پر قوم پرستی کا غلبہ ہو گیا تھا۔ لبنان نے یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو مکمل آزادی حاصل کر لی تھی۔ ایک قومی معاہدے کو تسلیم کرتے ہوئے ممتاز عیسائی اور مسلم رہنماؤں بشارہ الخوری اور ریاض الصلح نے سیاسی اختیارات قوم کے مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ ۱۹۳۲ء کی مردم شماری کو بنیاد بناتے ہوئے جس کے مطابق عیسائی کل آبادی کا ۵۴ فیصد ہیں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ صدر اکثریتی حلقے میرونائٹ کا رکن ہوگا جبکہ کم طاقت رکھنے والا وزیر اعظم سنی آبادی سے ہوگا اور مقننہ کا سربراہ شیعہ ہوگا جبکہ آرمی کا سربراہ میرونائٹ ہوگا۔ زیادہ تر عرب کا یہ خیال تھا کہ بارہ سال پرانی مردم شماری فرسودہ ہو چکی ہے اور مسلمان عیسائیوں سے زیادہ تعداد میں ہیں اور اس نئے منصوبے نے انہیں بیخ پا کر دیا تھا جس کے مطابق لبنان کے ع یوں کو نوازا گیا

تھا اور یہ امر دراصل مغربی حلقوں کو زیادہ پسند آئے گا۔

عربوں کو یہ بھی شک تھا کہ نو تعمیر شدہ اسرائیل بھی دراصل ویسا نہیں ہے جیسا ظاہر کیا جا رہا تھا۔ یہ وہ واحد ملک تھا جس کو اقوام متحدہ نے تسلیم کیا تھا اور جس کو یہودیوں نے ''وعدہ کی گئی سرزمین'' کا نام دیا تھا۔ ہٹلر کی خونریزیوں کے بعد اسرائیل کو ایک جائے پناہ دیدی گئی تھی۔ عربوں کو بھی امریکیوں اور یورپیوں کی طرح یہ کہا گیا تھا کہ یہودیوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی وجہ سے اس ریاست کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔ یہودیوں کے کرب اور آمریت تلے ان کی زندگیوں کی تکلیف کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اس بارے میں کوئی دو رائے تھیں مگر ایسی ریاست کی بنیاد ڈالنے کیلئے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے گھر چھوڑ دینے کیلئے کہا گیا جو راتوں رات پناہ گزین بن چکے تھے جس کی وجہ سے وہ لبنان اور مشرق وسطیٰ کے کئی دوسرے ملکوں میں داخل ہو گئے۔

فلسطینی انخلاء نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ ۱۹۳۲ء کی مردم شماری کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس بارے میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ لبنان میں مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے کہیں زیادہ ہو چکی تھی۔ اس بات کا اندازہ ہوتے ہی کہ قومی معاہدہ کو ایک سیاسی چال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور یہ مسلمانوں کیلئے دوسرا ثبوت تھا کہ اسرائیل کی بنیاد ڈالنے کے پیچھے کوئی اور گھناؤنا مقصد پوشیدہ تھا اور یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اسرائیل سلطنت کا غلام ہوگا اور جنگ عظیم دوئم کے فاتحین کی مسلح ناکہ بندی کے فرائض انجام دے گا جس کے وجود کو مشرق وسطیٰ کے تیل پر قبضہ کرنے کیلئے عمل میں لایا گیا ہے۔ ان کو اس بات کا شک تھا کہ لبنان کو اسرائیل اور اس کے حلیفوں کی حمایت کرنے کیلئے تیار کیا جا رہا ہے اور قومی معاہدے کے تحت عیسائی قیادت کو اختیارات اس سارے کھیل کا ایک حصہ ہے۔

۱۹۵۸ء میں لبنانی عربوں کی نفرت بغاوت کی شکل میں بھڑک اٹھی۔ امریکی سیاستدانوں نے ان پر کمیونزم کے دہشت گرد ہونے کا الزام لگا دیا۔ واشنگٹن نے اس افراتفری کی ذمہ داری ماسکو پر عائد کی اگرچہ روسی صدر سے زیادہ اس کو شام کی حمایت حاصل تھی جس نے وہاں فوجیں بھی بھیجی تھیں۔ امریکی فوج نے لبنان پر مختصر عرصے کیلئے قبضہ کیا تھا تقریباً مئی سے لے کر اکتوبر تک مگر وہاں ان کی موجودگی نے عربوں کے ان شکوک کو مزید تقویت دی تھی کہ واشنگٹن عیسائیوں کو طاقت میں رکھنے کیلئے ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ امریکی صدر کی فوجی صلاحیت کو استعمال کرنے پر آمادگی نے پورے خطے کے مسلمانوں پر بہت گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے تھے۔ لبنان

میں واشنگٹن کی عراق سے جارحانہ مداخلت پر بھی غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں مقبول عراقی عبدالکریم قاسم نے امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے شدید جارحیت کا رویہ اپنا لیا تھا۔ اس نے مطالبہ کیا تھا کہ تیل کی غیر ملکی کمپنیاں عراق کی سرزمین سے حاصل ہونے والے تیل کے منافع کو عراقی عوام کے ساتھ بانٹیں ورنہ انہیں قومیا لینے کی دھمکی دے دی تھی۔ جس میں معاشی تباہ کار قاسم کو راضی کرنے میں ناکام ہوگئے تو سی آئی اے نے اسے قتل کرنے کیلئے ایک گروہ روانہ کیا تھا جس میں ایک نوعمر لڑکا بھی شامل تھا۔ جس نے ابھی اپنی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی اور اس کا نام صدام حسین تھا۔

اس گروہ کے ارکان نے ایک جگہ قاسم کی گاڑی پر فائر کھول دیا تھا۔ انہوں نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا تھا مگر صرف زخمی کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اس مقابلے میں صدام کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور وہ شام فرار ہوگیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں صدر کینیڈی نے ایک اہم فیصلہ کیا تھا جس کے مطابق سی آئی اے کو ایم آئی سکس (برطانوی خفیہ ایجنسی) کے ساتھ مل کر قتل کا منصوبہ مکمل کرنے کا حکم دیا تھا جو سی آئی اے کے قاتل پورا کرنے ناکام ہوگئے تھے۔ انہوں نے قاسم کو ایک دستے کی مدد سے ہلاک کیا تھا جو عراقی ٹیلیویژن پر نشر بھی ہوا۔ اس کے بعد تقریباً پانچ ہزار لوگوں کو کمیونزم کے الزام میں قتل کر دیا گیا تھا۔ چند سال کے عرصے میں صدام کو واپس لا کر قومی سلامتی کا سربراہ بنا دیا گیا اور اس کے کزن کو صدر بنا دیا گیا تھا۔

اس عرصے کے دوران لبنان کی آبادی کے اعداد وشمار تیزی سے بدل رہے تھے۔ مسلم آبادی عیسائی آبادی سے قدرے تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں انہوں نے فوجی معاہدے پر نظرثانی کرنے کا مطالبہ کیا لیکن میرونائٹ نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے حکمرانی جاری رکھی۔ عیسائیوں کی حمایت میں امریکی فوجی دستے بھیجے جانے کے لبنانی اندیشے کو اس وقت مزید تقویت ملی تھی جب امریکہ نے فوجی قوانین کے مسودے کو بحال کر دیا اور ساری دنیا میں اپنی فوجوں کی تعداد میں واضح اضافہ کر دیا تھا۔

علاقائی سیاست بھی مختلف موڑ لے رہی تھی۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے یروشلم، مصر اور شام کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ عرب دنیا اس پر بھڑک گئی تھی۔ فلسطینی مجاہدین کیلئے حمایت نے زور پکڑ لیا تھا۔ فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن نے جنوبی لبنان میں واقع پناہ گزینوں کے کیمپوں کو اسرائیل پر حملہ کرنے کیلئے استعمال کیا تھا۔

۱۹۷۲ء میں جب میں بیروت روانہ ہوا تھا تو استحکام کی آخری نشانیاں بھی معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ زیادہ تر امریکیوں کی طرح جو عربی نہیں بول سکتے تھے اور رابطے کیلئے لوگوں کا استعمال کرتے تھے جو امریکی اور برطانوی تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کر چکے تھے اور ان کی کامیابی کا دارومدار ان کے ملکوں میں ہماری موجودگی پر منحصر تھا میں بھی ان حالات سے کافی حد تک نابلد اور غیر مانوس تھا۔ میں لبنان جیسے علاقوں کے تاریک گوشوں کے بارے میں مطالعہ کر سکتا تھا، میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان صدیوں پرانی نفرت پائی جاتی ہے مگر مجھے یہ سکھایا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام معجزے رونما کر سکتا ہے۔ مجھے حال ہی میں ترقی ملی تھی۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا تھا، بہترین ہوٹلوں میں قیام کرتا تھا، اعلیٰ ریستورانوں میں بہترین خوراک نوش کیا کرتا تھا اور حسین ترین عورتوں کے ساتھ وقت گزارا کرتا تھا۔ دیگر تمام امریکی تاجروں، مشیروں، سرکاری افسروں اور عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ماہرین کی طرح مجھے بھی اس بات پر بھرپور یقین تھا کہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت اور ترقی کے سفر کی طرف تیزی سے گامزن ہیں مگر لبنان نے میری سوچ کو ایک نئی حقیقت سے آشنا کر دیا تھا۔

باب نمبر: ۳۲

لبنان: مکمل دیوانہ

ڈرائیور مجھے بیروت ایئرپورٹ سے لے کر پرآسائش فونیشین انٹرکانٹی نینٹل پہنچا تھا۔ایک نوجوان بیرے نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا، میرا سامان لیا اور مجھے لے کر لابی میں آ گیا تھا جیسے ہی میں استقبالیہ بکنگ کرا کر مڑا تو میں ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ میں یکدم پیچھے ہٹا اور معذرت کرنے لگا مگر وہاں ایک جانی پہچانی شکل دیکھ کر حیران رہ گیا جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اپنی نہ بھولنے والی آواز میں بولا ''کوئی بات نہیں۔''

بیرا میرا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا اور تھوڑی دیر رک کر کہنے لگا ''جی ہاں! آج آپ مارلن برانڈو کے پڑوسی ہیں۔'' وہ غصے کے کافی تیز معلوم ہوتے ہیں۔ان کا آٹوگراف نہ مانگ بیٹھئے گا۔''

جب ہم لفٹ میں چڑھے تو میں اپنے بے تکے پن پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ برانڈو کو جب میں نے آخری بار فلم میں دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس میں ہرگز کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ واقعی ایک ایسا اداکار تھا جس کو میں ''آن دی واٹرفرنٹ'' اور ''اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر'' جیسے یادگار کرداروں کے لئے کافی عرصے سے پسند کرتا تھا۔ میں نے اس کی حالیہ فلم 'برن'' کے بارے میں پڑھا تھا جس میں اس نے اب تک کا سب سے یادگار کردار کیا تھا۔ میں ایک عظیم اداکار اور بدنام زمانہ باغی سے اپنے مشرق وسطیٰ کے پہلے دورے پر اچانک ملاقات کو نیک شگون گردان رہا تھا۔ سالوں بعد جب میں نے ''برن'' دیکھی تھی تو میں اس بات سے بہت لطف اندوز ہوا تھا کہ برانڈو نے بادشاہوں کے قیام کے متعلق بننے والی اس یادگار فلم میں معاشی تباہ کار کے پیش رو کا کردار نبھایا تھا۔

اگلی صبح مجھے چارلی النگورتھ کے دوست نے ہوٹل سے لے لیا تھا۔ اس نے اپنا تعارف ''اسمائلی'' کہہ کر کرایا تھا مگر اس کی طبیعت کو دیکھ کر تو وہ بہت خوشگوار انسان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سفارت خانے کیلئے کام نہیں کرتا تھا بلکہ امریکی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی میں ملازم تھا۔ وہ ساری زندگی یو ایس ایڈ سے منسلک رہا تھا اور اب ریٹائرمنٹ کے قریب اس نے درخواست کر کے لبنان میں تعیناتی کرائی تھی۔ وہ یہیں جوان ہوا تھا دراصل وہ

عیسائی تبلیغی جماعت کے رکن کا بیٹا اور اب وہ اس جگہ ملازمت سے فارغ ہو کر اس جگہ وقت گزارنا چاہتا تھا جہاں اس کی پرورش ہوئی تھی مگر اب لگتا تھا کہ وہ اپنا فیصلہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے نیل کے کنارے سے گزرتے ہوئے مجھے کہا ''بہت پریشانی پھیلی ہوئی ہے، یہ بدبخت مسلمان آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ یہ بالکل بھی بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم چاہے ان سے کیسا ہی معاہدہ کریں وہ کبھی اس کی پاسداری نہیں کرتے۔''

میں نے اسے فلسطینیوں کے کچھ پناہ گزین کیمپ دکھانے کیلئے کہا جن کے بارے میں میں کافی کچھ سن چکا تھا۔ شروع میں وہ کچھ ہچکچا رہا تھا مگر پھر وہ تیار ہو گیا۔ انڈونیشیا کے تجربات کے باوجود میں یہاں پر روا انسانی ذلت اور غربت دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ کیمپ بہت ساری جھونپڑیوں کا ایک ہجوم تھا جو چاروں طرف سے خاردار باڑ میں گھرا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں پر بسنے والے لوگ کیسے اب تک اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے ہوئے تھے۔

اسمائلی نے مجھے یقین دلایا ''ایسا نہیں ہے، وہ بالکل پاگل ہو چکے ہیں ان میں سے کافی لوگوں کی یہی حالت ہے۔''

میں نے اس سے پانی، نکاسی اور دیگر بنیادی ضروریات کے متعلق پوچھا۔

وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ''تمہیں صرف اس کھڑکی کو کھولنا ہو گا اور ایک سانس اندر کھینچنا ہو گی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صفائی کا ان کی زبان میں کیا مطلب ہے۔ یہ ہماری دنیا سے بالکل مختلف دنیا ہے۔ یہ لوگ سور ہیں۔ دیکھو سال بھر پہلے لبنانی حکومت اور فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن نے ایک معاہدہ منظور کیا تھا جس کو یہ معاہدہ قاہرہ کہتے ہیں۔ وہ معاہدہ انہیں رہائش، مزدوروں کے قوانین اور فلسطینیوں کو خود مختاری دینے کے متعلق تھا۔ اس وقت سے لبنانی حکومت چیزیں بہتر کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر عرب مسلمانوں کی طبیعت کے عین مطابق فلسطینی کسی اچھی چیز کو قبول نہیں کرتے۔ پی ایل او نے حملوں میں اضافہ کر دیا تھا اور لبنانی کمیونسٹوں سے تعلقات مضبوط کر رہے ہیں اور اس کیلئے نئے معاہدے کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں کی حکومت کو زچ کر دیا ہے اور ساتھ ہی میرے اور تمہارے جیسے امریکیوں کو بھی پریشان کر ڈالا ہے۔ یقیناً ان کے خلاف کارروائی ہو گی۔ اس کے بارے میں کوئی دورائے نہیں ہیں۔ ان عربوں کو اس پاگل پن کی قیمت چکانی ہو گی۔

اس پورے دن نے مجھے بہت افسردہ کردیا تھا۔ تعلیمی مشن میں رضاکار کی حیثیت سے ایکواڈور کے جنگلات میں میں کیمپسینوز کی طرح رہا کرتا تھا اور امریکی سفارت خانے اور یوایس ایڈ کے عملے کی پرآسائش زندگیوں پر کڑھا کرتا تھا۔ ان کے گھر، گاڑیاں، کپڑے اور اکثریتی ایکواڈورین عوام کے درمیان فاصلوں پر جل بھن جاتا تھا مگر میں نے وہاں بھی کسی کو اسمائلی کی طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میں اس کی کڑواہٹ اور حد سے تجاوز کرتا تعصب پر ہکا بکا رہ گیا تھا اور وہ یہ تمام باتیں ایک اجنبی سے کتنے آرام سے بیان کررہا تھا۔ وہ اسلام پر تنقید کررہا تھا اس کے مطابق اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا تھا جبکہ عیسائیت امن کے راستے دنیا پر چھا گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے بتاؤں کی جنگیں برپا کرنے میں کیتھولک چرچ کا کردار رہا ہے اور صلاح الدین ایوبی کی صلیبی قیدیوں سے ہمدردی کا مقابلہ یورپی بادشاہوں کے حکم پر مسلمان قیدیوں کے ذبح کئے جانے کے واقعات کا موازنہ پیش کروں مگر میں کچھ ڈر گیا تھا۔ میں ابھی اس علاقے میں نووارد تھا۔ میں نے اپنی زبان روک لی تھی۔ میں اس کی تذلیل کو مزاج کی سختی سمجھ کر نظرانداز کر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ زندگی کے اس حصے میں اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہ رہی تھی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ جس جگہ وہ اپنا بڑھاپا گزارنا چاہتا تھا اس نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ زیادہ تر کڑوے لوگوں کی طرح وہ اپنے غصے کا نشانہ کمزور اور پریشان حال فلسطینیوں کو بنا رہا تھا۔

اسمائلی نے مجھے میرے ہوٹل پر اتار دیا۔ میں نے اسے رات کے کھانے کیلئے روکا مگر اس نے دیگر مصروفیات کا تذکرہ کرکے معذرت کرلی جب میں نے اس سے مصافحہ کیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر بولا "مجھے امید ہے کہ تم نے مجھے غلط نہیں سمجھا ہوگا۔ میں قنوطی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے آخر میں ہم ہی جیتیں گے۔ ہمیں جیتنا ہوگا۔ اسلام ایک جھوٹا مذہب ہے جو روح اور ضمیر سے عاری ہے۔ سوچو اگر حضرت عیسیٰ کی برابری کا کوئی اور پیشوا لوگوں کی گردن اڑا دے تو پھر وہ کیسا مذہب ہوگا۔"

کھانے کے دوران میں اس کے آخری جملے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بیروت میں گزرے میرے وقت کے دوران میں یہ بات سمجھ گیا تھا کہ تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ بالخصوص مذاہب کے درمیان تصادم مشرق وسطیٰ کے بہت سے مسائل کی وجہ ہے اگرچہ ضروری نہیں کہ یہی بنیادی مسئلہ ہو۔ میں جانتا تھا کہ صلیبی جنگوں کا آغاز چرچ نے شروع کیا تھا اور اس جنگ کو "اسلام کی شیطانی قوتوں" کا نام دیا گیا تھا مگر اس بات سے بھی واقف تھا کہ یورپ پریشانیوں میں گھرا

ہوا تھا، بے روزگاری اور طاعون نے انہیں برباد کردیا تھا، وہ بغاوت پر مجبور ہو رہے تھے اور حکمرانوں نے صلیبی جنگوں کے ذریعے اس غصے کو نئے علاقوں کیلئے استعمال کیا تھا۔ میں اسلام کے بارے میں اسمائلی کی رائے اور کچھ عرصے پہلے انڈونیشیا میں اس مذہب کے بارے میں رائے کے درمیان واضح فرق پر حیران رہ گیا تھا۔

جاوا کے مغربی پہاڑی شہر بانڈنگ میں رہائش کے دوران میری دوستی ایک نوجوان شخص سے ہوگئی تھی جس کی ماں اس سرائے کا نظم ونسق سنبھالتی تھی جہاں میں اور مین (Main) کی بقیہ جماعت رہائش پذیر تھی۔ جیسے کہ "معاشی تباہ کار کے اعترافات" میں ذکر کیا گیا تھا کہ راسی نامی ایک نوجوان نے میرا تعارف اپنی یونیورسٹی کے دوستوں سے کروایا تھا۔ ایک رات وہ لوگ مجھے روایتی تیلی تماشے ڈالانگ دکھانے لے گئے تھے جس میں رچرڈ نکسن اور میرے اندازے کے مطابق ہنری کسنجر کی پتلیوں کو مشرق بعید کے نقشے کے برابر کھڑا دکھایا گیا تھا جس میں تمام ممالک کسی چیز کے ذریعے اپنی اپنی جگہوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ نکسن ایک ایک کرکے ملکوں کو اٹھا رہا تھا اور آہستہ آہستہ انہیں منہ میں ڈال رہا تھا۔ جب وہ کسی مشرق وسطیٰ کی ریاست کو منہ میں ڈالتا تھا، اسے چکھتا تھا اور چیخنے لگتا تھا جس کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا تھا "کڑوا، بکواس۔ ہمیں اس کی مزید ضرورت نہیں ہے۔" اور پھر اس ملک کو اٹھا کر ہنری کسنجر کی بالٹی میں پھینک دیتا تھا۔

اس تماشے کے بعد میں اور یونیورسٹی کے طالب علم کافی ہاؤس میں بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ انڈونیشیا کی اکثریت کی یہ رائے تھی کہ امریکہ نے اسلام مخالف جنگ شروع کررکھی ہے۔ انہوں نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ پچاس کی دہائی میں برطانوی مؤرخ آرنولڈ ٹائن بی نے پیشین گوئی کی تھی کہ اگلی صدی کی اصل جنگ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے نظام کے درمیان نہیں بلکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوگی۔

انگریزی کے ایک نوعمر طالب علم نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "مغرب بالخصوص اس کا سربراہ امریکہ پوری دنیا پر تسلط چاہتا ہے اور دنیا کی سب سے عظیم سلطنت بننے کا خواب دیکھتا ہے اور وہ کامیابی کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ اس وقت روس ان کے راستے میں رکاوٹ بنا کھڑا ہے مگر روسی زیادہ دیر دباؤ برداشت نہیں کرپائیں گے، ان کے نظریے کا کوئی مذہب، کوئی ایمان یا ٹھوس چیز نہیں ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ایمان، روح اور اعلیٰ طاقتوں پر

یقین ضروری ہے۔ہم مسلمانوں کے پاس یہ سب موجود ہے، ہمارے پاس یہ تمام قوتیں کسی اور سے زیادہ موجود ہیں، عیسائیوں سے بھی زیادہ تو ہم صرف انتظار کر رہے ہیں کہ ہم طاقتور ہو رہے ہیں۔''

اس نے میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا ''اتنی خودغرضی اور لالچ کو بند کر دیجئے۔اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ دنیا میں آپ کے بڑے بڑے گھروں اور خوبصورت دکانوں سے بھی زیادہ اور قیمتی کچھ موجود ہے۔لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہیں اور آپ کو اپنی گاڑیوں کیلئے تیل کی پڑی ہوئی ہے۔بچے پیاس سے مر رہے ہیں اور آپ نت نئے فیشن کی تلاش میں ہیں۔ہمارے جیسے ملک غربت میں ڈوبتے جا رہے ہیں مگر آپ کے عوام مدد کیلئے ہماری گلے پھاڑتی چیخیں بھی نہیں سن پا رہے ہیں۔آپ لوگوں نے اپنے کانوں کو ان آوازوں کیلئے بند کر دیا ہے جو آپ کو یہ سب کچھ بتانا چاہتا ہے۔آپ نے ان پر انتہا پسند اور کمیونسٹوں کے نشان آویزاں کر دیے ہیں۔آپ کو اپنے دلوں کو غریبوں اور ضرورت مندوں کیلئے کھولنا ہوگا نہ کہ انہیں مزید غربت اور مفلسی میں دھکیل دیا جائے۔زیادہ وقت باقی نہیں بچا ہے۔اگر آپ لوگ تبدیل نہ ہوں گے تو برباد ہو جائیں گے۔''

اس دن کو یاد کرتے ہوئے مجھے اسمائلی کے ساتھ گزرے دن کا خیال آیا اور پھر میں سوچنے لگا کہ کیا اس دنیا کیلئے کوئی امید باقی رہ گئی ہے جہاں مذاہب استحصال کی بنیاد بن چکے ہوں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو کسی ایک مذہب کے خلاف نفرتوں کی تعلیم دی جائے؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامات جنگ کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے استعمال کیا جائے۔

ان سوالات کے اثرات مجھے کافی عرصے سے خوفزدہ کر رہے ہیں۔مشرق وسطیٰ کے پہلے دورے کے دوران میں عالمی سیاست میں مذہب کی اہمیت کے حوالے سے نئے مطمع نظر سے آشنا ہوا تھا۔میں اس وقت مصر میں تھا جب مجھے پہلی بار اس بات کا تجربہ ہوا تھا کہ مذہب کی قوت کو نفرت بھڑکانے کیلئے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

باب نمبر: ۳۳

یو ایس ایڈ کی آواز

''اہرام مصر اس کردار کی علامت ہیں جو اس ملک کو ادا کرنا ہوگا اگر ہمیں عربوں کے دلوں اور دماغوں کو جیتنا ہے۔'' یہ بات ہمیں مین (Main) کے پیچیدہ مزاج ساٹھ سالہ چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو آفیسر میک پال نے بوسٹن کی سب سے بلند عمارت اور مین کے افسران کے دفاتر کی عمارت پروڈینشیل ٹاور کی اوپری منزل پر واقع پرآسائش انجینئرز کلب میں منعقد کھانے کی دعوت کے دوران کہی تھی۔مصر بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے مضبوط اور بڑا۔اس کے اوپر ہم انبار لگاتے جائیں گے ایک بعد دوسرے ملک کا انبار۔

وہ ۱۹۷۴ء تھا، مصر کی طویل تاریخ کا سب سے اہم اور نازک لمحہ۔مین (Main) اور کارپریٹوکریسی کے دوسرے ارکان اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔اس موقع سے فائدہ حاصل کرنے کا بہترین موقع اس وقت میسر آیا جب ہمیں الیگزینڈریا میں تحقیقی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ایک یو ایس ایڈ افسر واشنگٹن سے پرواز کر کے مصر کی مشکلات اور ہمارے مقاصد کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کرنے پہنچا تھا۔

اس کے ترشے ہوئے بال، سلیقے سے بنی ہوئی مونچھیں، کلف لگی قمیص، سیاہی مائل سوٹ، نیلی اور لال رنگ کی ٹائی، کوٹ کے کالر پر لگی دو پن جس میں سے ایک پر امریکی جھنڈا بنا ہوا تھا اور دوسری پن پر سفید ہاتھ نے کالے ہاتھ کو تھاما ہوا تھا جو سرکاری عہدیدار کے کردار کو بھرپور انداز میں پیش کر رہا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ بستیوں پر قبضہ کرنے والا افلاح و بہبود کے کام سرانجام دینے والے کا بہروپ تھا۔وہ نہایت اکڑے ہوئے انداز میں بیٹھا ہوا تھا اور جب وہ بات کر رہا تھا تو اس دوران اکثر میں ہال پر خوشامدانہ نگاہیں ڈال رہا تھا۔مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ ہم سے ملنے مختلف بہروپیوں میں آیا تھا جن میں سے ایک تو مصر کے ماہر تھا، دوسرا بہروپ ایک ایسے آدمی کا تھا جس کو ہم روزگار فراہم کر رہے تھے کیونکہ واشنگٹن کے اعلیٰ عہدیدار ہمیشہ بہتر ملازمت کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں یا پھر ریٹائرمنٹ کے بعد فائدہ مند مشاورتی ذمہ داریاں ان کو بہت بھاتی ہیں۔

جب وہ مشرق وسطیٰ میں اپنے تجربات بیان کر رہا تھا تو باتوں باتوں میں مصر کی تاریخ [illegible] بحث کرنے لگا۔اس نے واضح کرتے ہوئے کہا کہ صدیوں سے غیر ملکی تسلط نے جنگ [illegible]

کے بعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات کیلئے بنیادیں فراہم کردی تھیں۔ اس نے نہایت نفرت سے وہ الفاظ ادا کیے تھے جیسے کسی نے اس کی زبان پر ڈنگ مارا ہو۔ ''اخوان المسلمین'' نامی گروپ بہت قوت اختیار کر گیا تھا۔ انہوں نے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ مصر یورپ سے تمام تعلقات منقطع کرے۔ ان بھائیوں نے مصری فوجی قوت کے سرچشمہ سمجھے جانے والے فوجیوں کی انقلابی جماعت سوسائٹی آف فری آفیسرز میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس گٹھ جوڑ کا اصل مقصد شاہ فاروق کی مخالفت کرنا تھا جس سے نفرت کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسا البانی باشندہ تھا جس کے خاندان نے مصر میں عثمانیہ سلطنت کی سرپرستی میں اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا اور بعد میں ہم نے اور برطانیہ نے ان کی حمایت جاری رکھی۔ مصری مسلمانوں اور فوج کے ایک گروہ کے اتحاد نے شاہ فاروق کی حکومت برطرف کرا دی جس پر ہم کافی سیخ پا ہوگئے تھے مگر جیسے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ اگلا حکمران کون تھا جی ہاں! لیفٹیننٹ کرنل جمال عبدالناصر ۱۹۵۴ء میں وزیر اعظم کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تھا اور ۱۹۵۶ء میں صدر کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔

یو ایس ایڈ کے اس نمائندے کے مطابق مغربی طاقتوں سے آزادی کا اعلان ناصر کا ایک بہت خطرناک جوا تھا۔ وہ روسی ہتھیاروں کے حصول کے سلسلے میں مذاکرات کر رہا تھا جس کی وجہ سے ہم نے اور برطانیہ نے اسوان ڈیم تعمیر کرنے کی پیشکشیں واپس لے لیں۔ اس پر ناصر مشتعل ہو گیا تھا اور اس نے سوئز نہر قومیالی تھی جس پر جوابی کارروائی کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے سینائی کے جزیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں یقیناً ہمارا کوئی کردار ضرور تھا مگر اس کا کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا تھا۔ فرانس اور برطانیہ نے دعوے کیے کہ یہ نہر ان کی حفاظت کیلئے نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے مصری چوکیوں پر بم برسانے شروع کر دیے اور اپنے دستے روانہ کر دیے مجبوراً نہر کو بند کرنا پڑا۔

یو ایس ایڈ کا نمائندہ تیوریاں چڑھا کر بولا ''ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دنیا نے امریکی مصنوعات اور مشرق وسطیٰ سے حاصل ہونے والے تیل سے واویلا کرنا شروع کر دیا۔ افریقہ کا چکر کاٹ کر پہنچنا بہت کثیر لاگت کا کام تھا۔ کچھ کارپوریٹ عہدیدار وائٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ آئیک نے ان کی پوری بات سنی اور اس جنرل نے صورتحال کو سنبھالنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا یہ کہہ کر وہ مسکرا کر ہال کی طرف دیکھنے لگا۔'' ۱۹۵۶ء میں جنگ بندی کا اعلان کیا گیا اور اقوام متحدہ کی امن فوج کے دستے مصر اور اسرائیل کی سرحدوں پر گشت کرنے لگے۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ مخاطب ہوا

''دراصل انکل سام نے اسرائیل، برطانیہ اور فرانس کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ صرف ایک سال پہلے ہی ہم نے کمیونسٹ مصدق کو فارغ کر کے اس کی جگہ شاہِ ایران کو بٹھا کر ایران میں صورتحال معمول پر لائے تھے اور اب ہم نے عربوں کو دکھایا تھا کہ ہم ان کی مصر میں بھی مدد کرنے کو تیار ہیں اور اس طرح واشنگٹن مشرق وسطیٰ کے حصے میں واضح قوت بن کر ابھرا تھا۔

پروڈینشیئل ٹاور کے نجی کلب میں پیش کیے جانے والے اس تجزیے نے میری نفرت کو مزید جلا بخشی تھی اور ساتھ ہی میں اس عظیم مملکت جس کو میں اپنا گھر کہتا تھا اس کی حرکتوں سے حاصل ہونے والے نتائج کے مزے لوٹنے کی خواہش مزید گہری ہو گئی تھی۔ وہ تمام باتیں سن کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایران اور مصر میں حاصل کی جانے والی فتوحات نے کارپوریٹوکریسی کی بالادستی قائم کر لی تھی اور اس سرکاری عہدیدار کو ان تمام کامیابیوں کے بارے میں شیخی بگھارنے کے عوض بھاری معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ ان تمام کارپوریٹ عہدیداران جو وزارت دفاع کے علاوہ بعینہٖ امریکی معیشت کے اکثریتی حصے چلاتے تھے انہوں نے امریکی صدر کو بھی اپنے مطالبات منظور کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور آج دو دہائیوں کے بعد یہ سرکاری ایجنسی اپنی دفتری بات چیت میں بھی تاریخ کا دوسرا اور تبدیل شدہ رخ پیش کر رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی عیاری دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھناؤنے منصوبے کا حصہ ہونے پر احساس جرم بھی محسوس کر رہا تھا جو میری دانست کے مطابق دنیا کی پہلی خفیہ سلطنت قائم کرنے کی تدبیر تھی۔

میں کھڑکی سے باہر دور دریائے چارلس کی طرف دیکھنے لگا جس کے پار فاصلے پر سورج عشق پیچاں بیل سے لپٹی ہوئی ہارورڈ کی عمارت پر چمک رہا تھا جس نے بلاشبہ ان میں سے کئی ایک عہدیداران کو تعلیم کی دولت سے نوازا تھا جو اس دن وہائٹ ہاؤس پہنچے تھے یکدم عسکری صنعتی کمپلیکس میں آئزن ہاور کی تقریر یاد آگئی۔ یہ نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ ایک فوجی افسر اور جنگ عظیم دوئم میں اتحادی افواج کا کمانڈر ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے کارپوریٹوکریسی کے بہت سے چہروں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس نے ان تمام لالچی عہدیداروں کو کوریا کی جنگ کے دوران امریکی خارجہ پالیسی پر اثر و رسوخ مضبوط کرتا دیکھا تھا۔ وہ اس بات کا عینی شاہد تھا کہ کس طرح انہوں نے پریس اور کانگریس کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کیا اور کمیونزم کے بہانے کو ہماری شہری آزادی کو سلب کرنے کیلئے پیش کیا تھا۔ وہ سب کچھ بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ جب دور دراز فاصلے تک مار کرنے والے وہ میزائل گائیڈڈ وار ہیڈز فوج کو فروخت کر رہے تھے مگر سو[illegible] کے بحران کے دوران اس کو پہلی بار حکومت، فوج اور کارپوریشنز کے درمیان طے پانے [illegible]

معاہدے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ وہ مان ضرور گیا تھا مگر اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا ہوگا۔
اس کو نظم وضبط برقرار رکھنے کی تربیت دی گئی تھی اس لئے وہ صحیح موقع کا انتظار کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی عہدے کی معیاد ختم ہو جائے اور پھر اس نے اپنا بم پھینکا تھا۔ ویتنام جنگ کئی پُرجوش مخالفین کی طرح ۱۹۶۰ء کے اوائل میں' میں نے بھی آئیک کی ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء کے الوداعی خطاب کی فریم شدہ کاپی اپنی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

آئزن ہاور نے اپنی تقریر میں امریکہ کو ایسے ملک کے طور پر پیش کیا تھا جس کی معیشت کی عمارت امن کوششوں سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس نے کہا ''ہماری دنیا کے حالیہ تنازعات تک امریکہ کی اسلحہ کی کوئی صنعتیں نہیں تھیں۔ ہل بنانے والے امریکیوں نے وقت اور ضرورت کے مطابق تلواریں بھی بنائی ہیں۔'' پھر اس نے ایک خطرہ کی طرح نشاندہی کی تھی۔

''ہمیں اپنے سرکاری اداروں کو بغیر کسی مناسب وجہ کے عسکری صنعتوں کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت کے حصول سے محفوظ رکھنا ہوگا۔ ایک گمراہ کن طاقت کے تباہ کن ظہور کے امکانات موجود ہیں اور موجود رہیں گے اور ہمیں اس ملاپ کی تباہ کاریوں سے اپنے آزادی اور جمہوری طور طریقوں کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ ہمیں ہرگز اسے آسان یا کمتر نہیں سمجھنا چاہئے۔ صرف اور صرف ایک باشعور معاشرہ ہی ہمارے دفاع سے منسلک بڑی صنعتی اور عسکری صلاحیت کو پرامن ضابطوں اور مقاصد میں ضم کرسکتا ہے تاکہ تحفظ اور آزادی ترقی کرسکیں۔''

میں ابھی اس تقریر میں سوچ رہا تھا کہ یو ایس ایڈ کے نمائندے کی آواز میرے کانوں میں پڑی وہ کہہ رہا تھا ''ناصر تیز مزاج کا آدمی تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ہمیں بے وقوف بنا سکتا ہے اور اسی لئے بے تکے انداز سے روس سے تعلقات گہرے کرتا رہا۔ اس نے انہیں اسوان ڈیم کی تعمیر کی ذمہ داری سونپ دی۔'' اس نے میک ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ دیکھ کر آپ کے دوست بیک ٹیل کو یہ جان کر کیسا محسوس ہوا ہوگا؟''
ہال ہنس کر بولا ''صرف بیک ٹیل ہمارے جیسے تمام انجینئرنگ ادارے اس پر بھنا اٹھے تھے۔'' ''مگر بیک ٹیل کے خاصے مضبوط تعلقات تھے وہ صدر تک بات پہنچانا جانتے تھے۔'' ہال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اور ذلیل ہونا بھی خوب جانتے ہیں۔'' یہ سن کر سب یکدم ہنس پڑے۔

یو ایس ایڈ کے نمائندے نے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ ''اس دوران اخوان المسلمین دوبارہ جڑیں پکڑ چکی تھی انہیں کافر کمیونسٹوں کے ساتھ جمال کی دوستی اور اسلامی ریاست بنانے سے انکار

نے کافی دکھ پہنچایا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ شاہ فاروق کو برطرف کرنے کیلئے سوسائٹی آف آفیسرز کے ساتھ ہمارے گٹھ جوڑ کا جواب دینا چاہتا ہے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا صدر قرآن کو آئین کی بنیاد بنائے اس کے انکار پر انہوں نے اسے قتل کرانے کیلئے ایک دستہ روانہ کر دیا تھا مگر وہ ناکام ہو گئے اور اس ناکامی نے انہیں مزید الجھا دیا تھا۔ ناصر کی مقبولیت میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے اخوان المسلمین کی تحریک پر پابندی لگادی تھی اور اس کے چار ہزار اراکین کو جیلوں میں قید کر دیا تھا اور ان کے مقامی رہنماؤں کو قتل کرا دیا تھا جو فرار ہوسکے۔ وہ خفیہ مقامات پر چھپ گئے تھے۔ کچھ نے مزدور یونینز، اسکولوں اور فوج میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ بہت سے ملک سے فرار ہو کر اردن، سعودی عرب، سوڈان، شام اور کویت چلے گئے تھے جہاں آپ لوگوں کو بجلی کا بہت وسیع نظام تھا۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نہ؟'' اس نے ہال کی طرف سر ہلاتے ہوئے کہا ''لیکن اب سالوں کے بعد وہ اب دنیا کی سب سے بااثر مسلم طاقت کا روپ اختیار کر چکے ہیں۔ اب ان کا مقصد مغرب سے آئی ہوئی تمام تہذیبوں سے مشرق وسطیٰ کو پاک کرنا ہے، سیکولر رہنما کی حکومتیں برطرف کرنی ہیں جیسے ایران اور مصر کے رہنما تھے اور ان کی جگہ مولویوں کو فائز کرنا ہے۔''
میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ میں نے افواہیں سنی ہیں کہ ان کے واضح مقاصد اور کمیونزم کی مخالفت کے باوجود ہم مشرف افراد کو سی آئی اے کی مالی اور فنی معاونت حاصل ہے مگر میں جانتا تھا کہ ان حالات میں اس سے یہ سوال پوچھنا میرے حق میں کچھ اچھا ثابت نہ ہوتا۔
اس نے ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا ''آپ لوگوں کے ذہنوں میں کوئی سوال ہیں؟''
اس کا مطلب ہے میرا کام ختم ہوا۔ ساٹھ کی دہائی مصر کیلئے تباہ کن تھی۔ ناصر نے معاشی اصلاحات نافذ کیں، مارکس ازم کی بنیاد رکھی اور ایک فرمان جاری کیا تھا جس کے مطابق مصر کے تمام کاروباری اداروں کا ۵۱ فیصد حصہ حکومت کی ملکیت ہوگا۔ کیا بکواس سوچ تھی۔ اس سب سے اس نے ہمیں مزید جھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اقوام متحدہ کی امن فوج وہاں ۱۹۶۷ء تک رہی تھی۔ مصری اور اسرائیلی فوجوں کے درمیان اکا دکا مقامات پر جھڑپیں ۱۹۷۰ء تک جاری رہیں تھیں اور نہر سوئیز پر جہاز آنے کا سلسلہ تا حال بند ہے۔ ناصر آج سے چار سال پہلے ۱۹۷۰ء میں انتقال کر گیا تھا اور اس کی جگہ انور سادات نے اقتدار سنبھالا تھا۔
''ہم نے سادات کو اپنے ساتھ شامل کرنے کیلئے بہت محنت کی تھی۔ میرا یقین کیجئے میں اس وقت وہیں موجود تھا۔ شروع شروع میں وہ سب جھٹلاتا رہا تھا۔ اس نے ناصر کے روس کے ساتھ کئے ہوئے سلسلے کو معاہدہ میں بدل کر بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ہمارے ہر معاملے میں ٹانگ اڑا کر

خوشی محسوس کرتا تھا۔ مگر ہم اپنی بے عزتیوں کو نظرانداز کر کے وہاں جمے رہے تھے اور بالآخر ہماری مستقل مزاجی کام آ گئی تھی۔ سادات نے اچانک اپنے موقف سے پھر گیا تھا اور اس نے ۷۲ء میں روسیوں کو نکال باہر کیا تھا۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''اور پھر اس نے حرکتیں شروع کر دیں۔ اس نے فوجی دستے نہر سوئز کی طرف روانہ کر دیئے اور سینائی میں اسرائیلی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ عین اسی وقت شام نے گولان کی پہاڑیوں کے ساتھ واقع اسرائیلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیل نے اپنے پر حملہ کرنے والوں کو پسپا کر دیا تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا تھا؟ یام کپور کی جنگ بندی ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ہوئی تھی اور اب سادات دوبارہ ہمیں منانے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالات میں تبدیلی لا رہا ہے۔ اسرائیل سے عدم تعاون کے معاہدوں پر مذاکرات کر رہا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور امریکی اور عالمی بینک کے امراء سے درخواست کر رہا ہے۔ ہمیں ایک اور موقع نصیب ہو گیا ہے۔''

وہ پانی غٹاغٹ چڑھا گیا اور کہنے لگا ''جناب ہال میں آپ کی تائید کرتا ہوں'' یہ کہہ کر اس نے اس کاغذ کو دیکھا جس پر ہال کا بیان لکھا ہوا تھا ''اہرام مصر اس کردار کی عکاسی کرتے ہیں جو اس ملک یعنی مصر کو ہر صورت میں ادا کرنا ہوگا۔ اگر ہمیں عربوں کے دلوں اور دماغوں پر فتح حاصل کرنی ہے مصر اس ضرورت کی ٹھوس اور قوی بنیاد ہے اور اس کے بعد ایک ایک کر کے ہم تمام ممالک کو اس صف میں شامل کر لیں گے۔'' یہ پڑھ کر وہ ہال کی جانب احتراماً جھکا اور کہنے لگا ''جناب! میں آپ کی رائے کی قدر کرتا ہوں۔ بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے آپ نے یہ مکمل طریقے سے اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے جہاں ہم آج موجود ہیں۔''

کھانے کے بعد ہم لوگ ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر میں دوبارہ کھڑکی سے ہارورڈ کی طرف دیکھنے لگا تھا کہ اچانک کسی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ جب میں مڑا تو جارج رچ کا بوڑھا اور موسم مرجھایا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا۔ ہال کے بعد جارج مین کا سب سے طاقتور آدمی سمجھا جاتا تھا۔ میرے عہدیدار برونو زامبوٹی نے ایک دفعہ کہا تھا ''صدر آتے جاتے رہتے ہیں مگر ہال اور رچ ہمیشہ ہماری ڈور کھینچتے رہتے ہیں۔''

جارج رچ قریبی میز پر مزید دو لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے مجھ سے کہا ''کیا شاندار منظر ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر مجھ سے پوچھنے لگا ''تمہارے پاس کچھ وقت ہوگا، کیا تم میرے دفتر آ سکتے ہو؟''

باب نمبر: ۳۴

مصر: افریقہ کی باگ ڈور سنبھالنا

مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پہلے میک ہال اور اعلیٰ عہدیداروں کے گروپ کے ساتھ دن بھر کا کھانا اور اب ایک ایسے آدمی کی دعوت جس کو شعبہ انجینئرنگ کی عظیم ہستیوں میں سے ایک تصور کیا جاتا تھا۔ میں افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں جارج رچ کے معرکوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جو دور دراز علاقوں تک گیا تھا اور دیہی علاقوں کیلئے پانی سے بجلی پیدا کرنے کے منصوبوں کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس وقت دریائے کانگو تک پہنچا تھا جس وقت وہ جوزف کانریڈ کا ''ہارٹ آف ڈارکنیس'' سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے لارنس آف عربیا کے ساتھ ریگستانوں کی خاک چھانی تھی اور اب اس بڑھاپے میں ساری دنیا کے انجینئرز اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اگر بوگوٹا اور (میری معلومات کے مطابق اس کو عمر چوراسی برس تھی) تہران کی کمپنیوں کے اداروں سے اگر اس کا ذکر کیا جاتا تو وہ آپ کو اپنے گھر کے بنے کھانوں کیلئے مدعو کرتے ہیں (ایرانی اس طرح ہرگز نہیں سوچتے تھے) وہ او ہل، ہال اور رچ نامی انجینئرنگ کمپنی کے بانیوں میں سے تھا جو مین سے چیف ایگزیکٹو اور دو قریبی ساتھیوں نے اس کام کو مکمل کرنے کیلئے بنائی گئی تھی جس کو مین خود مکمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا کیوں اس کا کوئی اطمینان بخش جواب مجھے آج تک نہ مل سکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ نیویارک کے قوانین کے مطابق ایسے ہی ایک ادارے کی ضرورت تھی۔ مگر میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ یقیناً کسی نہایت خفیہ کارروائیوں کیلئے وجود میں لائی گئی ہوگی یا پھر شاید ان کے تین بانیوں کے کالے دھن کو سفید بنانا ہوگا اور اپنے علاوہ امیر گاہکوں اور سرکاری اداروں کی رقوم کو قانونی ثابت کرنا ہوگا۔

میں جارج رچ کے پیچھے پیچھے ریستوران سے باہر آ گیا تھا لیکن ہم لوگ اس کے دفتر نہیں گئے تھے بلکہ نیچے کی منزل پر پہنچنے کے بعد جہاں مین کے اعلیٰ افسران کے دفاتر واقع تھے ہم لوگ راہداری سے ہوتے ہوئے ملاقاتوں والے کمرے کی طرف بڑھے تھے۔ اس نے چابی نکالی اور مجھے اندر آنے کو کہا۔ مجھے آرام دہ کرسی میں بیٹھنے کیلئے اشارہ کرتے ہوئے مخاطب ہوا ''میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ جگہ میرے دفتر سے زیادہ محفوظ رہے گی۔''

وہ پیٹھ موڑ کر دیوار پر لگے دنیا کے بڑے سے نقشے کی طرف ٹہلتا ہوا گیا۔ وہ نقشہ روشن ہو رہا تھا اور اس پر بیضوی شکل کا سایہ پڑ رہا تھا جو یہ نمایاں کر رہا تھا کہ کس جگہ دن رات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں اس نقشے کو دیکھنے کیلئے پہلے بھی اس کمرے میں آ چکا تھا۔ اس وقت میک ہال کی ذاتی سیکرٹری نے میرے لئے اس کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور چپ چاپ کھڑی رہی تھی جب میں اس نقشے میں دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ اس رات میں کس وقت نیند سے بیدار ہو کر بنکاک فون کر سکتا تھا۔

رچ نے نقشے میں افریقہ کے براعظم کے اوپری کونے کی طرف اشارہ کیا اور بولا ''مصر'' یہ کہہ کر وہ میری طرف مڑا ''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ابھی ابھی یو ایس ایڈ کے نمائندے سے نہایت ہی سطحی کہانی سننے کو ملی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اصل کہانی پتہ چل جائے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کافی ہوشیار ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ اصل میں کیا کرتے ہیں۔ تم یہاں سے مصر روانہ ہو گے اور پھر وہاں سے کویت، عراق اور سعودی عرب جاؤ گے۔'' اس نے یہ الفاظ بڑے ٹھہراؤ سے ادا کئے تھے۔ وہ یہ یقینی بنانا چاہتا تھا کہ میں ان ممالک کے نام سن کر سنسنی محسوس کروں اور اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہو جاؤں۔ وہ پھر بولا ''تم یقیناً اس بات سے واقف ہو گے کہ ہمارا اصل کام اس سے بہت بڑا ہے جو نظر آتا ہے یا جو معاہدوں میں درج ہوتا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر میری طرف جھکا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا ''صحیح کہہ رہا ہوں ناں میں؟''

میں نے جواب دیا ''جی سر میں پوری طرح اس بات کو سمجھتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے مگر مجھے کبھی سر کا خطاب نہیں ملا ہے میں سر نہیں ہوں میرا نام جارج ہے۔''

یہ سن کر میں مسکرا پڑا اور سوچنے لگا کہ کیا میں کبھی اس کے منہ پر اس کے نام سے پکار سکوں گا۔

''ٹھیک ہے'' میں نے جواباً کہا۔

وہ اپنی انگلیوں کی ہڈیوں کو نقشے پر مارنے لگا۔ ''تمہیں اخوان المسلمین کے بارے میں بتایا جا چکا ہے۔'' ''جی''

''اونہہ وہ کافی خطرناک لوگ ہیں۔ ان سے جیتنا ہو گا، سمجھوتہ کرنا ہو گا، ان کو خریدنا ہو گا یا پھر انہیں تباہ کرنا ہو گا کیونکہ انہیں روکا نہیں جا سکتا۔ سادات نے اس بات کو ثابت کر دیا تھا۔ آپ ان کے تعاقب میں جائیں گے تو وہ مزید حمایت حاصل کر لیں گے۔ جیسے آگ میں کیروسین انڈیلی

جائے۔'' اس نے اپنے سامان والی کرسی کو کھسکایا اور اُس کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا پھر میری طرف منہ کر کے بولا ''مگر یہ تمہارا کام ہرگز نہیں ہے، کم از کم ابھی نہیں ہے۔'' وہ میرے اتنا قریب بیٹھ گیا کہ ہمارے گھٹنے تقریباً ٹکرا رہے تھے؟ ''اس نقشے کو دیکھو، تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟''

میں گھبرا گیا تھا ''آپ کا مطلب مصر سے ہے؟''

''ہاں! یقیناً مصر۔ مگر وہ کہاں؟ مصر کہاں واقع ہے؟'' اس نے میرے گھٹنے پر مارتے ہوئے کہا ''کھڑے ہو اور ذرا غور سے دیکھو۔''

اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''کس براعظم میں واقع ہے؟''

میں بولا ''افریقہ''

''ہاں وہاں روشنی جل رہی ہے۔'' اس نے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے ایسا اشارہ کیا جیسے کوئی ڈور پکڑے ہو۔ ''ہاں صحیح ہے افریقہ۔ اب اس نقشے پر ایک اور نظر ڈالو اس کے برخلاف کہ زیادہ تر امریکی کیا سوچتے ہیں۔ مصر ایک افریقی ملک ہے تو کیا وہ مشرق وسطیٰ کا حصہ ہے؟ یقیناً مشرق وسطیٰ براعظم تو نہیں ہے وہ بیچ میں واقع ایک ملک ہے۔ ایک ایسی رسی جو یورپ اور ایشیا کو ایک دوسرے سے باندھتی ہے اور عوامی رائے کے برخلاف مصر دونوں کو افریقہ سے جوڑتا ہے۔ اب مجھے ایک مشکل سوال پوچھنے دو، کیا مصر میں دریا ہے؟''

''نیل ہے۔''

''صحیح اور اب تم مجھے دریائے نیل کے بارے میں یہ نقشہ دیکھ کر کیا بتا سکتے ہو؟''

''یہ سوڈان سے بہتا ہے۔'' میں بولا

''جو ۱۹۵۶ء تک مصر کا حصہ تھا۔ اس کو برطانیہ نے آزادی دی تھی جو در حقیقت برطانیہ اور مصر نے دی تھی۔ اگرچہ بہت سے مصری اس بات سے اب تک نالاں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زمین کا ایک بڑا ٹکڑا ان کی ملکیت ہے۔ اب آگے دریائے نیل کہاں جاتا ہے؟''

''اگر آپ نیل کی دونوں شاخوں کو شامل کر لیں جیسے ایک نہر ٹانگانیکا اور دوسری چھوٹی نہریں تو وہ براعظم کا کافی بڑا حصہ بن جاتا ہے۔''

''آیا۔ میرے خیال کے مطابق آپ کو ڈاکٹر لیونگ اسٹون کی سرزمین پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ اگر تم اس کا صحیح جواب دے دو تو تم یہاں واپس بیٹھ سکتے ہو۔ دریائے نیل کس سمت میں بہتا ہے؟''

''شمال''

''درست۔ تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ افریقہ کے پانی کا بہت بڑا حصہ دریائے نیل میں بہہ جاتا ہے اور نیل مصر میں بہتا ہے صحیح؟ اچھا تو پھر ہم یہ قیاس آرائی کر سکتے ہیں کہ زرخیز سیلابی علاقے جہاں پر فرعونوں نے اہرام مصر تعمیر کئے تھے وہاں وہ مٹی موجود ہے وہ زرخیز مٹی جو افریقہ کی اصل دولت ہے؟ قاہرہ افریقہ کی سرزمین پر واقع ہے اس لئے نہیں کہ افریقہ میں واقع ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس مٹی پر بیٹھا ہوا ہے جو جنوب میں واقع زمینوں کی پیداوار ہے۔ صحیح ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو۔''

میں اپنی نشست پر بیٹھ کر اس کی بات کے جاری رکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ وہیں بیٹھا مجھے گھورتا رہا۔ میں اپنے الفاظ کے چناؤ میں خاصی احتیاط برت رہا تھا کیونکہ میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ یہ آدمی میری پوری زندگی اور ملازمت پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ میں بولا ''میں سمجھ رہا ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں۔ مصر عرب دنیا میں اہمیت رکھنے کے ساتھ ساتھ افریقہ پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' میں نے نقشہ پر نظر ڈالی ''یہ ایک پل ہے، جغرافیائی اور سماجی دونوں طرح سے ایک پل کا کردار ادا کر رہا ہے نہ صرف یہ معاشی بلکہ نسلی لحاظ سے بھی رابطہ جوڑتا ہے۔'' وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں کچھ بھول گیا تھا ''اور ہاں مذہبی لحاظ سے بھی پل کا کردار ادا کر رہا ہے۔''

''بہت اچھے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھ کمر کے گرد باندھ لئے اور نقشے کی طرف بڑھا اور بولا ''مصر، سوڈان، ایتھوپیا، صومالیہ، کینیا یہ سب قدیم ملک ہیں جو ایک دوسرے سے تاریخی لحاظ سے منسلک ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے ان تمام ممالک کی پانچویں صدی عیسوی میں تعریفیں بیان کی تھیں۔ داستان کے مطابق ایتھوپین بادشاہت اور آج کے بادشاہ ہیل سیلاسی کی بنیاد اسرائیل کے بادشاہ سلیمان اور ملکہ سبا کے بیٹے نے رکھی تھی۔ یہ تمام خطہ نہایت دلچسپ ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' وہ دوبارہ نقشے کی طرف دیر تک دیکھتا رہا اور پھر میری طرف واپس آیا ''تمہیں معلوم ہو گا کہ یہاں اس خطے میں بے تحاشہ تیل موجود ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے، میں نے ارضیات کا مطالعہ کرتے پوری زندگی گزاری ہے اور میں یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں ہی افریقہ تیل کیلئے میدان جنگ بن جائے گا۔'' وہ یہ کہہ کر بیٹھ گیا ''تو پھر یو ایس ایڈ کے نمائندے کے ادا کئے الفاظ پر غور کرو کہ مصر جاؤ اور اسے مشرق وسطیٰ پر قبضہ کرنے کیلئے استعمال کرو اور اس بات کو سمجھو جو آج کل کافی

سارے لوگ کہہ رہے ہیں۔''

''وہ افریقہ کا بھی مرکزی نکتہ ہو گا۔''

''اور اگر تم بچے چاہتے ہو اور انہیں آرام دہ زندگی دینا چاہتے ہو تو پھر اس بات کو یقینی بناؤ کہ ہم افریقہ کے براعظم پر مکمل قابو حاصل کر لیں۔ ہمیں مشرق وسطیٰ کی ضرورت ہے مگر ہمیں افریقہ کی بھی اشد ضرورت ہے۔''

اسے ملاقاتی کمرے سے باہر آتے ہوئے کافی پر مسرت محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں کے دوران میں نے مین کے چیف ایگزیکٹو کے ساتھ ایک ملاقات میں شرکت کی تھی اور تجربہ کار یو ایس ایڈ افسر سے ملا تھا اور پھر جارج رچ نے اس مہم کیلئے میرا انتخاب کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مصر افریقہ کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ کا بھی حصہ ہے یا یہ کہ وہ علاقائی سیاست میں اتنا اہم کردار کا حامل ہے۔ یہ یقینی تھا کہ بہت کم امریکیوں کو اس پہلو کا اندازہ ہو گا۔ میں ایک ایسے آدمی کی طرح محسوس کر رہا ہوں جس کو ایک ذمہ داری سونپی گئی ہو جس کو ایک خاص گروہ کے طور پر حصہ منتخب کیا گیا تھا۔

میں لفٹ کے ذریعے نیچے زیریں منزل پر آیا تھا اور وہاں سے چلتا ہوا پروڈینشیل سینٹر سے ہوتا ہوا اس عمارت تک پہنچا جہاں میرا دفتر تھا۔ اس عمارت کا نام ساؤتھ ایسٹ ٹاور جو ۱۰ ہنٹنگٹن ایونیو پر واقع تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید رچ کے آخری کلمات نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ کسی دن میں شاید ایک خاندان کا سربراہ ہوں گا اس دوران میں ملبوسات کی دکان کی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ وہاں ایک سوٹ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگلے ہفتے آ کر میں یہ سوٹ خریدوں گا۔ اس فیصلے نے مجھے بہت مسرت بخشی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ قابل احترام انجینئر جارج رچ صحیح کہہ رہا تھا۔ ہمیں ان تمام وسائل پر قبضہ کرنا ہو گا جن کی ہماری کارپوریشنز کو ضرورت تھی تاکہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو بہتر مستقبل دے سکیں۔

میں نے وہ سوٹ خرید لیا تھا اور اگلے چند ہفتوں میں میں مصر کی طرف جانے والے جہاز میں چڑھ رہا تھا۔

کافر کتا

قاہرہ اور الیگزینڈریا میں گزرے وقت کے دوران میں مقامی افسروں کے عدم تعاون کے رویے سے شدید اکتاہٹ محسوس کیا کرتا تھا۔ یو ایس ایڈ کے ادارے نے میری خدمات حاصل کی تھیں تاکہ میں ایسے معاشی تجزیئے تیار کروں جس کو استعمال کر کے مصری حکومت کیلئے عالمی بینک سے سرمائے کا حصول ممکن ہو سکے۔ اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دینے کیلئے مجھے ملک کے مختلف علاقوں کی آبادی کے متعلق تفصیلی اعداد وشمار کی ضرورت تھی۔ اگرچہ میرے علم میں تھا کہ ایسے اعداد وشمار موجود ہیں لیکن ایک کے بعد دوسرا سرکاری افسر یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ ان تک دسترس عوامی حلقوں میں میسر نہیں ہے۔ میں انہیں بار بار واضح کر چکا تھا کہ میں عوامی نمائندہ نہیں ہوں بلکہ ان کیلئے کام کر رہا ہوں۔ مجھے بااعتماد حلقوں نے منتخب کیا ہے اور مجھے ان تفصیلات کی اشد ضرورت ہے۔ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ایسے تجزیئے پیش کروں جس کے ذریعے لاکھوں ڈالرز ان کے ملک میں آسکیں۔ میری اس طرح کی اپیل جس میں دھمکی کی آمیزش ہو لاطینی امریکہ اور ایشیاء میں کافی کارگر ثابت ہوتی رہی تھی مگر مصر میں اس کی ہرگز کوئی شنوائی نہ تھی۔

قاہرہ اور الیگزینڈریا میں جن سرکاری افسروں کو میرا ہم منصب مقرر کیا گیا تھا اور جن کی ذمہ داری میں میرے کام کو سہل اور تیز رفتار انداز میں مکمل کرانا تھا وہ مجھے اپنے شہروں میں گھما پھرا کر ان کے اصل حالات سے آگاہ کرتے تھے۔ ہم نے مرچوں کے بازاروں اور دھوئیں سے بھرے قہوے خانوں میں پگڑیاں باندھے لوگوں کو شطرنج کھیلتے اور دھواں اگلتے حقے سے لطف اندوز ہوتے دیکھا تھا۔ دریائے نیل اور بحیرہ روم کے کنارے پر ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے تھے، ہم نے خوبصورت ہیرے جواہرات کو پھٹی آنکھوں سے دیکھا تھا، بیش قیمت نوادرات کو قدیم عمارتوں میں مشاہدہ کیا تھا اور کئی گیلن چائے ساتھ ہی انڈیلی تھی۔ مگر جب کبھی میں انہیں یاد دلاتا تھا کہ مجھے آبادی کے متعلق اعداد وشمار کی ضرورت ہے تو وہ اپنی مشکلات دہرا کر میرے صبر کو آزماتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''یہاں چیزیں کافی وقت لے لیتی ہیں۔'' یا پھر یہ بہانہ پیش کرتے تھے ''یہ امریکہ جیسا ملک نہیں ہے۔ ہمارا ملک بہت پرانا ہے اور اونٹ بہت آہستہ چلتے ہیں۔'' بالآخر تنگ

آ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے معاونین کے اعلیٰ افسران سے بات کروں گا۔ یہ ایک انتہائی قدم تھا جس سے میں نے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس میں آپ ان لوگوں کو ناراض کر سکتے ہیں جن پر آپ انحصار کر رہے ہوتے ہیں مگر وہ صورتحال میرے لئے حد درجہ مشکل بنا دی گئی تھی۔

میں نے حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا وہاں سے مجھے ایک بھاری بھر کم افسر لفٹ کے ذریعے اوپری منزل تک لے کر گیا تھا۔ وہاں مجھے کالے رنگ کا سوٹ پہنے ایک غصیلے، لمبے اور دبلے مصری شخص نے ایک چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھنے کیلئے کہا جو دو صوفوں سے مزین تھا پھر اس نے برطانوی لب ولہجہ والی عمدہ انگریزی میں انتظار کرنے کا عندیہ دیا۔ ایک اور حفاظت پر ماموار افسر جسے شاید انگریزی نہ آتی تھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ میں دو صوفوں کے درمیان رکھی میز پر لگے رسالوں کے انبار سے ''ٹائم'' کا پرانا شمارہ نکال کر پڑھنے لگا۔ حفاظتی افسر اونگھ رہا تھا۔ میں اس دوران نیشنل جیوگرافک کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ ہم نے کم از کم دو گھنٹے انتظار کیا تھا۔ اس وقفے میں چائے بھی پیش نہیں کی گئی تھی۔ میرے ذہن میں ہرگز کوئی شبہ نہ تھا کہ ڈاکٹر عاصم اپنی اہمیت کا اندازہ کرا رہا تھا اور چائے نہ پیش کئے جانے سے مجھے لگا تھا کہ ان تکلفات تک رسائی میں معمولاتی دفتری ذرائع نظر انداز کرنے پر ڈاکٹر نے برہمی کا اظہار کیا تھا مگر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے زیادہ بھاری رقم بطور رشوت پیش کرنے کی ٹھانی تھی۔

بالآخر دراز قد، دبلا مصری دوبارہ نمودار ہوا، بغیر کسی معذرت کے وہ مجھے لمبی راہداری سے ہوتا ہوا بڑے سے لکڑی کے دروازے تک لے کر گیا تھا جو عصر حاضر کی عمارت سے زیادہ بادشاہ ٹٹ کا مقبرہ لگ رہا تھا۔ اس نے وہ بڑا دروازہ کھولا۔ میں کمرے کے پھیلاؤ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ وہ کمرہ کسی انتہائی سر پھرے فرعون کو بھی متاثر کرنے کیلئے کافی تھا۔ اس کو قدیم مصری اور جدید پارک ایونیو طرز کے فرنیچر سے سجایا گیا تھا۔ قدیم پیرس کے پارچہ جات کو پکاسو کے گلدانوں کے مقابلے پر سجایا گیا تھا۔ جدید طرز کے فرنیچر کو ایرانی قالینوں پر رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر عاصم ایک بڑی سی میز پر جھکا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور سونے کے رنگ کی ٹائی پہنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ تربوز کی طرح نرم اور فربہ تھا۔ اس نے تاروں کی کمانی والی عینک پہنی ہوئی تھی جس کو دیکھ کر مجھے بنجمن فرینکلن کی یاد آ گئی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ دراز قد دبلا آدمی سلام کر کے باہر کی طرف مڑ گیا تھا۔ میں دروازے کے قریب کھڑا

ڈاکٹر کے کاغذی امور ختم کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر اس نے نظریں اٹھائیں۔ وہ اپنی میز کے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کر کے مخاطب ہوا ''بیٹھئے۔'' اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں اپنے آپ کو حقیر اور گھبرایا ہوا سا محسوس کرنے لگا۔ ہو سکتا تھا کہ میں حصہ کا اظہار کر بیٹھتا مگر ایسا کرنا بے وقوفی ثابت ہو سکتا تھا۔ کیا وہ بھول گیا تھا کہ اس وقار مشاورتی کمپنی کا نمائندہ ہوں جس کی خدمات اُس کے ملک کی مدد کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق کافی طویل توقف کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے اس وقت کیڑے کی طرح دیکھ رہا ہے جو کھانے کی میز کی طرف رینگتا ہوا بڑھتا ہے۔ پھر اس نے اپنی تمام تر طاقت جمع کرتے ہوئے میز کے اوپر سے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اس سے ہاتھ ملانے کے لئے کھڑا ہونا پڑا تھا۔

میری گھبراہٹ اب غصے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس غصے کو دباتے ہوئے میں مسکرایا۔ مقامی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے میں نے ملاقات کا وقت نکالنے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ میرے تکلفات کو نظر انداز کرتے ہوئے تعارف کے رسمی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے رُخی سے پوچھنے لگا کہ میرا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ ایک مشاق افسر میری بے عزتی کر رہا تھا۔ میں یہاں سے غصے میں نکل جانا چاہتا تھا لیکن اس کے برعکس میں اپنے آپ کو بوسٹن کے پروڈینشیل ٹاور کے اوپری حصے میں واقع انجینئر کلب اور وہاں سے جارج رچ کے ملاقاتی کمرے کے واقع کو یاد کیا۔ اچانک میں نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ اس کی بے عزتی کا بدلہ اس حقیقت میں پوشیدہ تھا کہ میں ایک معاشی تباہ کار تھا جو اس کے ملک کا استحصال کرنے کے مقصد پر یہاں بھیجا گیا تھا۔ میں اس کی چھوٹی موٹی کامیابی کو برداشت کر سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اصل اور بڑی فتح میرے مقدر کا حصہ ہو گی۔ یہ لڑائی وہ جیت گیا تھا مگر اصل جنگ میں ہی جیتوں گا۔ میں آرام سے اپنی کرسی میں دھنس گیا اور مسکراتے ہوئے بولا ''آبادی کے اعداد و شمار''

''دوبارہ کہئے گا'' وہ بولا۔ میں نے نہایت مختصراً اپنے مسئلے کو بیان کیا مجھے آبادی کے اعداد و شمار درکار ہیں اور جیسے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر آپ کے لوگ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو آپ کے ملک کو وہ سارا پیسہ نہیں مل سکے گا جس کے لئے آپ کے صدر درخواست کر رہے ہیں۔

اس نے اپنی ہتھیلیاں میز پر ماریں اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم بھی کمرے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کرسی زمین لڑھکتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ میں تمہارے کروڑوں ڈالر پر لعنت بھیجتا ہوں۔ وہ مخاطب ہوا۔ اس کی آواز اس کی جسمانی حرکتوں کے برخلاف دھیمی اور مکمل قابو میں تھی ''برخوردار تم عمر میں میرے چھوٹے بیٹے کے بھی برابر نہیں ہو گے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم یہاں آ کر میرے سامنے اپنے مطالبات رکھ سکو'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے جواب مانگا۔ ''میں تمہیں چند باتیں بتانا چاہتا ہوں، میں تمہارے ملک میں رہ چکا ہوں۔ میں تمہارے عمدہ سجے سجائے شہروں، گاڑیوں اور مکانوں کے متعلق سب جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو'' اپنی میز پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے اس نے مجھے گھور کر کہا ''تمہیں معلوم ہے ہارورڈ میں کتنے لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا میں نے کبھی اونٹ چلایا ہے؟ ہارورڈ میں اس طرح کی بیوقوفی مضحکہ خیز تھی۔ تمہارے ملک کی تنگ نظری، ہم مصری ہزاروں سالوں سے آباد ہیں۔ کئی ہزار سال ہم اس وقت بھی یہاں بستے تھے جب تم لوگ خاک کے برابر تھے۔'' اس نے اپنی کرسی اٹھائی اور دوبارہ بیٹھ گیا اور زور دار آہ بھرتے دوبارہ کاغذات کی جانب منہمک ہو گیا تھا۔

میں بیٹھا اسے گھورتا رہا اور رچ کے ملاقاتی کمرے میں گزرے لمحات یاد کرنے لگا۔ مجھے انڈونیشیا کی وہ دفتری ملاقاتیں بھی یاد آ رہی تھیں جہاں پر ایک دفعہ میرے میزبان اس بات سے ناواقف ہوئے کہ میں ان کی زبان جانتا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر مجھے چائے پیش کرتے ہوئے اپنی زبان میں میرے لئے تحقیری کلمات ادا کر رہے تھے۔ میں نے اپنا دل کڑا کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس مصری کو شکست دے سکتا تھا۔

بالآخر وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کیلئے کہنے لگا۔

پھر یکدم بولا ''مگر''

اس نے اپنی ہتھیلیاں دوبارہ میز پر ماریں لیکن اس بار وہ بیٹھا رہا ''ہمیشہ یاد رکھنا'' وہ دوبارہ اسی متزلزل اعتماد کے ساتھ کہنے لگا ''تم ایک کافر کتے ہو'' یہ کہہ کر اس کی نظریں میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور اس کے چہرے پر بے دردی نمایاں تھی جو شاید اسے ہارورڈ میں گزرے وقت سے نصیب ہوئی تھی اور پھر اس نہایت اذیت ناک اداز میں آہستگی سے کہا ''کافر کتے، دفع ہو جاؤ''

تمہیں تمہارے اعداد وشمار مل جائیں گے اگر اللہ اور سادات کی رضا اس میں شامل ہوئی تو!''

کئی دن بعد میری مطلوبہ معلومات مجھ تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ کاغذات نہایت معمولی سے خاکی لفافے میں بند تھے جسے مٹی اور دھوئیں میں اٹے کوریئر والے نے میرے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی کاغذ منسلک نہیں تھا کہ یہ کہاں سے کیوں بھیجا گیا تھا مگر اس میں وہ تمام تفصیلات موجود تھیں جس کی مجھے اشد ضرورت تھی اور اس کیلئے مجھے ایک پائی بھی ادا نہیں کرنی پڑی تھی۔

میں جب ان بیزار کن اعداد وشمار پر مشتمل درجنوں کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا تو میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ان میں ایسا کیا ہے جس کیلئے اتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ کیا ان کے اعداد وشمار کو مجھ تک نہ پہنچنے دینے کے پیچھے کوئی واضح یا معقول وجہ تھی۔ اس کی واحد وضاحت جو مجھے سمجھ میں آئی تھی وہ اسرائیلی فضائی حملے کا مصری خوف تھا مگر میں یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آبادی کی تفصیلات اسرائیل کے کس طرح کام آ سکتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے پاس پہلے سے ہی تفصیلات موجود ہیں، اپنے جہازوں اور میزائلوں کو ہدف سے آگاہ کرنے کیلئے ضروری تھیں۔ بموں کو ہرگز اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون سے مخصوص علاقے کی آبادی اگلے سالوں لاکھ یا سوا لاکھ کے تناسب سے بڑھے گی اور پھر مجھے ڈاکٹر عاصم کے ادا کئے ہوئے الفاظ یاد آئے۔

میں ایک کافر کتا تھا۔ مصریوں کو کچھ ایسا پتہ ہے جو میرے ملک کے چند لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم آبادی کے متعلق اپنے اندازوں کو جو مجھے ڈاکٹر عاصم نے فراہم کئے تھے اپنی سلطنت کی تعمیر کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ معاشی تباہ کاروں کے معاشی تجزیئے صلیبی تلواروں سے کہیں زیادہ موثر ہتھیار ہیں۔ اسرائیلی بم ان کے مقاصد کے حصول میں کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ تباہی پھیلاتے ہیں، خوف کی فضا پھیلاتے ہیں اور سرکاری عہدیداروں کو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں مگر میرے جیسے لوگ اصل خطرہ ہیں۔ ہم لوگ درحقیقت اس تباہی کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس خوف کو صحیح جگہ استعمال کرتے ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ جنہوں نے ہتھیار ڈالے ہیں وہ اس بات کو اپنے دلوں میں بسا لیں تا کہ آئندہ ایسی بمباریوں سے محفوظ رہ سکیں اور اس سب سے بچنے کیلئے ہمارے نخرے برداشت کرنے ہوتے ہیں کیونکہ ہم تباہ کاری کے تمام حربوں کے بادشاہ ہیں۔ ڈاکٹر عاصم جیسے لوگوں کیلئے کوئی راستہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ یا تو سر تسلیم خم کر دیں یا ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور اسی وجہ سے وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔

باب نمبر: ۳۶

ایران: شاہراہیں اور قلعے

میں اس عرصے میں دنیا بھر کے سفر پر رہا کرتا تھا۔ ڈاکٹر عاصم کے الفاظ میری سوچوں میں رہتے تھے۔ میرے جذبات دفاع سے غصے میں بدلتے جا رہے تھے اور پھر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک مغرور انسان تھا جو ایک اعلیٰ تہذیب کا حصہ تھا اور اسے اس حقیقت سے نفرت تھی کہ قلوپطرہ کے عاشقوں کی طرح اسے سیزر کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو شاید زیادہ بددماغ ثابت ہوتا۔

میں حیران ہوتا تھا یہ سوچ کر کہ میرا ملک جدید مصر کیلئے روم کا درجہ رکھتا ہے مگر ہمارے اپنے گھر میں ہم الگ عذاب سے دوچار تھے۔ میں ایک دور کی پیداوار تھا جس میں ہم خود احتسابی کے خبط میں مبتلا تھے۔ ہم ایسے کئی مرحلے دیکھ چکے تھے جس کے گہرے اثرات ہماری نسلوں پر مرتب ہوئے تھے۔ واٹ اور ڈیٹرائٹ کے فسادات، وونڈڈ نی کا مسئلہ، سیزر شادیز اور اس کی یونائیٹڈ فارم کی جارحیت اور کئی دوسرے ایسے مسائل جن کو زیادہ شہرت نصیب نہ ہو سکی تھی جیسے کہ اقلیتوں کی جانب سے امریکہ کے مختلف حصوں میں بغاوتوں کی کوششیں وغیرہ شامل تھیں۔ میں ان تمام حالات کو اس جبر اور بربریت کے برابر تصور کرتا ہوں جو ہمارے آباؤ اجداد نے انگریز مالکوں کے ہاتھوں اٹھائے تھے۔ بھرپور ذلت نے ہمیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کالے، انڈینز اور ہسپانویوں کو کارپوریٹوکریسی نے غلاموں کے برابر قرار دے دیا تھا اور میرے آباؤ اجداد برطانوی سلطنت کے معماروں کیلئے غداروں کی حیثیت رکھتے تھے مگر آج نوجوان لوگ اقلیتی رہنماؤں کو اپنا ہیرو مانتے ہیں اور ان مردوں اور عورتوں کو جنہوں نے غیر ملکی قابضین کے خلاف حقوق کی جدوجہد کی تھی آج ہمارا بانی تصور کیا جاتا ہے اور یہاں میں ایک ایسا شخص جو ایک طرف تو مجاہدین آزادی سے ہمدردیاں رکھتا ہوا اور دوسری طرف سلطنت کے معماروں کیلئے خدمات سرانجام دے رہا ہوں اور اسی تضاد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں کئی بار ایران گیا تھا اور شاہ کے احکامات پورے کئے تھے۔

ہم معاشی تباہ کاروں نے شاہ کو ایک ایسے حکمرانوں کے طور پر پیش کیا تھا جو اپنے ملک ۔

پھولوں کا وہ گہوارہ بنا دے گا جیسا وہ سکندر اعظم اور داریس کے ادوار حکومت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور سے تین صدیوں پہلے ہوا کرتا تھا۔ شاہ کو ہم ایسے شخص کی طرح بیان کرتے تھے جو تیل کے ذخائر کو مین جیسی کمپنیوں کی مہارت سے استعمال کر کے سارے حسین خواب پورے کر دے گا اور کسی نہ کسی طرح خود بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس تبدیلی سے جمہوری اور مساوات پر مبنی معاشرہ تشکیل پا جائے گا۔

ہمارے منصوبے کے مطابق روس، لیبیا، چین، کوریا، کیوبا، پانامہ، نکاراگوا اور دوسرے ایسے ممالک جہاں پر امریکی مخالف طاقتیں زور آور ہو رہی تھیں، وہاں شاہ کی حکومت متبادل کے طور پر پیش جائے گی۔ ہماری اس حکمت عملی کی بنیاد ان حقیقتوں پر مبنی تھی کہ ۱۹۶۲ء میں شاہ نے بڑی نجی ارضی کے قبضے ختم کرا کر زمینیں کسانوں کے حوالے کر دی تھیں اور ہم نے مل کر وہ سفید انقلاب ترتیب دیا تھا۔ جس کے ذریعے ہم وسیع سماجی معاشی اصلاحات کا آغاز کر سکتے تھے۔ میں کانپ جاتا ہوں جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہم اپنے دلوں میں اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ سب کچھ ہڑپ کر لینے کا انقلاب تھا۔ وہ شاہ کی طاقت کو مضبوط کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ منظر عام پر ایران ایک عیسائی، مسلم کارپوریشن کا نمونہ تھا جبکہ دراصل وہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے تسلط کو وسعت دینے کے کام پر فائز پرکارہ تھا۔ وہ بالکل وہی منظر تھا جو ڈاکٹر عاصم مصر کیلئے دیکھ رہا تھا اور وہ جارج رچ کے ان خوابوں کی تعبیر تھی جس کے مطابق وہ مشرق وسطیٰ اور افریقہ پر آنے والی امریکی نسلوں کیلئے قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۷۴ء کے بعد مین کے معاہداتی ٹھیکوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا تھا۔ تیل کی ہوس پاگل پن میں بدل چکی تھی۔ یہ خبر پھیل گئی تھی کہ ان لوگوں کو سلطنت کا غلام بنانے کیلئے اوپیک کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔

میری ذمہ داریاں نہایت اہمیت کی حامل تھیں۔ منصوبہ ساز اور انجینئرز بجلی کے نظام کے نقشے تیار کرنے کیلئے علاقائی ترقی کے بارے میں تیار کیے جانے والے میرے تجزیوں پر بھروسہ کرتے تھے کیونکہ اس بجلی کے ذریعے صنعتی، تجارتی اور عسکری پیداوار کیلئے توانائی فراہم کی جانے والی تھی جن کے ذریعے امیر ایرانیوں کو امیر سے امیر تر ہونے کا موقع فراہم کیا جا رہا تھا۔ شاہ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کیلئے ان امیر ایرانیوں کی خوشنودی کے ساتھ تیل کی مستقل ترسیل بھی یہاں ضروری تھی۔

میرے مین کے افسر برونو زامبوٹی نے مجھے بتایا تھا ''تم تہران سے کرمان روانہ ہو گے جو مشہور دشت لت کا نخلستان ہے۔ دشت لت سطح مرتفع پر واقع وہ ریگستان ہے جس کی طرف سکندر اعظم نے تاریخی پیش قدمی کی تھی۔ اس ریگستان میں دل خوش کرنے والے بے شمار خفیہ خزانے موجود ہیں۔ وہاں سے گاڑی کے ذریعے دنیا کے حسین ترین صحراؤں سے ہوتے ہوئے بندر عباس پہنچ گئے۔ آج یہ مچھیروں کی ایک گمنام سی بستی ہے لیکن کل یہ ریویرا کے مقابلے پر کھڑا ہوگا۔ اس وقت تک میں جان چکا تھا کہ برونو مبالغہ آرائی کی عادت میں مبتلا ہے مگر میں واقعی اس وقت اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ تہران سے کرمان تک کے سفر کے دوران میرے ساتھ مین کے دو انجینئرز اور بھی تھے۔ گرمیوں کا درمیانی حصہ تھا اگرچہ بعد دوپہر دم نکال دینے والی گرمی پڑتی تھی وہ قصبہ بے تو جہی کا شکار محسوس ہوا سوائے کچھ اور بزرگوں کے وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر مٹی اور غربت ریگستان کے خفیہ خزانوں کو چھپا رہے تھے تو میری نظر اور تصور سے بھی کوسوں دور تھے۔ پسینہ میں شرابور ہم قصبے کے بہترین ہوٹل میں داخل ہوئے تھے۔ بیرونی ہال چھوٹا، تاریکی میں ڈوبا ہوا اور فرنیچر سے عاری تھا۔ استقبالیہ پر کھڑے نوجوان شخص نے خوشی خوشی ہمیں بتایا کہ صحن میں بنے بار میں وہ لوگ بیئر وغیرہ پیش کیا کرتے تھے۔ ہم سب کا الگ الگ کمرہ بک کرایا گیا تھا جس میں توقع کے برخلاف غسل خانہ بھی موجود تھا۔ ہم تینوں تیں منٹ میں دوبارہ بار پر جمع ہونے کا کہہ کر اپنے کمروں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

کمرہ کافی مختصر لیکن بہت صاف ستھرا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا تھا کہ کمرے کی کھڑکی پر ایک شور کرتا ہوا لیکن کام دیتا ہوا ایئر کنڈیشنڈ بھی نصب تھا۔ اگرچہ غسل خانہ موجود تھا مگر بیت الخلاء میں پانی بہانے کا نظام زیادہ درست نہ تھا۔ وہاں دو ٹونٹی والی نلکیاں نصب تھیں۔ ایک ذرا اونچائی پر شاید نہانے کیلئے تھی جبکہ نیچے والی نلکی زنگ آلود بالٹی بھر کر بیت الخلاء میں پانی بہانے کیلئے نصب تھی۔

میں دیوار اور بیت الخلاء کے درمیان تنگ جگہ میں کھڑا ہو کر غسل کرنے لگا۔ غسل کی جگہ پر پردہ بھی نصب نہیں تھا جیسے ہی نلکا گھمایا تو اس سے نکلتا ذرا سا پانی ٹوانگ میں گرنے لگا۔ میں آگے جھک کر صابن وغیرہ جسم پر رگڑا اور پانی بہایا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جس جگہ سے پانی نکل رہا تھا وہ واقعی شاور ہی تھا لیکن اس کی ایک ہی نشانی تھی کہ زمین اسی کے مدمقابل پانی رسنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تا کہ برونو آخری بار اس نخلستان میں کب آیا تھا۔

حیران کن طور پر غسل کے بعد میں کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ میں واپس صحن میں تعمیر شدہ بار تک آ گیا جہاں پر چار زنگ شدہ میزیں اور درجن بھر کرسیاں اس چبوترے پر بکھری ہوئی تھیں یہیں سے صحرا کے حسین منظر مسحور کن احساس پیدا کر رہا تھا۔ وہاں پر ایک انجینئر فرینک پہلے سے ہی موجود تھے اور اس کے سامنے بیئر کے تین لبالب بھرے ہوئے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

''کیا صرف اس کمپنی کی بیئر میسر ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے منگوائی ہوگی۔'' میں نے پوچھا۔ ہم پندرہ منٹ تک انتظار کرتے رہے پھر ہم نے سوچا کہ شاید ہمارا تیسرا ساتھی نیند پوری کر رہا ہوگا۔ ہم لوگ اگلے دن کے سفر کے متعلق بات کرتے رہے اور بیئر پینا شروع کر دی۔ جیسے ہی ہم نے بیئر ختم کی جیمس بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ پانی میں شرابور چبوترے تک پہنچا۔ اس نے ہاتھ میں وہ قمیص پکڑی ہوئی تھی جو اس نے فلائٹ پر پہنی ہوئی تھی۔ وہ بے تحاشہ گیلی ہو رہی تھی۔ اس نے قمیص اٹھا کر میز پر پھینک کر خالی نشست پر بیٹھ گیا اور غٹاغٹ بیئر کا گلاس انڈیل لیا۔

فرینک نے پوچھا ''کیا ہو گیا؟''

وہ بولا ''مجھے ہی وہ کباڑ خانہ ملنا تھا، ٹوائلٹمیں نکاسی کا انتظام نہیں ہے۔ میں نے اس منحوس بالٹی کو پڑے دیکھا تو نلکا دبا دیا، پانی کہیں اور سے نکلنے لگا اور میں شاور سے بھیگ گیا۔''

جب ہم ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تو فرینک نے کہا کہ ''صحرا کی ہوا قمیص کو جلد ہی خشک کر دے گی۔''

جیمس بولا ''یہی میں نے سوچا تھا ورنہ میں کبھی بھی اس قمیص کو اس عالیشان مے خانے میں نہ لے کر آتا۔''

اگلی صبح ہمیں دو ایرانی لینے آئے تھے ان میں سے ایک انجینئر اور مترجم تھا جبکہ دوسرا جیپ کا ڈرائیور تھا۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے جبکہ ہم تینوں بمشکل پچھلی نشستوں میں گھس پائے تھے۔ ہم تینوں میں سب سے کم عمر میں تھا اس لئے مجھے بیچ میں بیٹھنا پڑا تھا۔ جب ہم اس ناہموار سڑک پر سفر کر رہے تھے تو ہمیں سطح مرتفع پر واقع اس بلند ریگستان سے لے کر خلیج فارس کے ساحلوں تک لے جا رہی تھی تو ایرانی انجینئر نے وضاحت کی کہ ہم قدیم کے زمانے کے کاروانوں کے راستے پر رواں دواں تھے۔

''یہ ریگستان ہمیشہ سے باعث رحمت ہونے کے ساتھ ساتھ باعث زحمت بھی رہا ہے۔'' اس نے ہماری طرف دیکھ کر بتانے کی کوشش کی ''اس صحرا نے میرے آباؤ اجداد کی حفاظت کی تھی

اور دوسری طرف ان کی اپنے ہی ملک کو پار کرنے کی کوشش کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ آج یہ ہمیشہ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دشت لت افریقہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کو ایشیاء سے جدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خلیج فارس اور سوویت یونین کا درمیانی راستہ ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ روسی ہم پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی ناہموار سڑک جس سے آج ہم گزر رہے ہیں ان کی فوج کی شاہراہ بننے والی ہے۔'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہاں سیدھے ہاتھ پر تیل کی بڑی سی پائپ لائن بچھائیں گے۔ وہ چھوٹا سا قصبہ جہاں ہم آج کی رات گزارنے والے ہیں بندر عباس کمیونزم کا قلعہ بن جائے گا۔ جیٹ طیارے، میزائل، ایٹمی سب میرین اور ہوائی بیڑے دنیا کے تیل کے سب سے اہم راستوں پر قبضہ کر لیں گے۔''

فرینک، جیمس اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جیمس نے اظہار خیال کیا ''میرا خیال ہے آپ کی کہانی مکمل ہوگئی ہے۔ ہمیں کافی بھاری ذمہ داری نبھانی ہے۔ زیادہ پریشان نہ ہوں مگر میرے دوستوں ہمیں اس دنیا کو کمیونزم سے بچانا ہوگا۔''

ایرانی پھر بولا ''بنیادی بات یہ ہے کہ ہم ایرانیوں اور آپ امریکنوں کو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہوگا ہمیں اس فوجی شاہراہ کو تعمیر کرنا ہوگا اور بندرِ عباس کو اپنے قلعے میں تبدیل کرنا ہوگا۔''

فرینک بولا ''یہی کام کرنے تو ہم یہاں آئے ہیں۔''

ایرانی مخاطب ہوا ''ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھئے گا کہ ایرانی عرب نہیں ہیں ہم فارس کے رہنے والے ہیں آریان۔ ہم مسلمان ہیں مگر عرب ہمیں دھمکایا کرتے ہیں۔ ہم سو فیصدی آپ لوگوں کے دوست ہیں۔''

وہ صحرا بالکل بھی اس طرح کی مٹی کی لہروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ نہ تھا جس کا سامنا پیٹر اوٹول نے فلم ''لارنس آف عربیہ'' میں کیا تھا۔ ان حد نگاہ تک پھیلا، جامنی اور بھورے رنگ کے پہاڑوں میں قطعاً کوئی یکسانیت نہ تھی بلکہ مجھے تو وہ بالکل اتنے ہی خوبصورت محسوس ہوئے تھے جتنے برونو نے بیان کئے تھے اور وہ شاید کوئی بدشگونی تھی۔ میں یہاں سینکڑوں لوگوں اور اونٹوں پر مشتمل کارروائی کے بارے میں تصور نہیں کر پا رہا تھا۔

جیپ میں نصب ایئر کنڈیشنر کے باوجود جھلسا دینے والی گرمی ہمیں جلا رہی تھی۔ ہم راستے میں کئی جگہ رکے تھے تاکہ انجینئر زمٹی اور ان دیگر عوامل کا جائزہ لے سکیں جو مواصلاتی نظام، پائپ لائن اور شاہراہ پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ جب ہم نے گاڑی خالی کی تو باہر آ کر کافی ٹھنڈک

ہوئی مگر پھر تمازت سے ہم پریشان ہو گئے تھے۔اس دوران بیچ میں ایک چھوٹے سے گاؤں پر رک کر ہم نے چائے اور کھجوریں وغیرہ نوش کی تھیں جو بالکل صحرائی نخلستان تھا۔ جیسے شور مچاتے سمندر کے درمیان پرسکون جزیرہ اس نخلستان سے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی ناگوار بو سے بھر گئی تھی۔

فرینک چیخا تھا'' کچھ جل رہا ہے؟''

ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف لے جا کر زوردار جھٹکے سے روک دی۔ ایرانی نے حکم دیا ''سب باہر آجاؤ'' تمام دروازے یکدم کھلے اور تمام لوگ اچھل کر گاڑی سے نکلے مگر میں نہیں نکل پایا۔ میرے پیر ہی نہیں ہل رہے تھے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پیر مفلوج ہو گئے ہوں۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا مگر میرے پیر میرا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔ میں شدید گھبراہٹ کا شکار تھا۔ زور لگانے سے میرے چمڑے کے جوتے بھی اترے جا رہے تھے۔ آخر کار میرے پیر ہل گئے، میں پورے زور سے چھلانگ لگا کر ریت پر آ گرا۔

فرینگ نے احتیاطاً پیچھے جھانکا اور زور سے ہنس پڑا۔''تمہارے جوتوں کے تلے میں لگا چمڑا پگھل گیا تھا اور قالین پر چپک گیا تھا۔ میں نے انجنوں کو گرم ہوتے پہلے بھی دیکھا ہے مگر یہ سب سے جان لیوا تھا۔''

وہ کافی محنت طلب تھا مگر بالآخر میں نے قالین کے ساتھ چپکے چمڑے کے جوتوں کو الگ کر ہی لیا اور پھر ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہم بندرِعباس میں اس وقت پہنچے تھے جب سورج غروب ہو رہا تھا۔

باب نمبر: ۳۷

اسرائیل: امریکہ کی پیدل فوج

آبنائے ہرمز پر واقع عرب جزیرے کے عین مدمقابل بندرِعباس دنیا کے چند اہم ترین فوجی راستوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سے ۱۹۷۱ء میں برطانیہ دستبردار ہوا تھا اور یہاں متحدہ عرب امارات، اومان، بحرین اور قطر کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ کسی زمانہ میں بحیرہ عرب سے گزرتے جہازوں کو لوٹنے والے وحشی قزاقوں کا گڑھ تھا۔ آج اس کے ساحلوں کے قریب سے دنیا کے تیل کا بڑا حصہ ہو کر گزرتا ہے۔

جب ہم وہاں گئے تھے تو اس وقت وہ ایک چھوٹا اور غربت زدہ گاؤں تھا جہاں خلیج کے سیدھے ہاتھ پر ایک نہایت جدید ہوٹل واقع تھا جو ایسے مشاورتی افسروں کو متوجہ کرنے کیلئے ضروری گردانا جاتا تھا جو اس افلاس زدہ قصبے کو عسکری صنعتی مرکز میں تبدیل کر سکتے تھے۔ ہم پانچوں ہوٹل کے پہلے چند گاہکوں میں سے تھے جب ہم رات کے کھانے کیلئے اکٹھے ہوئے تھے تو ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہم پانچ اور تین بیرے ہی اتنے بڑے ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔

ایرانی انجینئر مخاطب ہوا'' آپ پانچ سال بعد یہاں آئیے گا اور پھر اس جگہ کی حالت دیکھئے گا، آپ اس کو پہچان نہ پائیں گے۔ اس طرح یا اُس طرح اس کو بدلنا تو ہر حال میں ہوگا۔ چاہے آپ لوگ کریں یا پھر روسی۔''

وہاں سے اٹھنے کے بعد میں سگار تھامے رات کے اندھیرے میں مٹر گشت کرنے نکل پڑا۔ میں سمندر کی طرف جا رہا تھا وہاں میں نے ایک نوتعمیر شدہ بندرگاہ دیکھی جو ساحل سے آدھ میل کے فاصلے پر ہلکی سی خلیج تک پھیلی ہوئی تھی۔ چاند کہیں نظر نہیں آ رہا تھا مگر رات ستاروں کی وجہ سے جگمگا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا گھاٹ تک پہنچا تھا۔ ہوا خلیج میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جلتے سگار کے باوجود مجھے سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو آ رہی تھی۔ گہرے پانیوں کے دوسری طرف دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں سعودی عرب کے کنارے پر واقع ممالک کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔

واپسی میں کچھ دیر چلنے کے بعد میں رک گیا۔ مجھے جیسے ایک خوف کا جھٹکا سا لگا تھا۔ ایک

نہایت عجیب لال رنگ کا ہالا بندرگاہ کے کنارے پر ابھرا اور پھر غائب ہو گیا۔ میں یکدم ٹھہر گیا اور غور کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے جلد واپس ہوٹل پہنچ جانا چاہئے مگر تجسس کے باعث میں وہیں جما رہا۔ میں نے ایک اور قدم بڑھایا۔ جیسے ہی میری آنکھیں کسی چیز پر جمی تھیں تو میرے سامنے ایک شخص کا ہیولا سا سایہ آ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنا سگار اوپر کی طرف اٹھایا تو اس لال رنگ کے ہیولے نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ بھی سگریٹ یا سگار پی رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ میری نقل اتار رہا ہو۔ میں نے سگار نیچے کیا اس نے بھی ویسا ہی کیا۔ میں جتنا غور کر رہا تھا اتنا ہی میں اسے دیکھنے کیلئے بے چین ہو رہا تھا۔ میرا خوف ہوا ہو چکا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ کوئی چور اچکا بندرگاہ کے اس کونے کو منتخب نہیں کر سکتا تھا تو پھر وہ کون تھا؟ میرا ذہن روسیوں کی طرف گیا مگر ایک اکیلا روسی رات کے اس پہر کیا کرنے آئے گا۔

میں چلتا رہا۔ جان بوجھ کر میں اپنی رفتار تبدیل کر رہا تھا۔ میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں اس کی حقیقت جاننے کیلئے تیار ہوں اور مقابلہ کرنے کیلئے بھی طاقت رکھتا ہوں۔ شاید اس سے پچاس قدم دور مجھے احساس ہوا کہ ہو سکتا ہے وہ بھی میری موجودگی سے گھبرا گیا ہو یہ سوچ کر میں ہلکا ہو گا۔

وہ کھانسا۔

میں رک گیا۔

پھر وہ کچھ بولا ''معلوم نہیں فارسی زبان تھی یا عربی میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔''

میں نے دھیمے انداز میں کہا ''مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔''

اس نے جواب دیا ''امریکن، تم امریکن ہو، ہے ناں؟ میں تمہارے لہجہ اور چال سے بتا سکتا ہوں۔ میری انگریزی اچھی خاصی ہے۔''

میں بولا ''جی ہاں میں امریکن ہوں۔''

وہ بولا ''میں ترکی ہوں۔ تمہاری طرح ایک مہمان ہوں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔'' میں اس کی طرف بڑھا ہم نے مصافحہ کیا اس کا نام نسیم تھا۔ سگار نہیں وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے اپنا جغرافیہ بتاتے ہوئے کہا ''میں تاریخ کا پروفیسر ہوں اور قدیم کاروباری راستوں سے متعلق کتاب کیلئے تحقیق کر رہا ہوں۔ میں ایسے ہی چند راستوں پر چلتے ہوئے استنبول سے یہاں پہنچا ہوں۔ وہ مجھے یہاں لائے ہیں۔''

ہم کچھ دیر ایران کے متعلق ابھرنے والے تاثرات پر بات کرنے لگے۔ اس نے شاہ کیلئے اپنی نفرت کو چھپایا نہیں وہ اسے مستقل ''آمر بادشاہ'' پکار رہا تھا۔ اس لمحے تک ایران میں میں نے اور کسی کو شاہ پر تنقید کرتے نہیں سنا تھا۔ میں نے کچھ خفیہ کوششوں کے بارے میں پڑھا تھا جو اسے مسند اقتدار سے ہٹانا چاہتی تھیں مگر جتنے ایرانیوں کو میں جانتا تھا وہ سب شاہ کی حکومت کیلئے کسی نہ کسی طرح خدمات انجام دے رہے تھے لیکن یہ آدمی کچھ مختلف تھا۔ وہ کافی باخبر معلوم ہوتا تھا اور اپنی پسند ناپسند بتانے میں ہرگز جھجک نہیں رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ایک سامع کا میسر آنا اچھا لگ رہا تھا اور وہ بھی ایک ایسا امریکی حوالے سننے کیلئے تیار تھا اور جس سے ملنے کی اسے ہرگز توقع بھی نہ تھی۔ شاید وہ رات کا اثر تھا جگہ کا یا پھر سفر کی تھکن تھی لیکن بہرطور میں نسیم کے نقطہ نظر کو انہماک سے سننے کیلئے بالکل تیار تھا۔

وہ کہہ رہا تھا ''تم بھی اس مطلق العنان بادشاہ کے جھانسے میں آ گئے ہو۔ ویسے سب نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے صدر کو اصل حقیقت معلوم ہے اور دیگر لوگ جو تمہارے ملک کو چلا رہے ہیں اس بارے میں سب جانتے ہیں۔ آخر کار یہی تو ان کی اصل خاصیت ہے۔ دھوکہ۔ تمہارے حکمران اپنی تسلط پسندی کو خفیہ رکھتے ہیں یا رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان چیزوں کو مخفی رکھنا چاہتے ہیں جیسے کہ مال بنانا یا پھر کسی کو بہکانے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنا۔ وہ غریبوں کی مدد کرنے کے دعوے کرتے ہیں لیکن اس سچائی کو چھپاتے ہیں کہ وہ امیروں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ پھر اس نے ایک لمبا کش لگایا اور بولا ''تمہارا ملک نقاب پہنے ہوئے ہے۔''

اس دوران میں نے امریکہ کے دفاع میں کچھ کہنے کے بارے میں کئی بار سوچا لیکن نہ جانے کیوں اس کی بات سنتا رہا۔ ۱۹۷۳ء کی یام کپیر جنگ کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے مجھ سے دریافت کیا ''مصر اور شام نے اسرائیل پر حملہ کیوں کیا تھا؟ کیونکہ ان کے پاس اور کوئی حل ہی نہیں تھا۔ تم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اسرائیلی عربوں کے خلاف کس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں یا وہ کس طرح کا خطرہ ہیں۔ یا پھر اس بات کا کہ یہ ایک امریکی جنگ ہے اور اسرائیل اس کا ہراول دستہ ہے۔ کیا یہ کافی نہیں تھا کہ تم لوگوں نے فلسطین چرا لیا جس کو اس کے لوگ دارالسلام کہتے تھے جو ابد سے مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اس کو تم لوگوں نے یہودیوں کی جھولی میں ڈال دیا۔ تمہیں اور بھی بہت کچھ لینا ہو گا تم نے اپنی دولت کے ذریعے اسرائیلیوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ تم ان کیلئے سرزمین کی تعمیر کر رہے ہو۔ تم نے تاریخ کے آئینے میں مسلمانوں کی

توہین کرنے کی کوشش کی ہے۔تم جمہوریت کا راگ الاپتے ہو مگر ہم جانتے ہیں کہ تم جمہوریت کے
بارے میں کیا سوچتے ہو اور اس کا عملی ثبوت ہم نے اس وقت دیکھا تھا جب تم لوگوں نے سی آئی
اے کی مدد سے مصدق کو رسوا کیا تھا۔ اسرائیل جمہوریت کی مثال نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو
تحفظ دینا مقصد ہے جو ہٹلر کی نفرت کا نشانہ بنے تھے بلکہ تم ظلم کرتے ہو، جھوٹ بولتے ہو اور ڈاکہ
ڈالتے ہو صرف اور صرف تیل کے حصول کی خواہش سے مجبور ہو کر۔''

اس نے سیدھے ہاتھ میں سگریٹ پکڑی ہوئی تھی اور وہی ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولا
''میں اسرائیل کے یہودیوں سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ میں واقعی ان کیلئے پریشان ہوں۔ میں
فلسطینی نہیں ہوں اس لئے میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر جنگ شروع ہوئی تو میں
انہیں قتل بھی کروں گا یا اگر تم لوگوں نے ترکی کی سرحدوں میں گھسنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بخشوں گا
نہیں لیکن اس کے باوجود میں اسرائیلیوں سے ہمدردی رکھتا ہوں کیونکہ وہ ان بھیڑوں کی طرح ہیں
جنہیں فوجوں کے آگے چھوڑ دیا جائے۔ وہ ڈھال ہیں اصل ذمہ دار تم امریکی ہو۔تم یہودیوں کو
اپنی جانیں قربان کرنے پر اکساتے ہو اور دوسری طرف تمہاری کارپوریشنز تیل نکال نکال کر
خزانے بھر رہی ہیں۔ یہودی تمہاری رکھوالی کرنے والے کتے ہیں۔تم نے انہیں ایٹمی ہتھیار اس
لئے دیے ہیں تاکہ وہ ہم مسلمانوں پر قابو پا سکے۔تم ان کی فوجوں کو پیسہ دیتے ہو جبکہ فلسطینیوں
کے پاس کوئی فوج نہیں ہے بلکہ صرف یہ محبت کرنے والے سر پھرے نوجوان ہیں۔ نہ ہی ان کی
کوئی حکومت ہے اور نہ رہنے کو کوئی ٹھکانہ۔''

''تمہارے لئے اسرائیل صرف تسلط اور تیل کے حصول کا وسیلہ ہے جبکہ یہودیوں کیلئے وہ
ایک خواب ہے جو خواب ہی رہے گا۔ فلسطینیوں کیلئے یہ ان کا گھر ہے وہ گھر جو ان سے خالی کرا لیا
گیا ہے جبکہ عربوں کیلئے اسرائیل دشمن کا قلعہ ہے جو عرب زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور تمام مسلمانوں
کیلئے ایک رسوائی اور ذلت کی علامت ہے اور ایک وجہ ہے کہ ہم تمہیں ختم کر ڈالیں۔''

باب نمبر: ۳۸

ایران، عراق جنگ: معاشی تباہ کاروں کی ایک اور فتح

نسیم کا خیال مجھے تیس سال بعد آیا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں جون کی ایک رات جب میں مشرق وسطیٰ
کی فضاؤں سے گزرتا ہوا مصر کی طرف رواں دواں تھا جہاں سے میں نے تبت اور نیپال پہنچنے کیلئے
جہاز تبدیل کرنا تھا۔ خلیج فارس سے بندر عباس کے پار واقع اس ملک سے میں اپنے معاشی تباہ کار کی
ملازمت کے دنوں میں قطعاً ناواقف تھا۔ جہاز کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے میں یونان، ترکی،
شام، عراق اور ایران کے اوپر سورج غروب ہوتے دیکھنے لگا۔ میں اس وقت اپنی دادی کے
بارے میں سوچنے لگا کہ جب وہ سردیوں کی لمبی شاموں میں مجھے ''اوڈیسی، دی عریبین نائٹس'' اور
بائبل میں سے مختلف چیزیں بڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ میرا جہاز ان جزیروں کے اوپر سے گزر رہا تھا
جہاں ہومر کا مہم جو پھرا کرتا تھا اور وہاں سے ان پہاڑوں کے اوپر سے گزرا جہاں حضرت نوح علیہ
السلام نے اپنی کشتی تعمیر کی تھی، وہاں سے ہم ان فضاؤں میں داخل ہوئے جو اس جادوئی سرزمین
کے عین اوپر واقع تھیں جو بابل کے باغات کا اصل مقام تھا جہاں انسان نے پہلی بستیاں اور کھیت
بسائے تھے اور پھیلتی ہوئی زبانوں کی ابتدائی اشکال متعارف کرائی تھیں انہیں مقامات پر پہلی بار
پہیے اور جدید ریاضی کی بنیاد پڑی تھی۔ میں ان کہانیوں کو یاد کرنے لگا جنہوں نے کئی عرصہ تک مجھے
اپنا دیوانہ بنائے رکھا تھا جس میں بہادر رچرڈ کے قلعوں پر حملہ کرنے کے واقعات درج تھے اور ان
تفصیلات کا خلاصہ کیا گیا تھا کہ صلاح الدین نے کیسے ان کا دفاع کیا تھا اور پھر میری سوچ کا رخ
نسیم کی طرف مرکوز ہو گیا تھا۔

تاریخ نے پلک جھپکتے ہی اس کی پیشین گوئی کو حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں نے خود اس
کی بیان کردہ مکاریوں کو بے نقاب کرنے کیلئے ایک کتاب لکھ ڈالی تھی۔ اس کا ایرانی آمر تو زوال
پذیر ہو گیا تھا اور اس کی جگہ کٹر مولویوں نے لے لی تھی۔ اسرائیل بہت طاقتور ہو چکا تھا اور اسے
امریکہ کی ہر معاملے میں حمایت حاصل رہی تھی۔ فلسطینی اذیت سے دوچار تھے اور ساتھ ہی ساری
دنیا کو یہ بھی دکھا دیا تھا کہ بن لادن ایک شخص محدود طاقت رکھنے کے باوجود کتنا مضبوط ثابت ہو سکتا
تھا، امریکہ نے کتنے ہی جانے انجانے علاقوں میں بدترین بربریت کا مظاہرہ کیا تھا جس میں

صرف پانامہ، ہیٹی اور سوڈان ہی کے واقعات منظر عام پر آئے تھے۔ اس کے بعد ۹/۱۱ اور پھر عراق اور افغانستان کے واقعات ظہور پذیر ہوگئے تھے اور اس کرۂ ارض پر سالوں گزرنے کے باوجود ہم انسان اپنی بھائیوں اور بہنوں کو غلام بنانے اور قتل کرنے کی زور آور عادت کو ترک کرنے میں ناکام ہوگئے تھے۔ خون کے پیاسے صلیبی جنگجوؤں کو ہم ماضی میں دفن نہیں کر پائے تھے۔

میں اس صورتحال پر تھکن محسوس کر رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے مایوسی مجھ پر غلبہ حاصل کرتی جارہی ہے۔ ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے امریکہ نے اس جنگ کا آغاز کر دیا تھا جس کو مسلمان صلیبی جنگیں کہتے ہیں۔ جب ایک عشرے سے کم عرصے میں ہمارے جاسوس طیاروں نے پھر سے عراق پر حملہ کر دیا تھا اگرچہ غم و غصے کے جذبات نے عسکری تشدد کو زیادہ تر نمایاں کر کے پیش کیا تھا مگر میرے خیال کے مطابق مشرق وسطیٰ کے تیل کے سب سے بڑے ذخائر تک مکمل رسائی حاصل کرنے کیلئے واشنگٹن کا نہایت سادہ سا عمل تھا جس کی پیشین گوئی کرنا کافی آسان تھا اس کو قابو کرنا یا تباہ کرنا جو بھی مقصود تھا صدام سعودی عرب میں حاصل کی جانے والی معاشی تباہ کاری کی میری کامیابیوں کا ناگزیر نتیجہ محسوس ہوتا تھا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں واشنگٹن نے ایران کے خلاف صدام کی جنگ میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وہ جنگ اور صدام نہ صرف شاہ کو برطرف کرنے والے آیت اللہ خاندان کے خلاف انتقام کا ایک طریقہ جنہوں نے ہمارے سفارت خانے کو جلا کر بھسم کر دیا تھا امریکی پناہ گزینوں کو رسوا کیا تھا۔ معاشی تباہ کاروں نے اسے تیار کیا تھا۔ ہم نے اسے کئی بلین ڈالر دیئے تھے۔ بیک ٹیل نے اسے کیمیائی مواد تیار کرنے کے کارخانے بنا کر دیئے تھے جس سے ہمیں معلوم تھا کہ وہ ایرانیوں، کردوں اور شیعہ باغیوں کو قتل کرنے کیلئے سارین اور مسٹرڈ گیس تیار کرے گا۔ ہم نے اسے لڑاکا جیٹ، ٹینک اور میزائل فراہم کئے تھے اور اس کے فوجیوں کو انہیں چلانے کی تربیت بھی دی گئی تھی۔ ہم نے سعودیوں اور کویتیوں پر دباؤ ڈال کر صدام کو ۵۰ بلین ڈالر کا قرضہ دلوایا تھا۔

عراق میں رونما والے واقعات دیکھ کر مجھے اس ایرانی انجینئر کی باتیں یاد آجاتی ہیں جو مجھے اور مین (Main) کے دو انجینئرز کو کرمان سے بندر عباس لے کر گیا تھا۔ ایرانی عرب نہیں ہیں۔ وہ فارس کے آریا ہیں۔ اس نے کہا عرب ہمیں دھمکیاں دیتے ہیں۔ ایرانی امریکیوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم سو فیصد آپ کے ساتھ ہیں۔ اور اب اچانک حالات نیا رخ لے چکے تھے۔ ایرانی بُرے لوگ بن چکے اور ایک عرب شخص جس کا نام صدام ہے ہمارا حلیف بن گیا تھا۔

آٹھ سالہ ایران عراق جنگ جدید تاریخ کی چند طویل، مہنگی اور خونی جنگوں میں سے ایک تھی۔ ۱۹۸۸ء میں جب اس کا اختتام ہوا تھا تو ایک ملین سے زائد آبادی لقمۂ اجل بن چکی تھی۔ دونوں ملکوں کے گاؤں، کھیت اور معیشتیں تباہ ہو چکی تھیں مگر کارپوریٹوکریسی کو ایک اور فتح نصیب ہوئی تھی۔ اسلحہ فراہم کرنے اور اس کے ٹھیکیداروں نے خوب منافع اپنی جیبوں میں بھر لیا تھا۔ تیل کی قیمتیں بڑھ چکی تھیں۔ اس دوران معاشی تباہ کار صدام کو ''ساما'' (Sama) جیسا معاہدے کرنے کیلئے آمادہ کرتے رہے تھے جو میں نے سعودی خاندان کی مدد سے تیار کیا تھا۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ صدام سلطنت (ورلڈ آرڈر) کا حصہ بن جائے۔

مگر صدام مستقل انکار کر رہا تھا۔ اگر وہ بھی سعودی شاہی خاندان کی طرح تیار ہو جاتا تو اسے تحفظ کی ہماری یقین دہانیوں کے علاوہ امریکہ کے فراہم کردہ کیمیائی مواد تیار کرنے کے کارخانے اور اسلحہ ملتا رہتا لیکن جب یہ ظاہر ہو گیا کہ صدام اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے تو واشنگٹن نے کرائے کے قاتل روانہ کر دیے تھے۔ صدام جیسی شخصیت کے قتل میں عام طور پر حفاظتی گارڈز سازش کا حصہ ہوتے ہیں جن معاملات کو میں نے ذاتی طور پر مشاہدہ کیا تھا وہ ایکواڈور کے رالڈس اور پانامہ کے ٹوریجوس کے قتل کی سازشیں تھیں اور میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے حفاظتی اہلکار یونائیٹڈ اسٹیٹس اسکول آف امریکاز سے تربیت یافتہ تھے اور انہیں طیارے تباہ کرنے کیلئے رشوتیں دی گئی تھیں۔ صدام ایسے قاتلوں اور ان کے حربوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسے خود سی آئی اے نے ساٹھ کی دہائی میں قاسم کے قتل میں استعمال کیا تھا اور اس نے اس شعبے کے اسرار و رموز اپنے حلیف امریکہ سے اسی کی دہائی میں سیکھے تھے۔ اس کے حفاظتی اہلکار بھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ جس کی وہ حفاظت کر رہے ہیں وہ اصلی صدام ہے یا بہروپیا۔

قتل کی کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔ اسی لئے ۱۹۹۱ء میں واشنگٹن نے آخری ترکیب استعمال کرنے کی ٹھانی تھی۔ پہلے صدر بش نے امریکی فوج کو روانہ کر دیا تھا۔ اس مرحلے پر امریکہ صدام کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اسے پسند کرتے تھے کیونکہ ایک تو اپنے لوگوں کو طاقت کے ذریعے دبا سکتا تھا اور دوسرا وہ ایران کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ پینٹاگون کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی فوج ختم کر کے وہ صدام کو سبق سکھا سکتے تھے لیکن اب وہ واپس اپنی ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے۔ معاشی تباہ کاروں نے نوے کی دہائی میں اس کو منانے کی بہت کوششیں کی تھیں مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ اس دفعہ بھی کرائے کے قاتل ناکام ہوگئے تھے اور اس بار صدر بش نے فوج کا سہارا لیا

تھا۔صدام کو برطرف کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔

عراق پر دوسری بار قبضہ کرنے کی مہم جوئی نے مسلمان مجاہدین کو بڑے واضح اشارے دیئے تھے۔وہ مان گئے تھے کہ ۱۱/۹ صرف ایک حیلہ تھا اوران جہازوں کو ہائی جیک کرنے والے کسی بھی طرح صدام یا عراق سے منسلک نہیں تھے۔وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ عیسائی قدامت پرست امریکی سیاست پر خاصا اثر ورسوخ رکھتے ہیں اوران کے اسرائیلی شخصیات سے گہرے تعلقات ہیں اور وہ مشرق وسطیٰ کو محکوم بنا کر دنیا بھر سے تیل کے ذخائر نقل وحمل کے راستوں پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں کافی پر عزم ہیں۔

اس سلسلے میں عرب ردّعمل توقعات کے مطابق تھا۔برطانیہ کے بادشاہ رچرڈ سے لے کر صدر بش جونیئر تک عربوں نے دو چیزیں بالکل واضح کر دی تھیں (۱) وہ یورپی اور اب امریکیوں سے فاصلہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور (۲) وہ اپنی حکومتوں کی تشکیل اسلامی قوانین کے مطابق کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے سیکولر جمہوری قوانین کو اپنے نظام کا حصہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے عوام یورپ کو قبائلی زمینوں پر ظالمانہ انداز میں سرحدیں بنانے اوران کی دور دراز ریاستوں میں اپنے پسند کے بادشاہ بٹھانے کے عمل پر کبھی معاف نہیں کر پائے تھے۔۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ صدی عیسوی کے درمیان پیدا ہونے والی نفرتیں اب تک پرورش پا رہی تھیں۔بہت سے عرب یہ مان کر چلتے ہیں کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد امریکہ کی سربراہی میں تشکیل پانے والی سلطنتوں کے بھی ویسے ہی عزائم ہیں جیسے صلیبی قوتوں کے تھے۔نسیم جیسے زیادہ شعور رکھنے والوں کو شروع سے یہ شبہ تھا کہ اسرائیل پریشان حال لوگوں کی جائے پناہ سے کچھ زیادہ تھا۔۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو جب وزیراعظم ڈیوڈ بین گورین نے نئی اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا تو فوراً ہی مصر، شام، اردن، عراق اور لبنان نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔اگلے چند سالوں میں مسلم شکوک وشبہات کو مزید تقویت اس وقت ملی جب امریکہ کی اس ملک کیلئے غیر مشروط حمایت جاری رہی جس نے پے در پے کئی جنگوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ زمینی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔وہ اس معاہدے پر بھی شدید مشتعل ہوئے تھے جو سعودی عرب نے معاشی تباہ کاروں کے ساتھ کیے تھے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات کی سرزمین کو مغربیت کی طرف دھکیلا گیا تھا۔۱۹۹۱ء میں عراق پر حملہ اوراس کے بعد امریکہ کے اس خطے میں فوجی موجودگی نے ان کے اس خیال کو مزید پختگی بخشی تھی کہ مغرب انہیں روایات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جن کو قرونِ وسطیٰ کے یورپی جنونیوں

نے متعارف کرایا تھا۔دوسری دفعہ قبضہ کرنا مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کیلئے ناقابل برداشت اہانت تھی اس نے عرب مجاہدین کو نئے جواز فراہم کر دیئے تھے۔دنیا بھر کی اکثریتی آبادی کی آنکھوں میں وہ دہشت گرد سے مجاہدین آزادی میں تبدیل ہو چکے تھے اور ایسے خیالات رکھنے والوں کی تعداد صرف مسلم دنیا تک محدود نہیں تھی۔

میری پریشانی اسلحہ کے ذخائر میں اضافہ کے بارے میں سوچ کر بے تحاشہ بڑھ جاتی تھی اور اس روپے کے مشرق وسطیٰ میں اثرات دل میں شدید بے چینی کا باعث بنتے تھے۔پہلے کی دنیا میں کبھی اتنا اسلحہ نہیں پایا جاتا تھا۔کارپریٹوکریسی ان تمام معیشتوں سے مزے لوٹ رہی تھی جو عسکری آلات کی تیاری پر انحصار کرتی ہیں۔ہمارے اسلحہ بنانے والے کارخانے دنیا کے چند نہایت منافع بخش اداروں میں شامل ہیں۔برطانیہ، فرانس، روس اور برازیل کے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کے ساتھ ساتھ روایتی ہتھیار کے ذخائر ہو سکتا ہے معیشتوں کو ترقی دینے کا باعث بن رہے ہوں مگر ان سے قتل عام کے خطرات بھی بڑھ رہے ہیں۔اسلحے کا استعمال عالمی جنون میں تبدیل ہو چکا ہے۔کسی بھی ملک کا سیاسی استحکام اس کی فوجوں کی تعداد اور قوت سے لگایا جاتا ہے۔کارپریٹوکریسی نے موت کے کاروبار کا رشتہ بین الاقوامی سفارت کاری سے جوڑ دیا ہے۔مثال کے طور پر اسرائیل اور مصر ہر سال واشنگٹن سے کئی بلین ڈالر وصول کرتے ہیں کیونکہ وہ ۱۹۷۸ء کے کیمپ ڈیوڈ معاہدوں کے پابند ہیں اوراس امن معاہدے کے مطابق وصول کی جانے والی رقم کے بڑے حصے کو دونوں ممالک امریکی عسکری آلات خریدنے کیلئے مختص کریں گے۔

میرا جہاز اندھیرے میں گم ہو رہا تھا اور میں اس وقت علاقائی سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔جب میں فرینک اور جیمس کے ہمراہ کرمان سے بندرعباس گیا تھا۔ہم اس قدیم صحرائی راستے سے جہاں کبھی کارواں گزرا کرتے تھے اس وقت گزرے تھے جب ویتنام جنگ اختتام پذیر ہو رہی تھی۔اس کے بعد مشرق وسطیٰ اسلحہ کی جانچ اور فروخت کا مرکز بن گیا تھا اور بعد میں جب سرد جنگ ختم ہوئی تو اسلامی انقلابیوں نے کمیونسٹوں کی جگہ لے لی تھی تاکہ جنگ کا یہ گندا کھیل اسی طرح چلتا رہے۔تاریخ کی بنیادی معلومات نے اس کھیل اوراس کھیل کے پس منظر میں ہونے والی سیاسی محرکات کو عریاں کر دیا ہے۔میں حیران ہوتا ہوں کہ کیا آج بھی تعلیم یافتہ لوگ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہوں گے کہ تمام جنگیں اعلیٰ نظریات کیلئے لڑی جا رہی ہیں۔معاشی تباہ کاروں اور میڈیا کی طاقتور شخصیات نے گمراہ کن معلومات کے ذریعے ان

اور تسلط کو آزادی اور جمہوریت میں بدل کر رکھ دیا وہ یقیناً کارپریٹو کریسی کے بہترین خدمت گار ہیں۔

جس وقت میرا جہاز قطر میں اترا تھا تو اس وقت تک میں لگاتار چوبیس گھنٹے سفر میں رہا تھا۔ میں اوقات کی تبدیلی اور تھکن سے بے حال ہو گیا تھا اور میں ہرگز اس آدمی سے ملنے کیلئے تیار نہ تھا جس سے میری اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔

قطر اور دبئ: ملاؤں کی سرزمین پر لاس ویگاس

قطر ایئرپورٹ پر اترتے ہی میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے پر میں حیران رہ گیا تھا کیونکہ یہ جگہ ماضی کے مشرق وسطیٰ کے ایئرپورٹ کے بجائے جدید شاپنگ مال لگ رہا تھا۔ صرف چند لوگوں کو دیکھ کر ہی ماضی کی یادیں تازہ ہوئی تھیں جس میں سے مردوں کے ایک گروپ نے لمبے روایتی چغے اور کفیہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ عورتیں حجاب میں نظر آ رہی تھیں۔

آئس کریم خریدتے ہوئے میری ایک شخص سے ہلکی سی گفتگو ہوئی جو نیلی جینز، پولو کی قمیص اور سادہ سا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ لاس اینجلس میں جائیداد کی خرید و فروخت کے کاروبار سے منسلک تھا۔ میں نے ایئرپورٹ کے متعلق اپنی حیرانگی کا اظہار کیا تو اس نے جواب میں کہا ''بہت سے لوگ مشرق وسطیٰ میں ہونے والی پرتشدد کارروائیوں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں لیکن اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے زیادہ بہتر رخ۔ آپ اس عمارت کو ہی لے لیجئے اگرچہ یہ کسی بھی طرح دبئی عمارات جیسی نہیں ہے۔ اس تمام خونریزی کیلئے پیسہ خلیج فارس کی دوسرے پار کے ملکوں سے آتا ہے جس کو امیروں کا کلب کہا جاتا ہے۔ کٹر سرمایہ دار مادہ پرست ممالک، پکے لالچی۔ وہ کہہ کر مسکرا پڑا جبکہ میری طرح کے لوگ جب یہاں آتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان باقی تمام انسانوں کی طرح ہیں۔ انہیں بھی ہیرے اور سونے پسند ہیں، وہ بھی رولیکس اور مرسیڈیز سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ عرب یقیناً فقیرانہ زندگی کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں جیسے اللہ کے احکامات ماننا، قرضوں پر سود نہ لینا، عورتوں کو پردے میں رکھنا اور اس طرح کی ہزار اور باتیں مگر ذرا اپنے اردگرد دیکھئے یہ لوگ ان پر ہرگز عمل نہیں کرتے ہیں۔''

ہم پیسے دینے کی جگہ پر پہنچے۔ وہ آئس کریم کی قیمت خود ادا کرنا چاہتا تھا۔ ہم میزوں کے ہجوم میں گھوم رہے تھے جو امریکہ میں واقعی کسی شاپنگ مال کے مساوی ہی تھا اور پھر ایک مناسب جگہ ڈھونڈ کر بیٹھ گئے۔ وہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کپ پر لگی آئس کریم زبان سے چاٹتے ہوئے بولا ''اس جیسی جگہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ عرب اللہ کر کے سینکڑوں، ہزاروں مزدوروں اور قوی ہیکل بلڈوزروں سے سمندروں کی کھدائی، نکاسی، صفائی کراتے ہیں اور ان پر [illegible]

ہیں۔دبئی دنیامیں کسی بھی ملک سے تیزی سے بلنداور بڑاہوتا جارہا ہے۔یہاں پراسّی میٹراندرونی برفانی ڈھلان بنائی گئی ہے۔دنیا کا سب سے اونچا ہوٹل یہاں واقع ہےاور جلد ہی دنیا کی بلند ترین عمارت بھی تعمیر ہوجائے گی۔'' وہ اب اپنی آئس کریم کون پرحملہ آور ہوگیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے الفاظ اس کو مزید کھانے پر مجبور کررہے تھے۔''اب ذراسوچیں دبئی دنیا بھر کا مرکز بنا ہوا ہے۔سینکڑوں انسان کے تعمیر کردہ جزائر ہرایک کسی نہ کسی ملک یاعلاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔
یہ سارے کے سارے پانچ میل چوڑے اور پانچ میل لمبے حصے میں وہاں بکھرے ہوئے ہیں جہاں کبھی خلیج فارس ہوا کرتی تھی جوجائیداد کا کاروبار کرنے والوں کاحسین تر خواب ہے۔''اس نے آئس کریم ختم کر کے اپنی جینز سے ہاتھ پونچھے''تمہارا کیا خیال ہے یہ لوگ شراب وشباب سے لطف اندوزنہیں ہوتے؟ ذرا سوچ لو۔دبئی میں سب چلتا ہے۔بہترین شراب، جواخانے، حسین عورتیں، منشیات اورطوائفیں، اگر آپ کی جیب میں پیسہ ہےتو آپ کچھ بھی خرید سکتے ہیں کچھ بھی۔''

جب میرا جہاز قطر سے روانہ ہوا تو خلیج فارس ستاروں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔یہ بالکل ویسی ہی رات تھی جیسی میں نے بندرعباس میں گزاری تھی۔میں سوچ رہا تھا کیا وہ لمبی بندرگاہ آج بھی وہاں موجود ہوگی جہاں میں نسیم سے ملا تھا شاید یہیں میرے جہاز کے نیچے ہی کہیں واقع ہو لیکن اس تاریکی میں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔میں وہ دوریاد کرنے لگا جب میری معاشی تباہ کار کی ملازمت کے اختتامی دنوں میں صدر کارٹر کا سیاسی مستقبل ایران کے گرد گھوم رہا تھا کہ اس دور میں نسیم کی نفرت کا محور شاہ ایران زوال پذیر ہو چکا تھا۔امریکی سفارت خانے پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ باون لوگوں کو یرغمال بنالیا گیا تھا اور صدر یہ کہہ کہہ کر اپنے دعوؤں میں زور لانے کی کوشش کررہا تھا کہ خلیج فارس پر قبضہ کرنے کی کسی کوشش کو براہِ راست امریکہ مخالف اقدام سمجھا جائے گا اور ایسی کسی بھی کوشش کو عسکریت کے ذریعے ناکام بنایا جائے گا۔
کارٹر کی دھمکی صرف دھمکی نہ تھی۔اس نے یرغمالی چھڑانے کیلئے ڈیلٹا فورس روانہ کردی تھی۔
وہ حکمت عملی بدترین ناکامی سے دوچار ہوئی تھی مگر اب مجھے اندازہ ہوا کہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ کے متعلق مکمل حکمت عملی خصوصاً اسرائیل کی حمایت اورعرب حکومتوں جیسے سعودی عرب، کویت اورمصر کے ساتھ کئے جانے والے معاہدے کارپوریٹوکریسی کے بڑے مفادات کیلئے کتنا اہم تھا۔اگرچہ ایران اورعراق کی واضح نظر آنے والی حکمت عملیاں بری حالت میں تھیں بلکہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم

نے عرب دنیا کو دوبارہ اپنے گروہ کا حصہ بنالیا تھا۔دبئی میں ہم نے انہیں دنیا بیچ دی تھی۔چین کی طرح مشرق وسطیٰ بھی مادہ پرستی کے عوض بک گیا تھا۔
جہاز اچانک اترنے لگا۔میری کھڑکی سے بہت ساری روشنیاں نظر آرہی تھیں۔میں نے بندرعباس دیکھی، میں اس بندرگاہ کو ڈھونڈنے لگا۔پھر مجھے احساس ہوا کہ روشنیوں کا یہ جھمگٹا جنوب میں واقع ایک خلیج نظر آرہا تھا وہاں نہیں جہاں بندرعباس واقع تھی۔مجھے دبئی نظر آرہا تھا جو میرے آخری دورے کے موقع پر جہاز سے نظر ہی نہ آپایا تھا۔وہ بھی ایک گمنام سا گاؤں تھا لیکن اب یہ دنیا کیلئے شاپنگ، جوا، تفریح اور ہوٹلوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔
میں اسے اچک اچک کر دیکھنے لگا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ ان عربوں کی ذہن کی پیداوار ہے جو روایتی اسلامی عقائد پر یقین رکھتے ہیں اورانہوں نے پاکیزگی بھرے مکہ کے قرب میں اس کی ضد تعمیر کردی تھی۔میرے بالکل نیچے ایک یادگار تک رسائی کا راستہ تھا جس کو دیکھ کر قلوپطرہ اور بادشاہ ٹٹ بہت سراہتا مگر بن لادن؟
میں مین (Main) کے صدر جیک ڈاؤبر کے کلمات کو یاد کرنے لگا جو اس نے اس وقت ادا کئے تھے جب میں اور میری بیوی اس کی اہلیہ کے ساتھ رات کا کھانا کھانے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل انڈونیشیا گئے تھے اور ڈالر کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے تیل کو نیا عالمی معیار بنانے کے بارے میں بات کررہے تھے۔وہ کتنا صحیح تھا جب اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا تھا''امریکہ دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب درج کرنے جارہا ہے'' تو وہ بھی بالکل درست تجزیہ تھا۔آج ایک تہائی صدی گزرنے کے بعد وہ دور تقریباً ختم ہورہا ہےاور اب سب کچھ بالکل الگ اور منفرد ظہور پذیر ہورہا ہے۔

عمیق کھائی

کئی سالوں تک کارپریٹوکریسی کی حکمت عملیاں مین (Main) کے جیک ڈاؤبر اور اس جیسے کئی دوسری کاروباری شخصیات کو بہت کامیاب اور دلکش نظر آتی تھیں مگر ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں آگے چل کر رونما ہونے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ تمام سازشیں ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔ انہوں نے ۱۹۹۷ء میں ایشیاء کو معاشی بحران کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چین مادہ پرستی کی ہوس کے دروازے کھول کر عالمی قیادت کا کردار ادا کر رہا تھا جو امریکہ سے قدرے مماثلت رکھتا تھا اور ایشیاء کے غریب اور امیر طبقے میں لامتناہی فاصلہ پیدا کر دیا گیا تھا۔ لاطینی امریکہ میں ہماری حرکتوں نے لاکھوں انسانوں کی زندگی کو مفلسی کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ ترقی کرتے متوسط طبقے کے ارمانوں کو کچلا تھا جس کے نتیجے میں مقامی اور علاقائی بغاوتوں کو قوت بخشی تھی اور اس سے کارپریٹوکریسی مخالف رہنماؤں نے جنم لیا تھا۔

مگر واشنگٹن اپنی ناکامیوں کو مسلسل جھٹلاتا رہا ہے۔ اخبارات، رسالے، میگزین اور انٹرنیٹ ایسی خبروں سے بھرے پڑے ہیں جو بدعنوان غیر ملکی سرکاری افسروں، جنونیوں اور ہٹ دھرم آمروں کو ان تمام ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں جبکہ کارپریٹوکریسی کو اپنے نیک اور پاکباز حلقے کی طرح پیش کیا جاتا ہے جو جمہوریت کو فروغ دے رہا ہے۔ کبھی کبھار ہی اس بات کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے ان سرکاری افسروں کو بدعنوانی پر مجبور کیا تھا اور ہمارے جبر پر مبنی حکمت عملیوں نے مذہبی جنونیت کو طاقت بخشی تھی یا یہ کہ تعمیری دنیا کے جن رہنماؤں کو ہم نے آمروں کے طور پر پیش کیا تھا وہ دراصل جمہوری طور پر مستحسن عوامی نمائندے تھے جو شاید امریکی صدور سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے۔ سیاستدانوں، کارپوریٹ عہدیداروں اور اس منصوبے میں شریک پریس کی متفقہ کوششوں سے ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں غیر موثر امریکی خارجہ پالیسی کو امریکی عوام سے چھپایا جاسکا تھا۔

اگرچہ یہ ناکامیاں مشرق وسطیٰ میں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ عراق پر قبضے سے پہلے یہ حقائق واضح ہو گئے تھے کہ کارپریٹوکریسی ناکام ہو چکی تھی اور معاشی تباہ کاروں کے منصوبے غلط رخ

اختیار کر کے ہمیں ہی نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہر طرف تشدد قابو سے باہر ہو گیا تھا، امریکیوں کیلئے نفرت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ کرمٹ روزویلٹ کی سازش نے پلٹ کر وار کیا تھا جب ۱۹۷۹ء میں جنگجو قوم پرستوں نے شاہِ ایران کو تخت سے بے دخل کر دیا تھا۔ اسرائیل کیلئے امریکی حمایت نے لاکھوں فلسطینیوں کو بے گھر کر دیا تھا، نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر دی تھی اور دنیا کے ہر کونے میں مسلمانوں کے غیض وغضب کو للکارا گیا تھا۔ سعودی عرب کا روپ بدل کر اسے مغربی نمونے میں تبدیل کرنے پر قدامت پرست مسلمان مشتعل تھے۔ آکسفورڈ اور ہارورڈ میں تعلیم حاصل کرنے والے عرب تیل ہتھیانے کی سازش کو بخوبی جان چکے تھے۔

ستمبر ۲۰۰۱ء کو اسلامی مددگاروں اور اسرائیل کی صورت میں کھڑی پالتو فوج کے اشتراک سے تیل ہتھیانے کے کارپریٹوکریسی کے خواب کو دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔

اس کے جواب میں امریکی ردعمل کافی جانا پہچانا تھا اور اپنی وجوہات کی وجہ سے یہ ملک خطرات سے دوچار ہوا تھا۔ افغانستان میں مدافعت کر کے ہم سے ہمدردی کرنے والی دنیا ہمارے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عراق پر حملہ کرنے سے ہی دنیا کو یہ پیغام ملا تھا کہ امریکہ ایک بار پھر اسامہ بن لادن کے سراغ لگانے کی بجائے تیل کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اگر اس رویے کے وسیع پہلو پر غور کریں گے تو اس نے مسلمان آبادیوں کو مزید مشتعل کر دیا تھا، لاکھوں لوگوں کو دہشت گرد بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ امریکی فوج کی کمزوریوں کو نمایاں کر دیا تھا اور امریکہ کو دیوالیہ پن کی دلدل میں غرق ہونے کے خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ ۹/۱۱ کے بعد منظر عام پر آنے والی حکمت عملیاں دراصل سب سے واضح اور شاید آخری حماقتوں میں سے تھیں۔ کارپریٹوکریسی جن حرکتوں کو کامیابیوں سے عبارت کرتی تھی جیسے کہ شاہ ایران اور سعودی خاندان کا ظہور، کویت اور اردن کے حکمران خاندانوں کا قیام، مصر میں دوستانہ آمر کو مضبوط کرنا اور اسرائیلی عسکریت پسندی کی حمایت وغیرہ کے بڑے ہم وزن نقصانات بھی تھے جیسے کہ مولویوں کا قوت بن کر ابھرنا، القاعدہ کی مقبولیت، جدید حکومتوں کے بجائے کٹر اور قدامت پرست حکومتوں کا قیام، خودکش حملہ آوروں کا ہیرو سمجھا جانا اور مذہبی جنونیت کا زور پکڑنا۔

پھر لبنان بھی وہاں کے میرے پہلے دور کے فوراً بعد ہی دوبارہ جنگ کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ طوفان فروری ۲۰۰۵ء میں اس وقت برپا ہوا تھا جب سابق وزیر اعظم رفیق حریری کار بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے تھے ان کی موت کے فوراً بعد شدید احتجاج اور وسیع پیمانے پر مظاہرے دیکھنے میں

آئے تھے۔ ان کے قتل کے بعد جمہوری طور پر منتخب نئی حکومت ملک کے سب سے بڑے قلعے کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہوئی تھی جن کا نام ''حزب اللہ'' جو ایک شیعہ تنظیم ہے جس کے رہنماؤں کو واشنگٹن ''دہشت گرد'' کہہ کر پکارتا ہے۔

۲۰۰۶ کی گرمیوں میں اسرائیل نے لبنان پر بھرپور فضائی حملے شروع کر دیے تھے جس سے بیروت کا بڑا حصہ برباد ہو گیا تھا۔ معصوم شہری مارے جا رہے تھے اور شام کو جانے والی مرکزی شاہراہ تباہ ہو گئی تھی۔ اگرچہ دنیا کے بیشتر رہنماؤں نے اس حملے کو لبنانی حکومت کو ختم کرنے کی غیر ذمہ دارانہ کوشش گردانا تھا مگر واشنگٹن اسرائیل کا دفاع کرنے پر تلا ہوا تھا۔ امریکہ کو دوبارہ تیل کے حصول اور تجارتی مفادات کو دنیا کے امن اور مشرقِ وسطیٰ کے استحکام پر فوقیت دینے کیلئے تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

آج سیاسی ماہرین، امریکی منصوبہ سازوں کی ہٹ دھرمی پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں بالخصوص جبکہ ایسی ہی حماقتوں کی سزا وہ ویتنام جنگ کی صورت میں پہلے ہی بھگت چکے ہیں۔ شمالی ویتنامیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ دنیا کی سب سے جدید اور امیر فوجی قوت ناقابلِ شکست نہیں ہے تو پھر ایک تہائی صدی بعد وہائٹ ہاؤس، کانگریس اور پینٹاگون کو یہ سمجھ کیوں نہیں آ رہا ہے؟ اتنے سارے تجربہ کار کیوں اتنی مہلک غلطیاں کر رہے ہیں؟

شاید اس کا جواب اس حقیقت کے گرد گھومتا ہے کہ کارپوریٹوکریسی بے تحاشہ منافع کماتی ہے اور تمام تر تکنیکی خامیوں سے قطع نظر ان منافعوں کی وجہ سے یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ جنگ برپا کرنے والی مشینری ہر لحاظ سے معاشی اور مالی فوائد کا باعث بنتی ہے چاہے وہ ناکام ہو یا کامیاب، امریکی ٹھیکیداروں نے ویتنام، افغانستان اور عراق اور کئی ایسی جگہوں سے لامحدود منافع کمایا تھا جہاں عسکری تنازعات سے تباہی ہو چکی تھی لیکن ان جنگوں میں مرنے والوں کے خاندانوں کو امریکہ کو بحیثیت قوم اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی لیکن کارپوریٹوکریسی کو تو بے تحاشہ فائدہ پہنچا تھا۔

عراق میں کی جانے والی غلطیاں ہمارے مستقبل کیلئے ویتنام سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوں گی۔ واشنگٹن کی ان یقین دہانیوں کے باوجود کہ ایک کے بعد دوسرا ملک سرد جنگ میں کمیونزم کا نشانہ بنتا جا رہا تھا یہ حقیقت ہے کہ ویتنام ایک علاقائی تنازع تھا۔ اس کے برعکس عراق کی جنگ پورے خطے میں پھیلی ہمارے لئے نفرت کی وجہ سے تہذیبوں کا تصادم بن گیا ہے۔ اس جنگ میں

صرف عیسائی اور یہودی مسلمانوں کے خلاف صف آرا نہیں ہیں بلکہ یہ اس زمین کے باشندوں کا تباہ کن مادہ پرستی کے خلاف اظہار رائے کا موقع ہے۔

دبئی جیسے مقامات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کارپوریٹوکریسی رائے دہی کے اس طریقے میں بھی بھاری ثابت ہو جائے گی مگر ہمیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ ایران، عراق، مصر، لبنان، اسرائیل اور شام میں نشر ہونے والی خبروں پر ایک نظر ڈالتے جائیں تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ دبئی ایک دھوکہ ہے۔ ریگستان میں نخلستان نظر آنے والا ایک سراب ہے۔ ۲۰۰۰ء کے پہلے عشرے کے اختتام پر ہم صرف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کارپوریٹوکریسی ہمیں تاریخ کی عمیق گہرائیوں میں لے جا چکی ہے اور یہ گہرائیاں افریقہ سے زیادہ کہیں اور اتنی گہری اور تاریک نظر نہیں آئیں۔

جدید فاتحین

''اگر کبھی زندگی میں بچے پیدا کرنے کا ارادہ ہو اور انہیں ایک آرام دہ زندگی بھی دینا چاہتے ہو تو پھر ہر حال میں اس بات کو یقینی بناؤ کہ ہم افریقہ پر مکمل قابو حاصل کرلیں۔''

جارج رچ کی اس تنبیہ نے مجھے اپنے تضادات کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان امریکی مشاورتی ماہرین کو برداشت کرنے کی ہمت دی تھی جن کے ساتھ میں ۱۹۷۴ء میں الیگزینڈریا کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس کا سایہ قاہرہ سے لے کر غزہ کے اہرام تک میرا پیچھا کرتا آیا تھا اور اب وہ مصری حکومت کے عہدیدار کے اوپر منڈلا رہا تھا جو لکڑی کی دیوار سے بنی اس بڑی ساری چیز کے دوسرے کونے پر کھڑا ہوا تھا۔ کرائے کے حاصل کئے اس مکان کے جو کھانے کے کمرے کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی مہیب محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نہایت پھیلا ہوا مکان گزرے ہوئے زمانے کی یاد دلاتا تھا اسے ایک برطانوی تاجر نے افریقی ہاتھی دانت، ممی کے ڈھانچے اور قدیم مقبروں سے چرائے ہوئے جواہرات کو یورپی میوزیم کو بیچ بیچ کر جمع کی ہوئی دولت سے تعمیر کیا تھا۔

ایک افسر نے بیزار کن انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا ''تاریخ ثابت کرتی ہے کہ مصر اس کتے کا سر ہے جس کا جسم افریقہ ہے، اس کی نظریں میز کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ ہم سب دس کے دس امریکی شہریوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جو وہاں پانی، نکاسی اور دیگر دوسری بنیادی ضروریات کا نظام تعمیر کرنے کے کام پر مامور تھے۔ آپ عزت مآب انور سادات کے لئے امریکہ کو قبول کرنے کا عمل آسان بنادیں۔ مجھے یقین ہے کہ پھر افریقہ ہمارے دیکھا دیکھی امریکہ کا دوست بن جائے گا اور پھر پوری دنیا کیلئے صرف سرمایہ دارانہ نظام قابل قبول ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے بیروں کو کھانا پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

کولوراڈو کا سول انجینئر مخاطب ہوا ''ہم وہ گھڑ سوار دستہ ہیں جو قلعہ کو بچانے کیلئے عین وقت پر پہنچ گیا۔''

اس بات کو دل سے ماننے میں کہ مصر بقیہ براعظم افریقہ میں ترقی کیلئے بنیادی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے ہمیں کافی صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ہم امریکی مشاورتی ماہرین اپنی

نفاست پر کافی نازاں تھے۔ ہمیں اپنی ہی قابلیت پر بھی کافی زعم تھا کہ ہم پیچیدہ ترین مسائل کو اعداد وشمار میں مختصراً بیان کرسکتے ہیں جن کی نقشوں اور خاکوں کے ذریعے تشریح کی جاسکتی تھی۔ ہم سے اکثر ماہرین پی ایچ ڈی تھے۔ بقیہ بھی جدید ترین علوم میں اعلیٰ ترین اسناد کے حامل تھے۔ سوائے میرے جو صرف سائنس کے مضمون کی ڈگری یافتہ تھا اور اسی وجہ سے اکثر مواقعوں پر خاموشی سے کام لیا کرتا تھا۔ زیادہ تر ترقیاتی ماہرین کی طرح ہم بھی ہر وقت اس بات کو یقینی بنانے میں مصروف رہتے تھے کہ الیگزینڈریا میں ہمارا کام پورے براعظم میں ایک نئے باب کا اضافہ کردے گا اور تیسرے ہزاریئے کے آغاز تک افریقہ کے گھمبیر ترین مسائل قصہ پارینہ بن چکے ہوں گے۔

ہماری جماعت کی اکثریت زیادہ تر امریکیوں کی طرح اس سب کو بہت آسان تصور کرتے تھے۔ ماضی کی بڑی بڑی سلطنتوں کی طرح ان جدید جنگجو فاتحین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں تا کہ وہ بے راہ رو معاشروں کو ہو بہو اپنے خاکے میں ڈھال سکیں۔ ان لادین لوگوں کو تحفظ حاصل ہوسکتا تھا اگر وہ سب کیتھولک ہو جائیں یا عصر حاضر کی اصطلاح میں جمہوریت پر یقین کرنے لگیں۔ اگر وہ صدق دل سے سیزر یا بادشاہ یا امریکی صدر کی روشن خیال قیادت کو قبول کرلیں۔

اگرچہ میں یہ تمام باتیں پورے اعتماد سے مان لینا چاہتا تھا لیکن دن بدن میں زیادہ قنوطی ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان تمام توجیہات کو چاہے انڈونیشیا میں سنتا یا ایران، کولمبیا اور مصر میں ان میں مجھے وہی مذہبی رنگ نظر آتا تھا جو میری کیلون پرورش سے مماثلت رکھتے تھے۔ ان میں مجھے نیوانگلینڈ کاٹن ماتھر کی ابتدائی پیوریٹنکل تعلیمات سنائی دیتی تھیں مگر اس سب کے باوجود کیا میں یقین کرسکتا تھا کہ ......

جہنم کی آگ صرف ان پر اثر انداز ہوگی جو سوویت یونین کے حمایتی تھے۔ کیا سینٹ پیٹر جنت کے دروازے پر کھڑے سرمایہ دارانہ نظام کے ماننے والوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیں گے؟ اور اگر کوئی مجھے ان تمام سوالات کا جواب ''ہاں'' میں دینے پر آمادہ کرے تو کیا پھر بھی کوئی ہمیں آگ سے بچا پائے گا؟ کس زاویے سے امریکی حرکتیں آزاد منڈی کے سرمایہ دارانہ نظام جیسے محسوس ہوتی ہیں؟ جو کچھ بھی میں دیکھتا ہوں وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ چھوٹے قصبے کے معمولی کاروباری طبقہ عنقا ہوتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ کھانے پینے کے بڑے بڑے ہوٹلوں اور قومی ہیکل کارپوریشنز نے لے لی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت ہم ۱۸۰۰ء کے اوائل میں اجارہ داری کرنے والے اداروں کی طرف واپس لوٹ جائیں اور اس دفعہ یہ سب

کچھ عالمی سطح پر ہوگا۔

تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ میں اپنے آپ سے ہر رات یہ سوال پوچھتا تھا۔ میں مشرق وسطیٰ کے مختصر دورے کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور بیروت، مارلن برانڈو سے ملاقات، پناہ گزینوں کے کیمپ کا اسمائیلی کے ہمراہ دورہ، ان مناظر، خوشبوؤں، بناوٹوں، ذائقوں اور آوازوں کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ اس سب کو بیتے صرف چار سال گزر چکے تھے لیکن یہ وقت ایک زندگی کے برابر محسوس ہوتا تھا۔ رات کے کھانے میں اکثر ٹہلتا ہوا دریائے نیل کی طرف چلا جاتا تھا جو ہماری قیام گاہ سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ گہری لہریں سمندر کے ساتھ بنی دیوار سے ٹکراتی تھیں تو میں ماضی میں کھو جایا کرتا تھا اور انتھونی اور قلوپطرہ سے متعلق سوچا کرتا تھا۔ فرعونوں اور ان شہزادیوں اور بادشاہوں کے بارے میں سوچا کرتا تھا جنہوں نے اہرام تعمیر کئے تھے۔ مجھے حضرت عیسیٰ السلام کا خیال آتا تھا میں پانیوں کے اس پار اٹلی اور یونان کے مشرق کی طرف جھانکتا تھا اور دور مشرق میں فونیشین قوم کی سرزمین کی طرف دیکھتا تھا جو اب لبنان بن چکا ہے۔

ماضی کی ان سلطنتوں کے بارے میں سوچ کر مجھے ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہوتا تھا۔ تاریخ حملوں اور بربریت کی وہ تصویر پیش کرتی تھی جس میں ہم انسان دھنس کر یہاں تک پہنچے تھے۔ لہروں کی آوازیں میری زخمی روح کو سکون فراہم کرتی تھیں۔ مجھے علاقائی دیوار پر آویزاں جارج رچ روشن نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتا تھا جس کیلئے صرف اس بچے کا مستقبل اہم تھا جو کسی دن میرے نطفے سے جنم لے گا۔ اس اولاد کی خاطر ہمیں افریقہ اور مشرق وسطیٰ پر قابو کرنا ہوگا۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کر رہا ہوں کیونکہ میری اولاد کی فلاح اس حقیقت پر منحصر ہے۔

ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اہم تھی کہ میں ایک مہم پر آیا ہوا ہوں جس میں دنیا کے وہ مقامات دیکھ رہا ہوں جن کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ ساری عیاشی میں مفت کی دولت پر کر رہا ہوں۔

دریائے نیل پر گزارے ان راتوں کے دوران میں اکثر مڑ کر الیگزینڈریا کی روشنیوں کو دیکھا کرتا تھا اور افریقہ کی دور تک پھیلی ہوئی سرزمین کو دیکھا کرتا تھا۔ میں اس کو جوزف کونریڈ کی کتاب ''ہارٹ آف ڈارکنیس'' میں بیان کردہ خوفناک برتاؤ کے تناظر میں دیکھا کرتا تھا جہاں پر انسان ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل بیان انداز میں پیش آتے تھے۔ افریقہ میں ہونے والا تشدد میرے خیال کے مطابق دوسرے براعظموں میں ہونے والے تشدد سے زیادہ خوفناک اور بھیانک ہوتا ہے۔

اگرچہ میں امیزون میں وقت گزار چکا تھا لیکن کانگو مجھے زیادہ مختلف محسوس ہوتا تھا اور یہ اختلاف ہی افریقہ بیان کرتا تھا میں اپنی نوعمری میں ٹارزن کی کہانیاں پسند کیا کرتا تھا۔ وہ جنگل میری جنت تھی بعد میں جب میں معاشی تباہ کاروں کے حلقے میں گھوما پھرا اور جدید تاریخ کی سچائی کو سمجھ پایا تو ٹارزن کا گھر میرے تخیل میں برباد ہو چکا تھا۔ ایڈگار رائس بررف کا لافانی کردار اس وقت کہاں تھا جب غلاموں کی تجارت کرنے والے گورے وہاں پہنچے تھے؟ امیزون ایک رنگ برنگا بارانی جنگل تھا جبکہ کانگو میں ایک خبیث دلدل تھا۔

میں لاطینی امریکہ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی جھونپڑیاں دیکھ چکا تھا اور لیما کے تحقیقاتی میوزم میں امریکی فوج کی جیلوں میں اپاچی جنگجوؤں کی ہتھکڑی لگی ہوئی تصویریں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ میں سوہارتو کی فوج اور شاہ ایران کی خفیہ پولیس ساواک کے تشدد سے واقف تھا لیکن میری رائے کے مطابق وہ افریقہ میں ہونے والے بہیمانہ کارروائیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو میں دیکھ نہ سکا تھا وہ میں نے تصور کیا تھا کہ معصوم مرد، عورتیں اور بچے جالوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ غلام بردار جہازوں پر چیختے ہوئے غلام ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں جو الٹیاں کرتے پھر رہے ہیں، گندگی ان کے جسموں سے لپٹی ہوئی ہے جن کو گھسٹ کر بولی لگائی جانے والے مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہیں ان کے بدن سے خون بہہ رہا ہے وہ موت کے قریب ہیں اور افریقہ میں ان کی زمینوں، لوگوں، جانوروں اور جنگلات کو معزز اور مہذب یورپی تہہ و بالا کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے تاکہ میرے آباؤ اجداد اپنے شاندار ملبوسات میں گردنیں اکڑاتے چلتے پھرتے رہیں۔

میں اکثر ان سوچوں میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ پھر ایک دوپہر میں ایسے مرد اور عورت سے ملا جو سوڈان میں اپنے گھروں سے فرار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔ ان کی دردبھری کہانیاں سننے کے بعد مجھے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ میں بھی غلاموں کی تجارت کرنے والے انگریزوں کے گناہ دہرا رہا ہوں۔

امریکہ کی گود میں بیٹھا ہوا

میں سمندر کے ساتھ تعمیر کی گئی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا مچھیروں کو کشتی سے سامان اتارتا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اوپر آ کر میرے برابر آ کر کھڑے ہو گئے تھے ہم نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ان میں سے ایک بولا ''ہائے! کیسے ہیں آپ؟ کیا آپ انگریزی جانتے ہیں؟'' ان دنوں وہ معمول کی بات تھی لوگ اکثر اوقات مجھ سے تجسس اور اپنی انگریزی بہتر بنانے کیلئے بات چیت شروع کر دیتے تھے۔

میں نے جواباً کہا ''جی ہاں! میں امریکی ہوں اور میرا نام جان ہے۔ انگریزی میں مجھے لوگ سامی کہہ کر پکارتے ہیں یہ میری بہن سمانتھا ہے''

میں نے اسے ہوٹل چلنے کی دعوت دی تھی جہاں پر بیٹھ کر ہم نے کافی دیر تبادلہ خیال کیا تھا۔

انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جنوبی سوڈان سے آئے ہیں۔

سامی نے وضاحت کی ''شمالی علاقہ سارا مسلمانوں کا ہے لیکن جہاں ہم رہتے ہیں جنوب میں وہ کافی مختلف ہے۔ اس نے تفصیلات بتانے سے اجتناب برتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ قبائلی علاقے تھے۔

میں نے دریافت کیا ''کیا آپ لوگ مسلمان ہیں؟''

وہ بولا ''ہاں، ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں۔''

اگرچہ میں نے اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش نہ کی تھی لیکن ہم آنے والے چند دنوں میں الیگزینڈریا تفریحی مقامات کی سیر کر رہے تھے تو اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا تھا کہ وہ لوگ اس سرزمین کی روحوں کے ماننے والے ہیں۔ وہ الیگزینڈریا اپنے والد کے قتل کے بعد آئے تھے اور شمالی علاقہ کے لوگوں نے ان کی ماں کو زبردستی جنسی غلامی کی منڈی میں فروخت کر دیا تھا۔

سامی نے بتایا ''ہم پانی بھرنے گئے ہوئے تھے کہ اچانک ہم نے اپنی ماں کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں اور ہم چٹانوں میں چھپ گئے تھے۔''

سمانتھا نے بتایا ''میں بہت ڈر گئی تھی'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں چھپالیا

تھا۔ انہیں ماں باپ کے چھپائے ہوئے پیسے ایک جگہ سے ملے تھے اور انہیں لے کر وہ الیگزینڈریا آ گئے تھے جو انہوں نے بتایا کہ ان کیلئے قاہرہ سے زیادہ محفوظ ثابت ہو سکتا تھا اور جہاں ان کے دور دراز کے رشتہ داروں نے انہیں پناہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے اگرچہ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے قدرت کے خداؤں کو اب بھی پوجتے تھے اپنے چچا کے ذریعے وہ ایک برطانوی جوڑے سے ملے تھے جو یتیموں کیلئے ایک چھوٹا سا اسکول چلاتے تھے اور رہنے اور سونے کیلئے کمرہ اور تعلیم دیتے تھے اور اس کے بدلے ان سے اسکول کے اردگرد نکلنے والے معمولی کام کرایا کرتے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد ہم لوگوں نے کافی وقت ساتھ گزارا تھا۔ ہم بعد دوپہر ملا کرتے تھے جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو جایا کرتے تھے۔ میں انہیں کافی اور کبھی کبھار رات کا کھانا پیش کیا کرتا تھا۔ وہ مجھے بازار، عجائب گھر اور تصویروں کی نمائشیں دکھایا کرتے تھے اور ساتھ ہی سوڈانی ریستوران اور شہر کے بہت سے ایسے علاقے دکھائے تھے جہاں کوئی غیر ملکی کبھی نہ گیا ہوگا۔ تمام تر صعوبتیں جھیلنے کے باوجود وہ نہایت گرم جوشی اور کھلے دل کے لوگ تھے۔

سامی اور سمانتھا سے ملاقات کے ذریعے میں ساتھی ماہرین کے طعنوں سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے میں ان سے ملاقاتوں کا یہ کہہ کر جواز پیش کرتا تھا کہ میں تجزیے لکھنے کیلئے معلومات جمع کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصہ بعد مجھے احساس ہوا کہ میں سمانتھا کو پسند کرنے لگا تھا۔ میں اکثر اس خوبصورت افریقی عورت سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ امریکہ لے جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر خوش ہوتا تھا کہ میرے والدین ایک سیاہ فام سوڈانی عورت کو میرے ساتھ دیکھ کر کیا محسوس کریں گے؟ جب میں نے سامی سے امریکہ میں رہنے کے خیال کے بارے میں بات کی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس پیشکش کو بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کرے گا لیکن اس کے برعکس اس نے شدید پریشانی کا اظہار کیا تھا۔

وہ بولا ''ہم افریقی ہیں ہمیں لازمی طور پر سوڈان جا کر اپنے لوگوں کی مدد کرنا چاہئے۔''

میں نے پوچھا ''کیسے؟ تم لوگ کیا کر پاؤ گے؟''

اس نے جواب دیا ''ہم آزادی حاصل کرنے کیلئے لڑیں گے۔''

''مگر سوڈان تو ۱۹۵۶ء میں ہی آزاد ہو گیا تھا۔''

''سوڈان کہیں واقع نہیں ہے، ہم دو الگ الگ ملک ہیں۔ یہ وہ ملک نہیں ہے جسے برطانیہ

اور مصر نے تعمیر کیا تھا۔''

''مطلب مسلمانوں کا شمال اور جنوب۔''

''جی ہاں! شمال مشرق وسطیٰ کا حصہ ہے جبکہ جنوب افریقہ کا حصہ ہے۔''

اس کے جواب نے مجھے ایک نئے پہلو سے متعارف کرایا تھا جو جارج رچ سے قطعاً مختلف تھا۔ مصر ایک الگ چیز ہے جبکہ سوڈان بالکل الگ۔ میں حیران رہ گیا کہ میں نے پہلے ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''مصر کا کیا مسئلہ ہے؟ وہ مشرق وسطیٰ کا حصہ ہے یا افریقہ کا؟''

وہ بولا ''دونوں کا حصہ نہیں ہے۔''

''تو پھر۔''

''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس ملک پر فرعون نیکٹینبو کے بعد سے کوئی مصری حکمران حکومت نہیں کرسکا ہے۔ جو کہ تقریباً آپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی تین سو سال پہلے سے لے کر آج تک کی حقیقت ہے۔''

میں نے حیرت کا اعتراف کرتے ہوئے پوچھا ''تو پھر مصر کس کا حصہ ہے؟''

''مصر یورپ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔''

''لیکن اب؟''

''اب وہ امریکہ کی گود میں ہے۔''

باب نمبر: ۴۳

کرائے کے قاتل کا جنم

جیک کوربن ۱۹۷۱ء میں بیروت کا رہنے والا ایک کم عمر نوجوان تھا۔ چار سال بعد جب میں الیگزینڈر یا پہنچا تھا تو وہ شدید بے چینی سے دوچار تھا اور انیس سال کی چھوٹی عمر میں اپنے گھر اور خاندان کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ افریقہ کے خواب دیکھتا رہا تھا لیکن اپنے خوابوں کے تعاقب کرنے کے فیصلے نے اس کی پوری زندگی کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس فیصلے نے اسے کرائے کا قاتل بنا دیا تھا۔ اس کی بہت سی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری براعظم کے اہم فوجی ملکوں میں سے ایک ملک کے صدر کو قتل کرنا بھی شامل تھا اور اس دوران میرے اور اس کے درمیان برسوں تک چلنے والی دوستی بھی قائم ہوگئی تھی۔

امریکی کارپوریٹ عہدیدار کا بیٹا جیک تشدد دیکھتے ہوئے جوان ہوا تھا۔ وہ اور اس کے دوستوں نے کئی دوپہریں پہاڑیوں پر بنی جھاڑ کے کنارے بیٹھے گزاری تھیں جہاں سے وہ بیروت کی روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ اس عمر کے دوسرے لڑکوں کے برعکس ان کی حرکتیں انہیں موت کے منہ تک لے جاتی تھیں۔ ایک دوپہر انہوں نے اپنی طاقتور دوربین سے دیکھا کہ تین لوگ ایک آدمی کو بے دردی سے پیٹ رہے تھے اور اس کے بعد اسے ادھر سے [illegible] اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے شیرخوار بچے کے سامنے اس کی ماں کی عصمت دری کرتے دیکھا تھا اور بعد میں ایک آدمی نے ان دونوں ماں اور بچے کو قریبی گھر میں پناہ دی تھی۔

جنگ بندی کا اعلان ہوگیا تھا۔ جیک اور اس کے دوست شہر میں فلم دیکھنے گئے تھے جیسے ہی وہ سینما سے نکلے تو گولیاں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔ ایک کالی مرسیڈیز ان کے قریب سے گزری اور یکدم رکی، واپس ان کی طرف آئی اور دوبارہ رکی اور تین آدمی اے کے-۴۷ لہراتے ہوئے باہر نکلے۔

وہ مستقل جیک اور اس کے دوستوں کو اپنی بندوقیں چبھو رہے تھے اور انہیں عربی میں گالیاں دے رہے تھے۔ انہوں نے ان کو بڑی سی کالی گاڑی میں دھکیل دیا۔ وہ ان پر اسرائیل کیلئے جاسوسی کرنے کا الزام لگا رہے تھے، بندوقیں مار رہے تھے اور سورج غروب ہونے سے پہلے انہیں قتل

کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ وہ مرسیڈیز گلیوں میں غائب ہوگئی تھی۔ وہ عرب بستیوں سے گزرتے ہوئے شہر کے ان حصوں میں گم ہوگئی تھی جو جیک جیسے لوگوں کیلئے ممنوعہ علاقہ سمجھا جاتا تھا اور لے جا کر انہیں ایک شخص کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

جیک نے مجھے بتایا تھا ''خدا کا شکر ہے کہ کسی بنیاد پرست ملیشیا فوج کا حصہ نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق پی ایل او سے تھا۔ میں نے اسے فلم کے پھٹے ہوئے ٹکٹ دکھائے تھے۔ نہ جانے کیسے وہ میری جیب میں رہ گئے تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں کی خوب سرزنش کی اور کہا کہ یہ بے وقوف بن گئے تھے اور ہمیں شہر تک چھوڑ کر آ گئے تھے۔''

اس تجربے نے جیک کو اپنا شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جبکہ وہ جنگ سے دور نہیں بلکہ جنگ میں ہی گھرے جا رہا تھا۔ اس نے سرگوشی کی ''میں تشدد کو جھیلنا جانتا تھا لیکن وہ اغواء کرنے والے مجھے ڈرا نہیں سکے تھے بلکہ انہوں نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔ انہوں نے میرے اندر جھلاہٹ بھر دی تھی اور اس کے بعد وہ افریقہ چلا آیا تھا۔''

''یہ براعظم منشیات کی زد میں تھا ایک ایسی جگہ جہاں میرا جیسا آدمی خوب مال بھی کما سکتا تھا اور عیاشی کرنے کے بھی کافی مواقع میسر تھے۔'' میں اور جیک جنوبی فلوریڈا کے آئرش ریستوران کے صحن میں بیٹھے تھے۔ وہ ۲۰۰۵ء کا دور تھا اگرچہ وہ مقامات اور وقت بہت ماضی کا حصہ لگتے ہیں۔ جیک ان دنوں عراق سے لوٹا تھا جہاں اس نے ایک کام مکمل کیا تھا جو امریکی فوج خود کرنا نہیں چاہتی تھی اور اسی وجہ سے ہماری بات چیت عصر حاضر کے حالات کا نیا رخ پیش کرتی ہے۔ ''میں بیروت سے آنے والے کرائے کے قاتلوں سے معلومات کا تبادلہ خیال کر کے اور اپنے والد کے ٹائم میگزین پڑھ پڑھ کر کافی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں پرتگال نے کچھ ایسا کیا تھا جس کی وجہ سے افریقی تاریخ بدل کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا دروازہ کھول دیا اور میں اس سے داخل ہو گیا تھا۔

میں پرتگال میں امریکی حمایت یافتہ آمر کو برطرف کرنے کیلئے ہونے والی بغاوت کے کچھ عرصے بعد پرتگال کے پڑوسی ملک اسپین کے سفر پر گیا تھا۔ پرتگال کی افریقی آبادیوں میں آزادی کے حصول کیلئے چلنے والی جنگوں سے معاشی اور سماجی نقصانات طویل عرصے سے مسلط آمر اور کارپریٹو کریسی کے مددگار انٹونیو سالازار کی کمزور کر دینے والی بیماری اور مسلح افواج کے اندر سے اٹھنے والے مخالفین کی برپا کردہ بغاوت جس کے نتیجے میں سالازار کے نائب مارسیلو کیٹانو کو

برطرف کر دیا گیا تھا جس نے سابق حلیف کو سوشلزم کے اپنانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ معاشی تباہ کاروں کی ناکامی تھی جس نے شدید اندیشے اور وسوسے لاحق کر دیئے تھے اور جس کی تحقیقات کرنے کیلئے مجھے روانہ کیا گیا تھا۔

جیک نے منہ بناتے ہوئے بتایا ''کارنیشن انقلاب کے فوری بعد لزبن نے افریقی بستیاں آزاد کرا دی تھیں، سارے کی ساری آزاد ہوگئی تھیں، اچانک اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے انہیں آزاد کر دیا گیا تھا۔ فوجیں واپس اپنے گھروں کو آ گئی تھیں۔ سینکڑوں، ہزاروں پرتگالی شہری جوان بستیوں میں کئی نسلوں سے آباد تھے۔ اپنی زمینوں، کاروبار اور بہت کچھ سے محروم ہو گئے تھے۔ وہ اپنی جانیں بچانے کیلئے جنوبی افریقہ، روڈھوشیا، برازیل اور واپس پرتگال بھاگ گئے تھے۔ پرانی بستیوں کو اپنی من پسند آزادی ضرور مل گئی تھی مگر اب وہ آہستہ آہستہ پریشانیوں میں گھرتے جا رہے تھے اور پھر روسیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا صرف چند دن میں تیل اور گیس کے انتہائی اہم ذخائر کمیونسٹوں کے ہاتھ آ گئے تھے اور اس کے بعد ایان اسمتھ کے روڈھوشیا کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع ہوگئی تھی۔

جیک کی طرح میں نے بھی اس وقت کو اپنی معاشی تباہ کار کی ملازمت میں ترقی کرنے کیلئے استعمال کیا تھا۔ وہ کرائے کا قاتل بن چکا تھا جبکہ میں معاشی تباہ کار کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ میں آج سوچتا ہوں کہ اس دوران انڈونیشیا، ایران اور اکثریتی لاطینی امریکا میں امریکی سلطنت کس قدر مضبوط ہو رہی تھی مگر ویتنام میں امریکی اور جنوبی ویتنامی قوتوں کے پسپا ہونے کے بعد مشکلات سے دوچار تھی جبکہ کمبوڈیا اور لاؤس میں کھیمر وج اور پیٹھیٹ لاؤ اپنا اثر و رسوخ بڑھا چکے تھے۔ ۱۹۷۴ء تک افریقہ اس سارے معاملے میں کوئی پہچان نہیں رکھتا تھا۔ آزادی کی لڑائیاں تقویت حاصل کر رہی تھیں اگرچہ اندرونی طور پر وہ اس فیصلے پر بٹ جاتی تھیں کہ کس سے حمایت حاصل کی جائے اور کس سے نہ کی جائے۔ ان کے اکثر رہنما کمیونسٹوں کی حمایت حاصل کر کے مغرب کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ ہم معاشی تباہ کار اپنے مواقعوں کو ٹٹولا کرتے تھے اور مناسب نقطہ نظر کے حصول کیلئے کوشاں رہتے تھے۔ مین نے زائر، لائبریا، چاڈ، مصر اور جنوبی افریقہ میں قدم جما لئے تھے اگرچہ جنوبی افریقہ میں اپارتھائیڈ کے مخالف جذبات بھڑک اٹھنے کی وجہ سے ہم ذرا آہستگی سے قدم بڑھا رہے تھے، ہمارے اہلکار نائیجیریا اور کینیا میں بھی انتھک محنت کے ذریعے اپنے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ میں نے اس وقت کچھ عرصے پہلے ہی ایک تحقیق پیش

کی تھی جس میں کانگو میں پورے وسطی افریقہ میں کانیں کھودنے کے کام اور صنعتی پارکس کیلئے بجلی کی فراہمی کیلئے ایک بڑے ڈیم بنانے کے امکانات پر غور کیا گیا تھا۔

لزبن کے نوآبادیاتی علاقوں کو آزاد کرنے کے جلد بازی کے فیصلے نے سب کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ اس فیصلے نے طاقت کا توازن بگاڑ دیا تھا جس کی وجہ سے پینٹاگون اور ڈیفنس اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ مشکلات سے دوچار ہوگئے تھے۔ مناسب حکمت عملی ترتیب دینے کے سلسلے میں ہونے والی گرما گرم بحثوں کے دوران کابینہ کے سیکرٹریز میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

ولیم راجرز (۱۹۷۳-۱۹۶۹ء) اور ہنری کسنجر (۷۷-۱۹۷۴ء) اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور میلون لیرڈ (۷۳-۱۹۶۹ء)، ایلیٹ رچرڈسن (۱۹۷۳ء) جیمس شلیسنگر (۷۵-۱۹۷۳ء) اور ڈونلڈ رمز فیلڈ (۷۷-۱۹۷۵ء) کے درمیان دفاع کا شعبہ متاثر ہو رہا تھا۔ واٹر گیٹ اسکینڈل کا شکار نکسن اور اس کی جگہ سنبھالنے والے فورڈ جو انتخابات کے بجائے حالات سے صدر بن گیا تھا، اس نے صورتحال مزید کشیدہ کر دی تھی۔ کسی مناسب حکمت عملی کی ترتیب میں قطعی ناکام ہو گیا تھا۔

افریقی عوام کیلئے حالات ماضی کے مقابلے میں بدتر اور تباہ کن ہو گئے تھے۔ تسلط حاصل کرنے کی یورپی چھین جھپٹ میں وہ مظلوم عوام ایسے ملکوں کی سرحدوں میں پھنس کر رہ گئے تھے جو ثقافتی اور علاقائی ضروریات اور انفرادیت کو نظر میں رکھنے کی بجائے غیر ملکی طاقتوں کی پسند کے مطابق کھینچی گئی تھیں۔ ان کے نوآبادیاتی حکمرانوں نے سرکاری اور تجارتی اداروں کے استحکام کیلئے کسی قسم کا کردار ادا نہیں کیا تھا۔ وہ آزادی کی صورت میں ملنے والی ذمہ داریوں کیلئے قطعاً تیار نہ تھے اور اسی وجہ نے اس کمی کو دور کرنے کیلئے غیر ملکی طاقتیں سرگرم عمل ہو گئی تھیں جو ان کا بھرپور استحصال کرنے کیلئے آمادہ تھیں۔

جیک نے نہایت نفرت سے کہا ''ہم نے روسیوں کو اپنے اندر گھسنے کی کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ چین بھی بے وقوف بن گیا۔ ماسکو نے موزمبیق کی مدد کی جو پہلے ہی مارکس ازم کا گڑھ تھا اس نے وہاں ہزاروں زمبابوین نوجوانوں کو تربیت دے کر انہیں زمبابوے افریقن نیشنل لبریشن کا حصہ بنا لیا اور پھر انہیں جتھوں کی صورت میں روڈھوشین کسانوں کو قتل کرنے کیلئے روانہ کر دیا۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کسان گورے تھے یا کالے۔ زامبیا ماؤزے تنگ کا حمایتی بن گیا اور روڈھوشیا میں چھاپے مارنے کیلئے مرکزی چوک بن کر رہ گیا تھا۔ میرے خیال میں روڈھوشیا میں وہ صلاحیت موجود تھی اور اسے پورا کرنے کیلئے اسے مدد درکار تھی اور اسی لئے میں روڈھوشیا پہنچ کر ان کی فوج

میں شامل ہو گیا۔''

جیک ہمیشہ اس بات پر قائم رہا تھا کہ روڈھوشیا جنوبی افریقہ کے برعکس اپارتھائیڈ کے حکمت سے عاری نظریے کی ترویج نہیں کرتا تھا۔ وہ جس جنگ کا حصہ بنا تھا جو کالے اور گورے کے مابین نہ تھی بلکہ وہ بقا کی جنگ تھی۔ میں نے اسے ان پڑوسیوں کے مدمقابل لا کھڑا کیا تھا جو سوویت جال میں پھنس گئے تھے۔

پی ایل او کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد اپنے بارے میں کیئے گئے فیصلے پر جیک ڈٹ گیا تھا۔ ''مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ میں فوجی بننے کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ میں روڈھوشیین لائٹ انفنٹری کمانڈوز میں شامل ہو گیا تھا اور بعد میں اسپیشل ایئر سروس کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا جو ایک خصوصی دستہ تھا۔ تربیت کافی محنت طلب تھی اور وہاں ملنے والی ذمہ داریاں اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ چند پل دھماکے سے اڑانے کے بعد ہم لوگوں کو اپنی زندگیاں بچانے کیلئے دشمن کے ہزاروں دستوں کو چکمہ دے کر تین ہفتے تک مفرور رہنا پڑا تھا۔ ہم پہاڑوں سے گزرتے ہوئے، لڑتے لڑاتے اور پھر آگے بڑھتے ایک دن میں بیس بیس میل طے کرتے تھے۔ ہماری کوئی کمک نہ تھی اور پیاس سے ادھ مرے ہو چکے تھے۔''

اس نے اپنے پہلے قتل کے بارے میں مجھے بتایا ''ایک شخص درخت کی جھاڑی سے کودتے ہوئے مجھ پر فائرنگ کرنے لگا۔ میں نے ایک گولی فائر کی جو اس کے چہرے پر لگی۔ میں اس پوری رات اس کے خاندان کے بارے میں سوچتا رہا مگر اگلی بار مجھے صرف ایک دشمن دکھائی دیا تھا جو مجھے مارنا چاہتا تھا۔ کسی بھی اور کام کی طرح ہر نئے قتل کے ساتھ آپ اس کے عادی ہو جاتے ہو۔''

روڈھوشیین فوج میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جیک جیسے کام کرنے والا بن گیا تھا ''مواقعوں کی بھرمار تھی، ۱۹۷۹ء تک کم از کم چھ افریقی ممالک آزادی کی جدوجہد میں گرفتار تھے جن میں جنوبی افریقہ، انگولا، جنوبی مغربی افریقہ، زیمبیا، موزمبیق اور روڈھوشیا شامل تھے۔''

وہ جنوبی افریقہ پہنچا اور اسے ایک ساتھی قاتل نے اپنے ساتھ اس کی زندگی کے سب سے خطرناک مہم کیلئے شامل کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسی مہم تھی جس نے امریکی حکومت کی اپنی غیر قانونی کارروائیوں کو کافی حد تک بے نقاب کر دیا تھا۔ جس سے اس کے شہریوں کی اکثریت ناواقف تھی۔ اسے ایک صدر کا قتل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جس نے واشنگٹن اور لندن کی کئی طاقتور شخصیات کو زچ کیا ہوا تھا۔

باب نمبر: ۴۴

ڈیگو گارسیا کے گمنام باشندے

افریقی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کے عزائم میں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں اوپیک کی طرف سے تیل کی آمدورفت پر عائد ممانعت اور جنوب مشرقی ایشیا میں فوجی قوتوں کے زوال کے بعد مزید تیزی آ گئی تھی۔ کارپوریٹ عہدیدار اور ان کی راہ ہموار کرنے والے واشنگٹن میں جمع ہونے لگے۔ انہوں نے کارٹر اور فورڈ انتظامیہ کی افراتفری کا فائدہ اٹھایا تھا اور ساتھ ہی وہ کارٹر کی ایران سے متعلق عالمی قوانین کی ضمانت حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی کو بھی اپنے مقاصد کیلئے استوار کر رہے تھے جس کے ذریعے وہ افریقی وسائل بالخصوص تیل کو بغیر کسی مدافعت کے اپنے لئے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ عہدیداران اس بات پر مُصر تھے کہ انتہائی طاقتور فوجی موجودگی ضروری ہے تاکہ امریکی تسلط قائم کیا جا سکے اور بحری راستوں کا تحفظ کیا جا سکے اور اس فوجی قوت کے ذریعے ان افریقی رہنماؤں کی مدد کرنا چاہتے تھے جو اپنے عوام کی خواہشات کو نظرانداز کر کے کارپوریٹوکریسی کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔

افریقہ میں روسی اور چینی کامیابیوں نے ان خیالات کو مزید تقویت دی تھی کہ امریکہ کا عسکری ردعمل نہایت ضروری ہے۔ پریس نے افریقہ کی کمیونسٹ کارروائیوں کے نتائج اور ماسکو اور بیجنگ کی واشنگٹن کی حلیف ملکوں پر قبضہ کرنے کیلئے خفیہ قوتوں کے حصول کی کوششوں کے حوالے سے چھپنے والے مضامین نے عوام میں مزید اشتعال برپا کر دیا تھا۔ ٹیلیویژن چینلز کیوبا کے سخت گیر جنگجوؤں کی نگرانی میں افریقی دہشت گردوں کی تربیت کے مناظر نشر کر رہے تھے۔ یہ افواہیں پھیل گئی تھیں کہ کاسترو نے بدنام زمانہ چی گویرا کو امریکی کان کنی کی کارروائیوں پر شدید حملے کرنے کیلئے افریقہ روانہ کیا ہے۔

واشنگٹن پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ نہر سوئز کی بندش اور قوی ہیکل ٹینکروں کی کہانیوں نے ان بحری راستوں کو محفوظ بنانے کیلئے اس کے گرد حفاظتی فصیل قائم کرنے کے نظریے کو مزید تقویت پہنچائی جو مشرق وسطیٰ کی بندرگاہوں سے نکل کر دریائے قلزم، خلیج، فارس اور بحیرہ عرب سے ہوتے ہوئے بحرہند کے جنوب میں افریقہ سے کیپ آف گڈ ہوپ سے نکلتے ہوئے بحراوقیانوس تک آتے

تھے۔ سیاستدان بھی اس نظریے کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ سماجی منصوبے نظرانداز کر کے ان کے حصے کی رقوم پینٹاگون کو ملنے لگیں۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ افریقہ کے مشرقی ساحل سے کچھ دور واقع الڈبرا جزیرے پر ایٹمی اسلحہ سے لیس ایک فضائی اڈہ تعمیر کیا جائے گا۔

جیک نے مجھے بتایا ''اس کے ذریعے کیپ آف گڈ ہوپ پر قائم جنوبی افریقہ کی بحری تنصیب سائمن ٹاؤن کو مزید طاقتور کیا جا رہا ہے۔ امریکی ایٹمی سب میرین کھوجی نگاہوں سے دور اس وقت اکثر مرمت وغیرہ کیلئے استعمال کرتی تھیں جب وہ بحراوقیانوس اور بحرہند کے جنوب میں لمبے اور تنہا گشت سے واپس لوٹ رہی ہوتی تھی۔ مڈغاسکر کے شمال میں ایک فضائی اڈہ سائمن ٹاؤن ایک بہترین ترکیب تھی لیکن جب منصوبہ آگے بڑھا تو منصوبہ سازوں کو معلوم ہوا کہ الڈابرا کا جزیرہ نایاب دیوہیکل کچھوؤں کا مسکن تھا۔ بڑھتی ہوئی ماحولیاتی تحریکوں کی جانب سے متوقع مخالف تشہیر سے گھبرا کر واشنگٹن نے اپنی کوشش کا رُخ ڈیگو گارسیا کے قرب میں چاگوس سلسلے کے چٹانی ساحل کی طرف موڑ دیا جو اس وقت برطانیہ کے علاقے ماریشیس میں واقع تھا اگرچہ ڈیگو گارسیا میں کوئی نایاب کچھوے نہ تھا البتہ وہاں لوگوں کی آبادی رہا کرتی تھی جو زیادہ تر افریقی غلاموں کی اولادیں تھیں۔

جیک نے کہا ''یہ ناقابل برداشت تھا کہ کسی ایسے ساحلی علاقے پر کچھ باشندے آباد ہوں جہاں امریکہ اپنا جدید فوجی اڈہ بنانے کی تیاری کر رہا ہو۔''

۱۹۷۰ء میں معاشی تباہ کاروں اور امریکی اور برطانوی خفیہ اہلکاروں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا کہ برطانوی حکومت ڈیگو گارسیا سے ان باشندوں کو یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس تمام کارروائی کو خفیہ رکھنے کی ہر کوشش کی گئی تھی۔ بی بی سی کے مطابق ''برطانوی سیاستدانوں، سفیروں اور حکومتی اہلکاروں نے ایک مہم کا آغاز کیا تھا جو ان کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں تھی کہ یہ دکھاوا کیا جائے گا کہ اس جزیرے پر کوئی مستقل باشندے نہیں رہتے ہیں۔ یہ جتانا نہایت اہم تھا کیونکہ باضابطہ شہروں کے ایسے عوام ہوتے ہیں جن کے جمہوری حقوق کا تحفظ کرنا اشد ضروری ہوتا تو وہ باشندے اس طرح غیر شہری قرار دیئے گئے تھے۔''

جزیرے پر رہنے والے بھاگ کر پڑوسی جزیرے شیسلز پر چلے گئے تھے پھر انگلستان نے غیر آباد ڈیگو گارسیا امریکی حکومت کو ٹھیکے پر دے دیا تھا جس کے عوض واشنگٹن نے برطانیہ کو پولارس سب میرین ٹیکنالوجی پر ۱۱ ملین ڈالر کی لاگت حکومتی اخراجات سے ادا کرنے کی پیشکش کی تھی۔

جزیرے پر آباد باشندوں اوران کے گھروں کی قیمت ۶۰۰ ڈالرفی کس لگائی گئی تھی۔

پینٹا گون فوراً اپنا فوجی اڈہ تعمیر کرنے کے کام میں جت گیا تھا۔ یہ اڈہ بی ۵۲ اور کچھ عرصے بعد راڈار کی نظروں سے اوجھل رہنے والی جاسوسی بی ۲ بمبار طیارے رکھنے کی صلاحیت کا حامل تھا۔ یہ اڈہ امریکی سلطنت کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کرے گا جو مشرق وسطیٰ، بھارت، افغانستان اور ساتھ ہی افریقہ میں کئے جانے والے حملوں کی تیاری کا مرکز تھا۔

اپنی تمام تر فوجی اہمیت کے باوجود ڈیگو گارسیا ایک گمنام علاقہ تھا جہاں پر افریقہ کے ساحل سے ہٹ کر امریکی موجودگی کا بہت کم لوگوں کو علم تھا، بہت کم حلقے اس حقیقت سے واقف تھے کہ اس کے تحفظ کے پس پشت سی آئی اے کے تربیت اور حمایت یافتہ کرائے کے قاتلوں کے ذریعے ایک نہایت بڑی شخصیت کو قتل کئے جانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ جیمس مینچم کو شیسلز کی آزادی کے بعد ۲۹ جون ۱۹۷۶ء کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے امریکا اور برطانیہ سے ابتدائی روابط کار پریٹو کریسی کے انتہائی قریبی حلیف جنوبی افریقہ کے ذریعے قائم ہوئے تھے۔ جنوبی افریقہ کے ذریعے مینچیم نے یہ پیغام واضح طور پر پہنچادیا تھا کہ وہ ڈیگو گارسیا معاہدے کی حمایت کرتا ہے ساتھ ہی اس نے جزیرہ کے بے گھر باشندوں کو پناہ فراہم کرنے کی پیشکش کی تھی اور وہ یہ جانتا تھا کہ وہ اور اس کے حواری قریب میں واقع فوجی اڈے سے بہت سے ذاتی فائدے حاصل کر سکتے تھے اور اس رویے پر اس کے بہت سے ہم وطن مشتعل ہوگئے تھے۔

سیشلز کے شہری اپنی حال ہی میں حاصل کی گئی آزادی کی بہت قدر کرتے تھے۔ اس قومی جذبے نے مینچیم کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ اس کی بڑھتی دوستی کی مخالفت کے علاوہ ان کو پڑوسی جزیرے کے باشندوں کو بے گھر کرنے کی کارروائی میں اپنی حکومت کے کردار پر بھی اعتراضات تھے اور وہ ان لوگوں کی آمد سے بھی پریشان تھے جو ان کی ملازمتوں اور ان کے معاشی رویے پر اثر انداز ہورہے تھے۔ جب مینچیم لندن کے دورے پر تھا تو وزیراعظم فرانس البرٹ رینے نے اہم قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں نہایت پرامن بغاوت کے نتیجے میں اس نے صدارت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اس منصوبے پر بھی عمل کرنے کا اعلان کیا تھا جو بی بی سی کے مطابق ''غریب عوام کو ملک کی دولت میں حصہ دینے'' کے متعلق تھا۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ ڈیگو گارسیا کے باشندوں کو ان کے جزیرے واپس جانے کی اجازت ہونی چاہئے اور افریقہ کے قرب میں واقع امریکی فوجی اڈہ پر بھی اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔

اس پر واشنگٹن بھپر کر رہ گیا تھا لیکن بمشکل اس غصے کو اپنے عوام سے چھپایا گیا۔ جیک کوربن جب روڈھوشیا میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے میں مصروف تھا تو اس وقت کارپریٹو کریسی رینے کے خلاف کارروائی کی حکمت عملی تیار کررہا تھا۔

میں اس منصوبے کا حصہ معاشی تباہ کار کی حیثیت سے بنا تھا جو جیک کا ہم منصب تھا۔ ہم دونوں عمل کرنے کیلئے بالکل تیار تھے اور میں اپنے حکمران کی طرف سے مناسب حکمت عملی کے متعلق فیصلہ کا انتظار کررہا تھا کہ قتل کرنا ہے یا اس معاملے کو ٹالنا ہے۔ آخر میں مجھ سے رابطہ نہیں کیا گیا تھا لیکن جیک کی خدمات رینے کو ختم کرنے کیلئے استعمال کی گئی تھیں۔ میں ان تمام بات چیت سے واقف تھا جو اس بات کی غماز تھی کہ امریکی حکومت اپنے فوجی اڈے کو برقرار رکھنے کیلئے کس حد تک گر سکتی ہے۔

ایک صدر کو قتل کرنا

جیک کوربن سیشلز میں برپا افراتفری کو روڈھوشیا سے دیکھ رہا تھا جبکہ جنرل چک نوبل اور اس کے دوست یہ سب کچھ صدر آئزن ہاور کے بیان کے مطابق واشنگٹن میں واقع عسکری صنعتی کمپلیکس سے اس سب کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔

چک بولا ''غریبوں کی مدد کے حوالے سے رینے کی گفتگو مکمل بکواس پر مبنی ہے۔'' چک امریکی انجینئر کمانڈ ویتنام کا سابق کمانڈنگ جنرل رہ چکا تھا اور وہ مین (Main) میں دو سال کے اندر اندر ترقی کرتا ہوا پراجیکٹ منیجر سے نائب صدر اور چیف ایگزیکٹو میک ہال کا نائب لگ گیا تھا۔ وہ اس بے مثال ترقی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ ماضی میں رضا کارانہ تعلیمی مشن میں شامل ہو کر میں نے ویتنام جانے سے اجتناب برتا تھا اس کے باوجود اس نے مجھے اپنے شعبے میں شامل کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نیشنل سیکورٹی ایجنسی میں میری تقرری سے متعلق کاغذات دیکھ چکا تھا اور مجھ میں اسے ایک وفادار معاشی تباہ کار نظر آیا تھا۔ جب کبھی میں واشنگٹن کے دورے پر جاتا تھا وہ مجھے بطور خاص فوج اور نیوی کلب میں ٹھہرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ یہ ملاقات ایسے ہی ایک دورے پر ہوئی تھی۔ ہم کھانے کے خاص کمرے میں دو سابق جنرلوں اور ایک سابق ایڈمرل کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھے جو سب کے ان کمپنیوں کیلئے کام کرتے تھے جو کارپوریٹوکریسی کی کوششوں کا حصہ تھیں۔

چک نے بات چیت کے دوران کہا ''رینے روس کا پٹھو ہے، اس کا ایک ہی منصوبہ ہے ہمیں ڈیگوگارسیا سے نکال باہر کیا جائے اور پھر اسے روس کے حوالے کر دیا جائے۔ پھر کیوبا والوں کو روسیوں کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دے گا اور پھر جلد ہی پورا براعظم کمیونزم کے رنگ میں رنگ جائے گا۔''

چاروں فوجی حضرات مجھ سے بغیر تشدد استعمال کئے انڈونیشیا اور سعودی عرب جیسے ممالک میں حاصل کی گئی کامیابیوں کے حوالے سے تفصیلاً سوالات کرتے رہے۔ میں جنرلوں اور ایڈمرل کی عملیت پسندی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ سیاستدانوں کے برعکس وہ لوگ جنگ سے ہر ممکن طور پر

اجتناب برتنا چاہتے تھے۔ اگرچہ ستر کی دہائی کے اختتامی حصوں میں سیاسی بغاوتیں اور ہلاکتیں سرد جنگ کے ہتھیار مانے جاتے تھے لیکن مسلح افواج کے اعلیٰ عہدیداران کانگریس اور وہائٹ ہاؤس کے سیاستدانوں سے زیادہ قانون کی پاسداری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شاید ان کے تجربے نے انہیں سکھایا تھا کہ تشدد مزید تشدد کو جنم دیتا ہے یا پھر ممکن ہوا نہیں ڈر ہو کہ دوسرے ممالک میں ایسے اقدامات کی حمایت کرنے سے ان کے اپنے ملک میں ایسی حکمت عملیاں نہ بن جائیں جو ان کو نقصان پہنچا سکتی تھیں یا پھر شاید جمہوریت کے دفاع کا حلف ان کے ضمیروں میں آج بھی زندہ ہو۔

ایڈمرل نے اظہار رائے کیا کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ''رینے الینڈے اور پراٹ کے نقش قدم پر چلنے کے عزائم رکھتا ہے۔'' تینوں جنرلوں نے اسے غصے سے گھور کر دیکھا اور ان میں سے ایک بڑبڑایا ''ان معاملات کا ذکر نہ کرو۔'' گفتگو کا رخ دوبارہ رینے کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی حکمت عملیوں پر مرکوز ہو گیا تھا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں سیشلز کی طرف روانگی کیلئے ہر وقت تیار رہوں۔

ایک جنرل نے اپنے ایک نوجوان خوبصورت ماتحت کو سیشلز کے اعلیٰ سفیر کی بیوی سے تعلقات گہرے کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ جنرل نے مختلف ضیافتوں کے دوران یہ غور کیا تھا کہ سفیر کی تیس سالہ بیوی اپنی عمر سے دوگنے شوہر سے بیزاری محسوس کرتی تھی۔ جنسی حرکتوں کا جاسوسی کیلئے استعمال کرنا جکارتہ کی رقاصاؤں تک محدود نہ تھا۔ میرے تجربے کے مطابق اس سے حیرت انگیز نتائج حاصل ہوئے تھے جس میں مختلف النوع قسم کے مردوں اور عورتوں کو سلطنت کی تعمیر کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ پرجوش لمحات کے طوفان میں بے وفائی کی داستانیں رقم کی جاتی تھیں۔ ایک سادہ سا حربہ یہ تھا کہ معاشی تباہ کار پیار محبت کا جال بن کر اپنی ملازمت میں ترقی حاصل کرنے کے بہانے سے مفید اور اہم معلومات حاصل کرتے ہیں عام جملہ یہ ہوتا ہے'' مجھے ترقی حاصل کرنے کیلئے یہ معمولی سی معلومات کی ضرورت ہے۔'' یا پھر زیادہ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے'' مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اپنی ملازمت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں اگر مجھے اپنے باس کی مدد کرنے کا کوئی طریقہ نہ مل پایا اور اس کیلئے مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ'' اور جب تمام ترکیبیں ناکام ہو جاتی تھیں تو سچ بتانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں جبکہ بیویوں کو دھمکانے والے کو دینے کیلئے مناسب رقم کا اندازہ نہیں ہوتا ہے اس لئے وہ معلومات تک رسائی آسان بنا دیتی ہیں۔

جنرلوں اور ایڈمرل کے ساتھ ابتدائی ملاقات کے بعد واشنگٹن اور بوسٹن میں دوسرے ایسے ہی افسران سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ اگرچہ افراد اکثر اوقات مختلف ہوتے تھے لیکن ان ملاقاتوں نے شرکاء کے عہدے اور تجربے لگ بھگ یکساں ہی ہوتے تھے۔ با اثر فوجی حضرات ریٹائرمنٹ کے بعد اعلیٰ کارپوریٹ ملازمتوں یا اس سے کم عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ چک ایسی کئی ملاقاتوں میں شریک ہوتا تھا مگر ہمیشہ اپنے نمائندے کو بھیج کر مجھے بلایا کرتا تھا اور مجھے خود آگے بڑھ کر اس سے ملنا پڑتا تھا۔

اس خوبصورت ماتحت کے افسر فوجی جنرل کے ڈیگو گارسیا سے طویل عرصے سے وابستگی تھی اور اس نے کافی تقریبات کا انعقاد کیا تھا۔ اسی نے اطلاع دی تھی کہ اس کا ماتحت توقعات کے برخلاف آہستہ مگر مستقل بنیادوں پر راہ ہموار کر رہا تھا۔ ''وہ خاتون کافی جذباتی واقع ہوئی ہیں لیکن وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتی ہے کہ وہ اس سے سچا پیار کرے۔'' جنرل نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا ''میرا خیال ہے کہ تمہاری خاتون ہم منصبوں کو اتنی مشکل نہ ہوتی ہوگی۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ میں نے کبھی سچی محبت کا مطالبہ نہیں کیا صرف چند لمحات کا لطف کافی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں مرد اور عورت کے درمیان بنیادی فرق ہی یہی ہے۔ میں تو خوبصورت عورت کے بدلے پینٹاگون کی چابیاں بھی پکڑا دوں۔''

اور بالآخر ماتحت نے وہ کمال کر دکھایا جو بقول جنرل کے ''وہ کامیابی حاصل ہوگئی جس کا ہمیں کافی عرصے سے انتظار تھا۔'' وہ خاتون اس سے اپنے راز و نیاز کرنے لگی تھی لیکن آخر میں ہمیں وہ پتہ چلا جو ہم نہیں سننا چاہتے تھے کہ رینے کو خریدا نہیں جا سکتا تھا اور اس سے بھی زیادہ خراب معلومات یہ تھیں کہ وہ ڈیگو گارسیا کے باشندوں کی خفیہ بے دخلی کو عوام کے سامنے لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جنرل نے بتایا ''اس عورت کا کہنا ہے کہ وہ بہت پر عزم ہے بلکہ شاید اصول پرست آدمی ہے۔'' اور رینے شاید اس سازش کی بات کرنا چاہتا ہے ہاں بظاہر وہ یہی سازش کا لفظ استعمال کر رہا تھا جس سے لندن اور واشنگٹن کی ملی بھگت سے وہ کہانی منظر عام پر لائی گئی تھی کہ اس جزیرے پر کبھی بھی وہ ہزار دو ہزار ماضی کے غلام نہیں رہا کرتے تھے لیکن اب بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ یہ ہمیں بہت تنگ کر رہا ہے اور ہمیں کچھ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ خفیہ معلومات کس درجے کے افسران تک پہنچائی گئی تھی یا سیشلز کے صدر کو بے ایمانی کیلئے اکسانے پر کتنے لوگ مامور کئے گئے تھے۔ اس وقت سیشلز کے معاملے میں

میری تقرری کے علاوہ میں پانامہ کے ٹوریجوس اور ایکواڈور کے رالڈاس کو اپنا حلیف بنانے میں الجھا ہوا تھا کیونکہ ان دونوں رہنماؤں نے حکم عدولی کی تھی اس لئے دونوں لاطینی رہنما کی جہازوں کے دو مختلف حادثوں میں ہلاکتیں ہوگئی تھیں جو ۱۹۸۱ء کے عین وسط میں سی آئی اے کی مدد سے عمل میں لائی گئی تھیں۔ اسی سال نومبر میں سیشلز کے معاملے میں معاشی تباہ کاروں کو کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ ہمیں وہ احکامات ملے تھے جو ہم میں سے کوئی سننا نہیں چاہتا تھا۔ جیک کوربن اور نہایت مشاق کرائے کے قاتلوں کو صدر رینے کو قتل کرنے کیلئے روانہ کیا گیا تھا۔

ایئر انڈیا 707 کا اغواء

جیک نے مجھے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانا شروع کیا "ہم نے بیالیس اعلیٰ اور مشاق کرائے کے قاتلوں کی ایک جماعت تشکیل دی اور ڈربن، جنوبی افریقہ پہنچ گئے۔ ہم اپنے آپ کو اینشیئنٹ آرڈر آف دی فروتھ بلوورز کے نام سے ظاہر کر رہے تھے جو ایک رگبی کھیلنے والا اور بے تحاشہ شراب پی جانے والا خیراتی ادارہ ہے جو سیشلز کے بچوں میں کرسمس کے کھلونے بانٹنے آئی تھی جو زیادہ تر کیتھولک فرقے کے ماننے والے ہیں۔ منصوبہ بہت سادہ سا تھا، ہم نے الگ ہو جانا تھا اور دوبارہ سوازی لینڈ میں اکٹھا ہونا تھا۔ وہاں سے شاہی سوازی جیٹ میں جزیرہ ماہے کے دارالحکومت شہر وکٹوریہ پہنچ کر اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف روانہ ہو جانا تھا جہاں پر ہمیں ایک اور برتر جماعت سے ملنا تھا جس میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں جن کا انتخاب کافی دیکھ بھال کے بعد کیا گیا تھا۔ ان کی ذمہ داری یہی تھی کہ اعلیٰ عہدیداران سے مفید اور منتخب معلومات حاصل کر سکیں۔

"ہمارے ہتھیار اور دیگر ساز و سامان جزیرے پر خفیہ مقام میں منتقل کر دیا گیا تھا تو میں سوازی لینڈ یا ماہے میں ایئر پورٹ پر کسٹم کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی ذرا برابر پرواہ نہ تھی۔ یہ تمام لوگوں کیلئے انتہائی اہمیت کی حامل بات تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سیشلز میں بھی ہماری مدد کیلئے ایک حکمت عملی تیار کی گئی ہے جس میں زیادہ تر مقامی پولیس والے شامل ہوں گے جو ہماری رہنمائی اور مدد کیلئے مامور ہوں گے مگر تمام تر اہم کام ہم نے خود ہی انجام دینے ہوں گے جیسے مقابلے وغیرہ میں اسلحہ کا استعمال۔"

"ہمیں اصل مزاحمت کا سامنا چند سو تنزانیہ کے فوجیوں کی صورت میں کرنا تھا جنہیں رینے نے خاص طور پر بلوا کر ہوائی اڈے کے قریب ان کی تعیناتی کی تھی۔ میرے روڈھویشین تجربات کے مطابق تنزانیہ کے فوجی بہترین جنگجو ہوتے ہیں۔ سخت جان اور مضبوط۔ وہ ہی اصل مسئلہ بن سکتے تھے بالخصوص جب وہ ہمارے ایک آدمی کے مقابلے میں پانچ یا چھ کی تعداد میں زیادہ تھے۔ طے شدہ رات کو علی الصبح ہم چار لوگوں نے ان کی بیرکوں میں گھس کر جب وہ سو رہے ہوں گے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا تھا۔ اس کے نتیجے میں افراتفری پھیل سکتی تھی جس کے بعد ہم

ریڈیو اسٹیشن اور صدارتی محل پر قبضہ کر کے مینچم کا پہلے سے ریکارڈ شدہ بیان نشر کر دیں گے جس میں وہ دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کا اعلان کرے گا۔ ساتھ ہی وہ لوگوں کو گھروں میں بیٹھ کر سکون سے انتظار کرنے کو کہے گا۔"

"کینیائی فوج چھاتہ بردار دستوں سے بھرا ہوا جہاز لے کر نیروبی میں کھڑے ہوں گے۔ ایک بار ریڈیو سے اعلان نشر ہو جائے گا تو فوراً سفر پر روانہ ہو جائیں گے اور وہاں بروقت پہنچ کر اسے افریقی بغاوت کا رنگ دینے کی کوشش کریں گے اور تمام کاروائی کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لیں گے۔ پریس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہم ایک نجی ایئر لائن کے طیارے سے واپس جنوبی افریقہ پہنچ جائیں گے۔"

لیکن قاتلوں کا یہ گروہ صدارتی محل کے قریب بھی نہ پھٹک پائے تھے۔ منصوبہ اس وقت ناکامی سے دوچار ہو گیا تھا جب ایک حفاظتی اہلکار نے ماہے کے ہوائی اڈے پر گروہ کے ایک رکن کے پاس ایک بندوق دیکھ لی تھی جو اس نے اپنے سامان میں ٹھونسی ہوئی تھی۔ دراصل آخری لمحات میں ان میں سے کچھ ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے کی ہدایت ہوئی تھی مگر سامان کے باندھنے میں اس غیر محتاط رویے کے مظاہرے نے کئی برسوں تک لوگوں کو پریشان کئے رکھا تھا اور اس معاملہ میں ہزاروں مختلف آراء سامنے آتی رہی تھیں۔

بندوق کے نظر آتے ہی زوردار فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ جیک کے مطابق وہ فائرنگ کا تبادلہ اس کی زندگی کے چند ان لمحات میں سے ایک تھا جہاں اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ فرار نہ ہو پائے گا اور اس فرار کیلئے کافی سوچ و بچار کرنا پڑا تھا۔ ہم ہوائی اڈے میں بری طرح گھر چکے تھے ہمارے پاس اسلحے کے چند میگزین تھے جو ہم نے اپنے ساتھیوں سے حاصل کئے تھے جو ہوائی اڈے پر ہمیں لینے پہنچے تھے یا باقی ہمیں ایئر پورٹ کے حفاظتی عملے سے چھیننا پڑا تھا۔ ہم نے اسلحہ کی اچھی خاصی مقدار ان دستوں سے چھینی تھی جن پر ہم نے اس وقت حملہ کیا جب وہ ایئر پورٹ کی دوسری طرف اپنی بیرکوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے تنزانیہ کے فوجیوں کی بیرکوں پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی تھی۔ صورتحال کافی نازک ہوتی جا رہی تھی کیونکہ تنزانیہ کے مزید فوجی ہم سے نمٹنے کیلئے لائے جا رہے تھے۔

اور پھر جیک کے گروہ کے ایک رکن نے کنٹرول ٹاور میں ایئر انڈیا کے جہاز کو اترنے کی

درخواست کرتے ہوئے سنا جو یہ بھی پوچھ رہا تھا کہ رن وے کی روشنیاں کیوں بند کی گئی ہیں۔ قاتلوں کے گروہ نے فوراً روشنیاں جلا دیں اور پائلٹ کو جہاز اتارنے کی اجازت دے دی اور پائلٹ کو یہ بتایا گیا کہ روشنیاں تکنیکی وجوہات کی وجہ سے بند کی گئی تھیں جواب حل ہوگیا۔

جیک نے بتایا ''ہمارے اور سیشلز کے عہدیداران کے درمیان فون پر رابطہ ہوا تھا۔ انہوں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ فائر بندی کا اعلان کردیں گے۔ اگر ہم اس جہاز پر سوار ہوکر جزیرے کے حدود سے نکل جائیں۔ ہم میں زیادہ تر اس ترکیب پر عمل کرنے کیلئے تیار تھے کیونکہ صبح ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا اور ہمیں یہ بھی پتہ چلا تھا کہ ہم چاروں طرف سے گھر چکے تھے اور روسی لڑاکا طیارے بھی بندرگاہ پر پہنچ چکے تھے اور اب وہ ہماری طرف ہی آرہے تھے۔ اس وقت مجھے تو کچھ اور سجھائی نہ دے رہا تھا۔ جہاز پر سوار ہونے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ ہم نے بوئنگ ۷۰۷ میں ایندھن بھروایا، ایک ہلاک شدہ ساتھی کی لاش کے ساتھ بہت سا دوسرا ساز و سامان بھی جہاز میں لدوایا۔ بہت سے ساتھیوں نے جہاز پر چڑھ کر بیوقوفوں کی طرح بیٹھنے سے پیچھے رکنے کو ترجیح دی تھی لیکن ہم بقیہ لوگ جو جہاز پر سوار ہونے کیلئے تیار تھے روانہ ہوگئے۔ ہم جیسے ہی ہوا میں معلق ہوئے تنزانیہ اور سیشلز کے فوجیوں نے ہمارے جہاز کو گرانے کی کوشش کی وہ اندھا دھند فائر کررہے تھے۔ ہمارا اگلا پڑاؤ ڈربن، جنوبی افریقہ تھا۔ جہاز پر چڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ ہم میں سے ایک ہلاک ہو چکا تھا، سات گمشدہ تھے یا گرفتار ہو چکے تھے یا پھر جیل بھیج دیے گئے تھے جن میں ایک خاتون ساتھی بھی شامل تھی۔''

ڈربن پر اترتے ہی ایئر انڈیا کے جہاز کو چاروں طرف سے جنوبی افریقی حفاظتی اہلکاروں نے گھیر لیا تھا۔ ان سے مواصلاتی رابطہ قائم کیا گیا اور حفاظتی عملے کے سربراہ کو معلوم ہوا کہ جہاز اس کے اپنے دوستوں کی نگرانی میں تھا۔ جیک نے گروہ کے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ہتھیار پھینک دیے تھے۔ جیل میں کچھ وقت گزار کر اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ سیشلز حکومت نے ان سات ساتھیوں کو گرفتار کرلیا تھا جو ایئرپورٹ پر پکڑے گئے تھے۔ خاتون ساتھی پر الزامات ثابت نہ ہوسکے تھے۔ چار کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی اور باقی دو کو دس اور بیس سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ جنوبی افریقی حکومت نے ان کی رہائی کیلئے مذاکرات کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ آخر میں یہ پتہ چلا تھا کہ پریٹوریا نے سیشلز کی حکومت کو ان کے رہا کرنے کے عوض تین ملین ڈالر دیے تھے جو تقریباً ایک آدمی کے پانچ لاکھ ڈالر بنتے ہیں۔

اگرچہ بظاہر یہ ایک ناکامی تھی مگر سیشلز کا معاملہ کارپریٹو کریسی کی کامیابی تھی۔ طیارہ اغوا کرنے اور بعد میں چلنے والے مقدموں کے باوجود امریکہ اور برطانیہ تنازعات سے بچ نکلے تھے اور ساری ذمہ داری جنوبی افریقہ پر آگئی تھی۔ رینے جو پہلے کافی آنکھیں دکھارہا تھا وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا اور ڈیگو گارسیا کے متعلق اپنی حکمت عملیوں میں تبدیلی لانے کو تیار ہوگیا تھا۔ ساتھ ہی وہ واشنگٹن، لندن اور پریٹوریا کے ساتھ نرم رویہ اختیار کررہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اگلی تین دہائیوں تک اس وقت تک اقتدار پر فائز رہا تھا جب تک ۲۰۰۴ء میں اس کا نائب صدر جیمس میشل قومی انتخاب میں پانچ سال کیلئے منتخب ہوگیا تھا۔ امریکی فوجی اڈہ افریقہ، ایشیاء اور مشرق وسطیٰ میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔

کرائے کے قاتل اکثر اپنی اہمیت کو لے کر مذاق کیا کرتے ہیں جو ڈیگو گارسیا کے باشندوں سے دس گنا زیادہ ثابت ہو چکی تھی۔

باب نمبر: ۴۷

ماحولیاتی سائنسدان کا قتل

سیشلز کی کہانی ایک صدر کے قتل کی کوشش کا ڈرامائی رخ ہے جو کافی حیران کن ہے کیونکہ اس میں کرائے کے قاتلوں کی بھاری نفری شامل تھی جس کا نتیجہ ایک تجارتی ہوائی ادارے کے جہاز کا اغواء تھا۔ یہ معاملہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ ایسے حربے صرف اس وقت عمل میں لائے جاتے ہیں جب معاشی تباہ کار ناکام ہو جاتے ہیں۔

افریقہ میں معاشی تباہ کاروں کی ناکامیاں لاتعداد ہیں۔ اسی لئے اس براعظم کی سیاست میں ہلاکتوں کا کافی اہم کردار ہے۔ اگرچہ زیادہ تر خفیہ طور پر عمل میں لائی گئی تھیں مگر چند ایک قانونی پھانسیوں کو خفیہ طور پر بھی سرانجام دی گئی تھیں اور شاید اس کی سب سے مشہور مثال کین سارو ویوا تھا۔

سارو ویوا ایک نائیجیرین ماحولیاتی سائنسدان اور اوگونی قبیلے کا رکن تھا جو اپنے ملک میں استحصال برپا کرنے والی تیل کی کمپنیوں کے خلاف تحریک چلا رہا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں پیسیفیکا ریڈیو اسٹیشن ڈبلیو بی اے آئی نیو یارک کیلئے ایمی گڈمین نے اس کا انٹرویو کیا تھا۔

کین سارو ویوا (شیل آئل کمپنی) نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ میری نقل وحرکت پر نظر رکھے گی اور دیکھے گی کہ میں کہاں آتا جاتا ہوں۔ مستقل میرا تعاقب کریں گے تاکہ میں انہیں شرمندہ نہ کرسکوں۔ چنانچہ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا خاص دھیان رکھنے کا حکم ملا ہوا ہے۔ اس سال کے شروع میں جنوری کی دوسری تاریخ تھی جب مجھے میرے گھر میں میرے خاندان کے ساتھ تین دن کیلئے نظر بند کیا گیا تھا۔ شیل کے خلاف ہونے والے احتجاج کو روکنے کیلئے ایسا کیا گیا تھا۔ تقریباً تین لاکھ اوگونی باشندے اس احتجاج میں شرکت کیلئے پہنچے تھے تاکہ وہ شیل اور دیگر ملٹی نیشنل تیل کی کمپنیوں کے ہاتھوں ہونے والی ماحولیاتی بربادی کے خلاف اپنے غم وغصے کا اظہار کرسکیں اور انہوں نے اس کا سیدھا سا حل یہ نکالا کہ میرے گھر کی طرف فوجی روانہ کر دیے۔ انہوں نے میرے ٹیلی فون کاٹ دیے، موبائل فون ضبط کر لئے اور مجھے تین دن بغیر خوراک کے بند رکھا گیا۔

کین سارو ویوا کو اسی سال دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور کارپریٹوکریسی کی حمایتی آمر سانی اباچا

کی حکومت نے اس پر مقدمہ چلایا جو بہت سے مبصرین کے مطابق ایک ''کینگرو کورٹ'' سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۹۵ء کو کین سارو ویوا اور اس کے آٹھ ساتھی ماحولیاتی ماہرین کو پھانسی دے دی گئی۔

پھانسی شدہ ماہر کا بیٹا کین ویوا نے ۲۰۰۵ء میں ایمی گڈمین کے پروگرام ''ڈیموکریسی ناؤ'' کیلئے انٹرویو دیا۔

کین ویوا: میرے والد کے دل میں کوئی بغض نہ تھا یہ میرے خاندان اور میرے قبیلے کی فطرت نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیل تمام مسائل میں شریک تھی اور اس لئے حل بھی انہیں کے پاس موجود ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ معاشی مساوات کے ساتھ وفاداری اور تھوڑے سے وقار کے ساتھ یہ صورتحال اب بھی بہتر بنائی جاسکتی ہے مگر میرے والد کے قتل کو دس سال بیت چکے ہیں لیکن نائیجیریا کی فوج کا کوئی ایک افسر بھی جنہوں نے اوگونی قبیلے پر حملہ کیا تھا۔ ماورائے عدالت قتل میں ملوث رہے، جوان لڑکیوں اور خواتین کی عصمت دری کی اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ ہماری تنظیم کے احتجاج کو کچلا جاسکے تاکہ تیل اسی طرح کشید کیا جاسکے لیکن کوئی بھی فوجی گرفتار نہ ہوا۔

ہلاکتیں چاہے جیک کوربن جیسے کرائے کے قاتلوں سے کرائی جائیں یا آمر حکومتوں کی عدالتوں کے ذریعے عمل میں لائی جائیں ان کے سماجی اور ماحولیاتی تحریکوں پر بہت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گرفتاریوں، تشدد اور موت کا خوف اور اس سے خاندان اور قبیلوں پر مرتب ہونے والے اثرات کی وجہ سے بہت سے کارکن ان مہموں کو ترک کر دیتے ہیں اور یہ حقیقت کارپریٹوکریسی کیلئے کافی اہمیت کی حامل ہے۔

آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو سیشلز کے معاملے میں شریک جیک اور اس کے گروہ کے دیگر ارکان عراق میں اپنی کارستانیوں میں مصروف ہیں۔ جمہوریت کے دفاع کی ڈھکوسلے کی آڑ میں وہ تمام ایسی کارروائیاں روا رکھے ہوئے جن کے ذریعے وہ بے تحاشہ منافع کمانے والی کارپوریشنز اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، پینٹاگون یا کسی اور خفیہ ایجنسی کے خرچے پر حاصل کی گئی ہوتی ہیں۔ ان کے معاہدوں کے مطابق وہ تحفظ فراہم کرنے اور انتظامی معاملات میں مشاورت فراہم کرتی ہیں۔

ڈیگو گارسیا کے بے دخل باشندوں کی افسوسناک کہانی ابھی تک جاری ہے۔ بیسویں صدی

کے آخری چند سالوں میں اپنے جزیرے سے جلاوطن باشندوں نے اپنے گھروں کو واپسی کی مہم شروع کی تھی۔ بتیس سال کی غربت، بے دخلی اور جلاوطنی کے نتیجے میں ہونے والی جسمانی اور جذباتی اذیت کا معاوضہ چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنی زمینوں کی واپسی کے بھی خواہش مند تھے۔

ان کے ایک وکیل بیرسٹر سر سڈنی کینٹرج نے اصل معاہدے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ برطانیہ کی تاریخ کا ایک بہت افسوسناک اور نا قابل ستائش باب ہے۔'' بی بی سی نے پورے تنازعے کو ایسے بیان کیا ''اس میں امریکہ سے لی گئی رشوتوں کا کمال ہے، تجربہ کار سول عہدیداروں کی نسل پرستی کا عمل دخل رہا اور ساتھ ہی بعض برطانوی پارلیمنٹ اور اقوام متحدہ کا کردار کے بھی شواہد ملتے ہیں۔''

۲۰۰۰ء میں لندن کی عدالت نے فیصلہ سنایا ''بے دخلی غیر قانونی تھی مگر حکومت جزیرے کے باشندہ کو ڈیگو گارسیا واپس نہیں بھیجنا چاہتی تھی تا کہ وہ عراق پر کیے جانے والے امریکی حملے کیلئے اڈہ کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔''

سیشلز میں ممکنہ بغاوت اور ڈیگو گارسیا کی غارت گری کے قصے نہایت پریشان کن ہیں بالخصوص جب وہ جمہوریت کے دفاع کی آڑ میں پیش آئیں۔ وہ کافی قابل افسوس کہانیاں ہیں لیکن ان جرائم کے مقابلے میں پھیکے پڑ جاتے ہیں جو بقیہ براعظم کے سارے علاقوں میں طویل عرصے تک کئے گئے تھے اور آج بھی جاری ہیں۔

باب نمبر: ۴۸

کم جانا پہچانا براعظم

''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کی اشاعت کے بعد جن بہت سارے کرائے کے قاتلوں اور معاشی تباہ کاروں کے ساتھ میرا وقت گزرا جیک ان میں سے ایک تھا۔ کارپریٹوکریسی کی ایماء پر کی جانے والی دنیا کے تمام براعظم میں کی جانے والی بہت سی زیادتیوں کے حوالے سے ہماری گفتگو بار بار افریقہ کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں۔

وہ تمام مرد اور عورتیں جو پچھلی چار دہائیوں میں دنیا کی تاریخ ترتیب دینے میں ملوث رہے تھے افریقہ میں ہونے والی سرگرمیوں میں ان کی خاصی دلچسپی رہا کرتی تھی۔ کانگو کے پیٹرس لومبا کے قتل میں امریکی کردار، انگولا کے جوناس ساومبی، کانگو کے موبوٹو سیسی سیکو اور لارنٹ کابیلا، نائیجیریا کے اباچا اور اولوسیگن ادباسانجو، لائبریا کے سیموئل ڈو جیسے آمروں کی کھلی حمایت اور حالیہ دور میں روانڈا، سوڈان اور لائبریا میں روا رکھے جانے والے وحشیانہ کارروائیاں ان پچھلی چار دہائیوں کی چند لرزا دینے والے واقعات میں سے کچھ ہیں۔ ان میں اکثر لوگ کلنٹن انتظامیہ کے مجوزہ ''افریقی احیاء'' کی ناکامی پر سخت پریشان تھے جو اکثریت کی رائے کے مطابق یکے بعد دیگرے سفاک حکمرانوں کو مضبوط کرنے کا ٹھیک ٹھاک بدنما اور بھدا انداز تھا۔ ساتھ ہی وہ کئی ممالک میں قرضے معاف کرنے کی کوششوں کے متعلق تفصیل سے رائے زنی کرتے تھے کیونکہ وہ بھی جو دراصل بش انتظامیہ کی سخاوت کا مظاہرہ کر کے کارپریٹوکریسی کے تسلط کو فروغ دینے کی ایک ترکیب تھی جو معاشی تباہ کاروں نے وضع کی تھی۔

انہوں نے مجھ سے رابطہ میری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا تھا کیونکہ وہ بھی اس دلدل میں پھنس گئے تھے۔ اکثر قانونی اور کاروبار کی تعلیم کے دوران یہ سکھایا جاتا ہے کہ ترقی کیلئے بعض اوقات ایسی راہیں اپنانا پڑتی ہیں جو جمہوریت کی روح کے منافی ہوتی ہیں مگر اپنے مطلوبہ نتائج کو حاصل کرنے کیلئے انہیں استعمال میں لانا پڑتا ہے اور معاشی تباہ کار روزگار کی تلاش میں ماہر جنگجو ہوتے ہیں جو ایسے مقاصد کیلئے مہرے بنتے ہیں۔ ان کی خدمات کو ادارے کے بہروپ میں حاصل کیا جاتا ہے تا کہ انہیں یقین دلایا جا سکے یا وہ یہ دل سے مان لیں کہ ان کی بہتری کیلئے ایسا کیا

جارہا ہے اور پھر میری طرح وہ احساس گناہ کی اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جرائم کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں ان کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قصے کسی ہمدرد سامع کو سنانا چاہتے ہیں تاکہ شاید اس طرح وہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکیں۔

یہ مرد اور عورتیں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ امریکی عوام کو دھوکہ دیا جارہا ہے اور وہ بھی دھوکہ دینے کے عمل میں آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ تمام تر سیاسی دعوؤں کے باوجود افریقہ آج ان دنوں سے کہیں زیادہ غریب ہے جب میں الیگزینڈریا میں رہا کرتا تھا یا جس وقت جیک روڈھوشیا روانہ ہوا تھا۔ میرے جیسے کئی لوگوں نے تیس سال پہلے اپنی ملازمت شروع کی تھی۔ ۵۳ میں سے ۴۳ افریقی ممالک برسوں سے خوراک کی کمی اور کم آمدنی کا شکار ہیں۔ قحط اور خشک سالی پر کچھ عرصے بعد بڑے بڑے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ معدنی ذخائر کو غیر ملکی صنعتیں اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتی ہیں جو قانون کے نظام میں کمزوریوں اور بدعنوان افسران کا فائدہ اٹھا کر حاصل ہونے والے منافع کو مقامی صنعتوں میں لگانے سے محفوظ رہتی ہیں اور اس طرح کمزور معیشتوں اور نااہل حکومتوں کو سرپرستی فراہم کرتی ہیں۔ عوام کو تشدد، نسلی اختلافات اور خانہ جنگی کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ سالانہ تین ملین بچے بھوک اور بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے مرجاتے ہیں۔ براعظم کی اوسط شرح زندگی کی چھیالیس برس ہے جو تقریباً ۱۹۰۰ء میں امریکہ کی ہوا کرتی تھی۔ ۴۵ فیصد آبادی ۱۵ سال سے کم عمر بچوں پر مشتمل ہے مگر انہیں کبھی بھی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہو پاتا کیونکہ بھوک، زرد بخار، ملیریا، تپ دق، پولیو، ایڈز، ایچ آئی وی، ہیضہ اور جنگ جیسے مسائل ان کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔ قریباً تین ملین افریقی ایچ آئی وی میں مبتلا ہیں اور لاکھوں بچے ایڈز کی وجہ سے یتیم ہو چکے ہیں۔

افریقہ جن مسائل سے دوچار ہے وہ یقیناً نئے نہیں ہیں ان کی جڑیں نوآبادیاتی نظام تک جاتی ہیں جو یہاں ذخائر کی تلاش سے شروع ہوا تھا اور بیسویں صدی کے پہلے حصے تک جاری رہا تھا۔

۲۰۰۵ء میں عالمی بینک کی مڈل مینجمنٹ کے عہدے پر فائز جیمس نے اپنے اس مسئلے کو مختصر بیان کیا تھا جو پورے براعظم کی شکل بن چکا ہے۔ اس نے کہا ''مجھے نہیں معلوم میں کہاں سے آیا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد اپنے گھروں سے گھسیٹ کر یہاں لائے گئے تھے اور انہیں خرید کر غلام بنادیا گیا تھا۔ لاطینیوں، ایشیائیوں اور مشرق وسطیٰ کے ان باشندوں کے برعکس جو امریکہ میں رہ رہے ہیں میں اپنے پس منظر سے جڑ نہیں پاتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا ہوں کہ میرے باپ دادا

کون سی زبان بولتے تھے۔''

غلاموں کی تجارت یقیناً انسانی حیوانیت کی طویل تاریخ میں انسان کے خلاف روا رکھے جانے والے مظالم میں سب سے گھناؤنا اور تباہ کن ہے۔ ساتھ ہی مقامی آبادیوں پر جبر کر کے ادب، آرٹ اور سینما کے ذریعے ان مقامی باشندوں کو کمتر وحشیوں کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا۔ مختلف النوع سلطنتوں کے ظلم کا شکار افریقہ جہاں تفرقے پیدا کر کے قبضہ کرنے اور استحصال کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں اور یہ دیکھ کر آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ افریقہ دنیا کا سب سے زیادہ ظلم کا نشانہ بننے والا اور غلط سمجھا جانے والا خطہ ہے۔

ایشیاء، لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کسی نہ کسی مشترک تعلق کے دھاگے سے منسلک ہیں لیکن افریقہ ایک نہ سمجھنے والی گتھی بن چکا ہے۔ اس کی تاریخ، جغرافیہ، ثقافتیں، مذاہب، سیاست، فصلیں اور معدنی وسائل ناچاقیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس رویے سے بیگانگی کا جذبہ پروان چڑھا تھا یہاں تک کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر رہنا شروع ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی طاقتوں کو استحصال کی نئی راہیں فراہم ہو گئی تھیں۔ بہت سے ممالک میں ماضی کی نوآبادیاتی یورپی حاکموں کی جگہ افریقی حاکموں نے لے لی تھی۔ وہ اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چل رہے تھے اور کھلم کھلا ان غیر ملکی عہدیداروں کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے جو ان کی زمینوں اور لوگوں کو بغیر روک ٹوک کے برباد کر رہے تھے۔

تاریخی حوالوں کی نشاندہی کر کے مستقبل کے امکانات پر غور کرنے میں مدد ملے لیکن ماضی کے ادوار کی غلطیوں کی حالیہ مسائل کا ذمہ دار ٹھہرانے سے مسائل حل کرنے کی کوششیں ٹل جاتی ہیں۔ معاشی تباہ کار اور کرائے کے قاتل مرد اور خواتین جن سے میری ملاقاتیں رہی تھیں وہ یہ بلاشک وشبہ اس بات سے واقف تھے کہ حالیہ نہ ختم ہونے والی غربت کی اصل وجوہات کے تانے بانے جنگ عظیم دوئم کے بعد کی سلطنتوں کے معماروں کی کارروائیوں میں جا ملتے ہیں۔ وہ افریقہ کے متعلق بات چیت کرنے اور تحریریں لکھنے کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ وہ یہ قبول کرتے ہیں کہ اب ہمیں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانی پڑے گی اور تبدیلی کیلئے اصرار کرنا پڑے گا۔

اگرچہ افریقہ ایک نامعلوم اور گمنام براعظم ہے تو ساتھ ہی وہ ایسا براعظم ہے جو آرام سے نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور اسی وجہ سے لوٹ مار کیلئے آسان مواقع فراہم کرتا ہے۔ میری تقریروں کے دوران شرکاء سے آ کر یہ پوچھا جاتا کہ کیا وہ بولیویا، وینزویلا، ویتنام، انڈونیشیا یا مشرق وسطیٰ

کے کسی ملک کے نام سے واقف ہیں تو اکثریت ہاں میں جواب دیتی تھی مگر بہت کم حاضرین انگولا، گیبون اور نائیجیریا سے واقف تھے جب میں نے ان ممالک کے بابت سوال کیا تھا ایسا نہیں ہے کہ افریقہ کے ممالک ہمارے نزدیک غیر اہم ہیں۔ نائیجیریا امریکہ کو تیل فراہم کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے جبکہ انگولا چھٹا بڑا اور گیبون دسواں بڑا ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے نائیجیریا دنیا کی نویں سب سے بڑی آبادی ہے جو جاپان (دسواں) اور میکسیکو (گیارہواں) سے آگے ہے۔

افریقہ کی طرف امریکی بے توجہی کی اصل وجہ ہمارا تعلیمی نظام اور مقبول میڈیا ہے۔ یہ بڑا ناپ تول کر طے کیا گیا ہے کیونکہ ہم ناواقف ہیں اس لئے ہمیں پرواہ نہیں ہے کیونکہ ہم پرواہ نہیں کرتے اس لئے یہ علاقہ بربریت کیلئے تر نوالہ ہیں جو یقیناً ان علاقوں سے زیادہ ہوتی ہے جو ہمارے راڈار کی نگاہوں میں آجاتے ہیں۔ ہم نے بولیویا کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے اس لئے ہمیں منوانے کیلئے کہ ایوو مورالیس ایک کٹر کوکین کی کاشت کرنے والا سوشلسٹ ہے کافی مشکل ثابت ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک قوم پرست بولیویائی کسان ہے جو بھاری ووٹوں سے منتخب ہو کر اس عہدہ تک پہنچا ہے جبکہ دوسرے افریقی رہنماؤں کے حوالے سے ہماری رائے بنانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی کیونکہ ہم ان سے ناواقف ہیں بالکل ان باشندوں کی طرح جو ڈیگو گارسیا پر آباد تھے۔ نامعلوم افراد کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ انہیں قید کیا جاسکتا ہے اور قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔

جیمس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ''میں جب بھی افریقہ جاتا ہوں تو مجھے اپنے امریکی ہونے پر شرم آتی ہے۔'' افریقی عوام مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا امریکہ میں لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ کیا ہمیں ان لاکھوں بچوں کے بارے میں کوئی خبر ہے جو جنگوں میں ہلاک ہو گئے تھے؟ جو یتیم اور معذور ہو گئے تھے؟ جو ٹڈی دل کے حملے کا شکار ہو گئے تھے؟ جو سیلابوں اور خشک سالیوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے؟ مجھے اس سچ کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ ہم انہیں جانتے ہیں۔ زیادہ تر امریکیوں کو اس کی ہرگز کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ افریقی امریکیوں کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا ''اور کیا تمہیں اس کا سب سے برا پہلو کیا ہے؟ سب سے برا پہلو یہ ہے کہ وہ امدادی ادارے جو بظاہر ان کی مدد کرتے ہیں اور ہمدرد لوگ ہیں وہ بھی اس کھیل کا حصہ ہیں۔ میں صرف عالمی بینک کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس مکاری میں کچھ غیر سرکاری نجی امدادی ادارے بھی شامل ہیں۔

باب نمبر: ۴۹

این جی اوز: افریقہ کو جان بوجھ کر غریب رکھنے کے پیچھے محرکات

جینی ولیمز نے غیر سرکاری اداروں کے ساتھ افریقہ میں کئے جانے والی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ''کیا ہمیں استعمال کیا جا رہا تھا؟ کیا امداد اور ترقی کے تصور مغرب کے اسلحے کے ذخائر میں شامل سادہ حربے ہیں جو امداد کیلئے نہیں بلکہ تسلط کے کام میں لائے جاتے ہیں؟''

''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کی تدوین کے دوران میری جینی سے جان پہچان ہوئی تھی۔ وہ میرے اشاعتی ادارے بیرٹ کوہلر میں کچھ عرصے کیلئے کام سیکھ رہی تھی۔ اس نے اس دوران نہایت عمدہ مشوروں سے نوازا تھا اور پھر وہ افریقہ کے سفر پر روانہ ہو گئی تھی جہاں وہ ان غیر منافع بخش اداروں کے ساتھ کام کرتی رہی تھی جو یوگنڈا اور سوڈان میں فوری امداد اور بحالی کے منصوبوں میں شامل تھیں۔

اس نے مجھے بتایا ''میں مغرب کے دوغلے پن سے بیزار ہو چکی ہوں اور ان پر تنقید کر کے تھک چکی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ میں اصل مقام پر پہنچ کر کچھ کر سکوں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی کہ ان امدادی رقوم سے کیا ہو رہا ہے۔''

مجھے اس کا نقطہ نظر کافی دلچسپ محسوس ہوا تھا کیونکہ سین ڈیاگو میں پرورش پانے والی اس خاتون نے ۲۰۰۴ء میں برکلے یوسی سے سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے دیکھتی آئی تھی کہ میڈیا کس طرح ''گاہک پرستی'' اور غیر ملکی امداد سے غریبوں کی بحالی جیسے نظریات کو فروغ دیتا ہے۔ وہ میری بیٹی جیسیکا کی طرح اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ہمارے مستقبل کے معمار ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۶ء میں اس نے یوگنڈا سے مجھے ای میل بھیجی۔

افریقہ کو مغرب زدہ کرنے کے واضح اور مستقل اشارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قحط سالی سے دوچار شمالی کینیا میں واقع اسٹالز پر جا بجا کوکا کولا کی بوتلیں سجی نظر آتی ہیں۔ امریکی جدید اشیاء اور آلات کو مفلس افریقی نوجوانوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔ یہاں پر لوگ درآمد شدہ کافی پیتے ہیں کیونکہ بقول ان کی اپنی مقامی بیجوں سے تیار شدہ کافی سے ذائقے میں بہتر ہوتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اپنی اشیاء کارپوریٹوکریسی کے عائد کردہ محصولات اور ٹیکسوں کی وجہ سے مہنگے داموں

میں دستیاب ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ کارپوریشنز نے افریقہ کو استعمال کے لئے ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ہی دیکھا ہوگا مگر مغربیت کی اس ترغیب و ترویج میں غیر سرکاری امدادی ادارے بھی مشینری کا حصہ ہیں۔ رہنمائی کے اصولوں کی قیادت کے طریقوں سے لے کر جلاوطن شہریوں کی تنخواہوں تک امدادی ادارے مغربی ثقافت، سماجی اور معاشی معیاران لوگوں پر لاگو کرتے ہیں جس کی وجہ سے امداد فراہم کرنے والوں اور غریب عوام جن کی خدمت کیلئے وہ وہاں موجود ہیں ایک فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے جو بے چارے غریب افریقی غیر ملکیوں کی نقل کر کے ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مغربی اقدار نے ثقافتی عقائد کی دھجیاں بکھیر دی ہیں جس کی وجہ سے معاشی نظام تہہ و بالا ہو چکا ہے۔

ایک اور گھمبیر مسئلہ یہ ہے کہ شمالی یوگنڈا جہاں بیس سال تک چلنے والی باغیوں کے درمیان جنگوں کی وجہ سے ہزاروں لوگ ہلاک اور قریباً دو ملین بے گھر ہو گئے تھے جہاں امدادی اداروں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ وہاں رک کر اس تنازع کو طول دے رہے ہیں جہاں تک فوری امداد کی فراہمی کا معاملہ ہے۔ این جی او امدادی کارروائیاں جاری رکھیں گے اور امدادی ادارے ان تمام مقامات پر جا کر ان غلیظ کیمپوں میں آباد لوگوں کی مدد کرتے رہیں گے (ایک یوگنڈین ریڈیو پر یہ مذاق میں کہا گیا تھا بوڈا بوڈا سے زیادہ امدادی ادارے موجود ہیں،''بوڈا بوڈا ان موٹر سائیکل ٹیکسیاں کو کہتے ہیں جو یہاں کے شہروں میں آمد و رفت کیلئے استعمال ہوتے ہیں'')

اس بارے میں کوئی رائے نہیں ہو سکتی ہیں کہ جو یوگنڈین ان کیمپوں میں دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے رہ رہے ہیں وہ ان امدادی اداروں کے فراہم کردہ کنویں کھودنے اور نکاسی کی لائینیں ڈالنے کے ساز و سامان، تعلیمی سہولیات اور خوراک کے بغیر زیادہ بڑی تعداد میں ہلاک ہو سکتے ہیں لیکن کیونکہ یہ امدادی ادارے اب تک یہاں موجود ہیں اس لئے یوگنڈین حکومت اور مغرب اس لڑائی کو ختم کرانے سے پہلو تہی کر رہی ہے جس کی وجہ سے پورے علاقے کی ترقی التواء کا شکار ہے۔

مجھے ایک امدادی کارکن نے بتایا''ہم وہ درخت ہیں جس کے پیچھے مغربی حکومتیں چھپ جایا کرتی ہیں جب ان کے پاس کسی مسئلے کا سفارتی یا سیاسی حل ہوتا نہیں ہے یا وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ ہر طرح کی آفت میں سب سے پہلے جائے وقوعہ پر کون پہنچتا ہے؟ امدادی تنظیمیں تاکہ مغرب یہ کہہ سکے کہ دیکھو ہم کچھ تو کر رہے ہیں چاہے وہ یہ کہہ کر اصل مسائل کا حل ڈھونڈنے

سے جان چھڑا رہے ہوں۔''

بالآخر ایسا نہیں ہے کہ مغرب سرد مہری کا مظاہرہ کر رہا ہے یا اسے مدد کرنے میں دلچسپی نہیں ہے بلکہ دراصل افریقہ کو غربت کے جال میں پھنسائے رکھنا مغرب کیلئے انتہائی ضروری ہے۔ مغربی ممالک کے عوام خیراتی جذبے کے تحت ان لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور انہیں امدادی اداروں پر اعتماد ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ اس امداد سے مدد ضرور پہنچتی ہے مگر مغربی حکومتیں اور ملٹی نیشنل کارپوریشنز افریقی ممالک کے عدم استحکام اور پسماندگی سے بے تحاشہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ سستے مزدور طبقے اور زرعی مصنوعات کا کامیابی سے استحصال، وسائل کا غیر قانونی طور پر سرحدوں سے باہر منتقل کرنا اور اسلحے کی تجارت جیسی کارروائیوں کا سارا دارومدار بدعنوان سیاستدانوں، طویل جنگوں اور پسماندہ معاشرہ پر ہوتا ہے جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کر سکیں۔ اگر کانگو میں امن اور شفاف نظام قائم ہو جائے گا تو غیر ملکی کارپوریشنز کیلئے ناممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہو جائے گا کہ وہ معدنی ذخائر کا بے دریغ استحصال کر سکیں۔ اگر کوئی باغی گروپ یا قبائلی تنازعہ نہیں ہوگا تو چھوٹے اسلحے کی کوئی منڈی بھی وجود میں نہیں آئے گی۔

غربت اور تشدد کی تمام وجوہات براہِ راست مغربی مفادات سے وابستہ نہیں ہیں۔ بدعنوان حکمرانوں اور قبائلی تناؤ، غیر موثر حکومتی نظام اور افریقی عوام میں نااتفاقیوں کی وجوہات ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر مغرب مستحکم، ترقی یافتہ افریقہ دیکھنے کا متمنی ہے تو ایسا ہونا کافی حد تک ممکن ہے جبکہ یہاں پر صورتحال عشروں کی مغربی مداخلت اور کئی ملین ڈالرز کی امداد کے بعد بھی دگرگوں ہے۔ میں یہ مانتی ہوں کہ زیادہ تر امدادی کارکن ایماندار، محنتی ہیں جو ترقی پذیر ممالک کے مجبور اور غربت کے اندھیرے میں دھکیلے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں وہ، ہم اس نظام کے خلاف کھڑے ہیں جس کو سمجھنا مشکل اور ان سے کسی حد تک لڑنا ناممکن ہے۔ ہاں شاید یہی اصل مدعا ہے۔ ہمیں اس نظام کو بدلنا ہوگا۔

جینی اس صورتحال کو سمجھنے والی اور اس کو بدلنے کیلئے متحرک رہنے والی تنہا کارکن نہیں ہے۔ امریکا کی یونیورسٹیوں کے طالب علم اور حالیہ برسوں میں سند یافتہ نوجوان اپنی نسل کو لاحق ان خطرات کو اپنے والدین سے بہتر انداز میں سمجھتے ہیں۔ جب وہ سفر کیلئے نکلتے ہیں تو وہ پیرس، روم اور اتھنز افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ورلڈ سوشل فورم کی طرح وہ ریلیوں اور سیمیناروں میں شریک ہوتے ہیں اور مقامی لوگوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ وہ وہاں کی

موسیقی، ثقافت اور لوگوں میں دلچسپی رکھتے ہیں مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عالمی سیاست پر بحث کرتے ہیں۔ نظریات کا موازنہ کرتے ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے منصوبہ تیار کرتے ہیں۔

جو بہت سے ماحولیاتی اور سماجی باشعور افراد بھی نہیں سمجھ پاتے لیکن ان کی اس نسل کا قابل قبول رویہ موبائل فون اور کمپیوٹر پر انحصار ہے جو لاکھوں لوگوں کی زندگیاں برباد کر رہا ہے۔

باب نمبر: ۵۰

لیپ ٹاپ، موبائل فون اور گاڑیاں

خوش نما الفاظ میں اسے جمہوریہ کانگو کہا جاتا تھا (ماضی میں زائر کے نام سے پہچانا جاتا تھا) وہاں پر ۱۹۹۸ء سے لے کر اب تک چالیس لاکھ لوگ قتل کیئے جا چکے ہیں اور ان سب کو اس لئے قتل کیا تھا تاکہ امیر لوگ معمولی قیمتوں کے کمپیوٹر اور موبائل فونز نہ خرید سکیں۔ اگرچہ اس ملک نے ۱۹۶۰ء میں بیلجیئم سے آزادی حاصل کر لی تھی مگر جلد ہی وہ واشنگٹن کے زیر اثر آ گیا تھا۔ ۲۰۰۶ء میں ٹائم میگزین نے ''دنیا کی سب سے جان لیوا جنگ'' کے عنوان سے ایک خبر کی اشاعت کی تھی جس میں واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ ''کانگو کے پہلے منتخب وزیراعظم (لوممبا) کو امریکہ اور بیلجیئم کی حمایت یافتہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا کیونکہ اس کے سوویت یونین سے تعلقات مضبوط ہو رہے تھے۔''

لوممبا کے قتل کے بعد آرمی جنرل موبوٹو سیسی سیکو نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ ٹائم کے الفاظ میں اسے ایسے بیان کیا گیا تھا ''سرد جنگ کے دوران امریکا کا چہیتا موبوٹو افریقی تاریخ کی سب سے بدعنوان حکومت کا صدر نامزد ہو گیا ہے۔''

موبوٹو کا طویل اقتدار سفاکیت اور بدعنوانی سے بھرپور تھا ساتھ ہی پڑوسی ممالک اس دور میں شدید اذیت سے دوچار رہے تھے۔ ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۷ء میں روانڈا اور یوگنڈا نے کانگو میں فوجی دستے بھیج کر موبوٹو کا تختہ الٹ دیا تھا اور اس کی جگہ باغی رہنما لارنٹ کبیلا کو نیا صدر بنا دیا گیا تھا لیکن کبیلا ئے دور حکومت میں سماجی اور معاشی حالات ابتری سے دوچار ہو گئے تھے۔ یوگنڈا اور روانڈا نے ۱۹۹۸ء میں دوبارہ حملہ کر دیا تھا۔ کانگو کے قدرتی ذخائر سے فائدہ اٹھانے کیلئے چھ مختلف ممالک نے افریقہ کی پہلی جنگ عظیم میں شامل ہو گئے تھے۔

نسلی، ثقافتی اور قبائلی تنازعات نے اس جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن دراصل یہ وسائل کے حصول کی جنگ تھی۔ ٹائم میگزین کے مطابق کانگو کی زمین ہیرے، سونے، تانبا، ٹینٹالم (مقامی طور پر کولٹان کہلایا جاتا ہے جو بجلی کے آلات جیسے کہ موبائل فون اور لیپ ٹاپ کمپیوٹرز میں استعمال ہوتا ہے) اور یورینیئم کے ذخائر سے بھری ہوئی ہے۔ ملک نہایت وسیع اور تقریباً الاسکا کے رقبے

کے نصف ہوگا اور کافی علاقوں میں سرسبز معتدل جنگلات اور زرخیز زرعی زمین پھیلی ہوئی ہیں۔اس علاقے کے متعلق میری تحقیقات کے مطابق مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ دریائے کانگو کے پانی میں سے اس قدر توانائی حاصل ہو سکتی ہے جو براعظم کے بڑے حصے کو پانی سے پیدا ہونے والی بجلی فراہم کرنے کیلئے کافی ہے۔''

کانگو کے ٹینٹالم کے بغیر ہم کمپیوٹر اور اس کے آلات تیار نہیں کر پاتے (مثلاً ٹینٹالم کی قلت کے باعث ۲۰۰۰ء کے کرسمس کے تہوار کے موقع پر سونی پلے اسٹیشن کی دستیابی مشکل بن گئی تھی) روانڈا اور یوگنڈا کے ملیشیا گروپ یہ کہہ کر اپنے حملوں کو جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ باغیوں سے اپنے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا چاہتے ہیں مگر انہی حملوں کے دوران انہوں نے ٹینٹالم جمع کر کے غیر قانونی طور پر سرحدوں کے پار بھیج کر کئی بلین ڈالر بھی کماتے تھے۔

امریکہ، برطانیہ اور جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے معاشی تباہ کار، کرائے کے قاتل اور سرکاری اہلکار مستقل تنازعات کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل تنازعے کی صورت میں تمام فریقین کو اسلحہ بیچ کر منافع کمایا جاتا ہے۔ جنگ کے ذریعے کارپوریشنز انسانی حقوق اور مالیاتی تحفظ کے اداروں کو جھانسہ دے کر ٹیکس اور محصولات سے بچ جاتی ہیں اور ان کی کڑی نگرانی سے بھی محفوظ رہتی ہیں۔

کانگو ان بہت سے علاقوں میں سے ایک جگہ ہے جہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ امریکی کانگریس کی خاتون رکن سنتھیا میک کنی (ڈیموکریٹک جارجیا) نے اس کے بہت سے پہلوؤں پر سے ۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء کو ضمانت پر مقدمے کے دوران پردہ فاش کر کے اسے ''انگریزی بولنے والوں کی سازش'' کے نام سے عبارت کیا تھا۔ اس کے ابتدائی بیان میں یہ اعتراضات عائد کئے گئے تھے۔

''جو کچھ آج یہاں بیان کیا جائے گا اس کے بڑے حصہ کا کبھی بھی سرکاری میڈیا پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بہت سی طاقتوں نے ان معاملات کو منظر عام پر آنے سے روکنے کے بعد کے افریقہ میں روا رکھے جانے والی کارروائیوں کی تحقیقات سے مغرب کے ظلم، دھوکہ دہی اور ہوس جیسے رجحانات کے واضح شواہد ملے ہیں۔ افریقہ میں مغربی اقوام کی بدعنوانیاں لحاتی غلطیاں، شخصی خامیاں یا انسانی کمزوریوں کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی تھیں بلکہ ان کا وجود طویل المدتی تشکیل شدہ حکمت عملی کی وجہ سے رونما ہوا تھا جس کا مقصد افریقی عوام کو نقصان پہنچا کر افریقہ کی دولت کی

لوٹ مار اور اس تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ افریقہ کے مصائب کی اصل ذمہ داری مغرب اور بڑی حد تک امریکہ کی افریقہ کے ہیرے، تیل، قدرتی گیس اور قیمتی وسائل تک دسترس کی خواہش پر عائد ہوتی ہے۔ مغرب اور بڑی حد تک امریکہ نے ظلم، عدم استحکام اور ضرورت کی حکمت عملی بنائی تھی جس کی بنیاد اخلاقی اقدار پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے افریقہ کی شاندار دولت پر ہاتھ صاف کرنے کی خطرناک خواہش کارفرما تھی۔ مغربی ممالک نے مستحکم افریقی حکومتوں کے خلاف بغاوتوں کو ہوا دی تھی۔ وہ اکثر جائز طور پر منتخب اور قانونی سربراہان کو قتل کرانے اور ان کے عہدوں پر بدعنوان اور نرم خو عہدے داروں کو بٹھانے کی سازشوں میں شریک رہے تھے۔

اگرچہ اقوام متحدہ کانگو میں قتل و غارت گری روکنے میں سنجیدہ تھی۔ ۲۰۰۶ء کی گرمیوں میں دنیا میں اقوام متحدہ کی سب سے بڑی فوج وہاں تعینات کی گئی تھی مگر امریکہ اور دوسرے جی ایٹ (G8) ممالک نے اس میں تعاون نہ کیا تھا۔ ٹائم کے مطابق ''دنیا کانگو کا خون بہنے دینا چاہتی ہے۔ ۲۰۰۰ سے لے کر اب تک اقوام متحدہ نے کانگو میں امن قائم کرنے کے منصوبے پر کئی بلین خرچ کر چکی ہے۔ فروری میں اقوام متحدہ اور کانگو میں کام کرنے والی دیگر امدادی اداروں نے انسانی مد میں خرچ کرنے کیلئے ۶۸۲ ملین ڈالر کا مطالبہ کیا تھا لیکن اب تک انہیں صرف ۹۴ ملین ڈالر ملے ہیں جو عملاً ہر ضرورت مند انسان کیلئے ۴۰ء۹ ڈالر بنتا ہے۔''

تشدد کا سلسلہ صرف سرحدوں تک محدود نہیں ہے۔ کانگو کے پڑوسی سوڈان کا دارفر کا علاقہ بھی ایسی ہی تباہ کن صورتحال سے دوچار ہے۔ بیس سال سے چلنے والی جنگ میں دو ملین ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس علاقے کا سارا دارومدار دنیا کی سب سے قیمتی وسائل تیل پر ہے۔ اگرچہ اصل تنازعہ پرانی مذہبی اور نسلی نفرتوں کی وجہ سے کھڑا ہوا تھا جو ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بے تحاشہ بڑھ گیا تھا اور تشدد کو معاشی تباہ کاروں اور کرائے کے قاتلوں نے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنے کیلئے کی جانے والی کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے استعمال کیا تھا۔ مستقل چلنے والی لڑائیوں اور سماجی ابتری کے باعث انسانی اسمگلنگ کی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ حالیہ برسوں میں تقریباً ڈھائی لاکھ ملین سوڈانیوں کو غلام بنانے کیلئے اغواء کیا گیا تھا۔ بہت سے میرے الیگزینڈریا کے دوستوں ساھی اور سمانتھا کی والدہ کی طرح جنسی کاروبار کیلئے فروخت کئے جاتے تھے۔ مہذب دنیا میں اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حرکتوں کا خاتمہ انیسویں صدی میں ہی ہو گیا تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

سوڈانیوں کی مدد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ ملک دہشت گردوں کی

تربیت گاہ ہے۔سوڈان اسامہ بن لادن کی پناہ گاہ بنا تھا جب ۱۹۹۲ء میں اسے سعودی عرب سے نکال دیا گیا تھا اور اسی لئے اس ملک کو القاعدہ کی جنم بھومی سمجھا جاتا ہے۔ یہ لکھنا میڈیا کیلئے کافی آسان تھا وہ ''شیطان کے محور'' میں حلیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

وسائل کو ہڑپ کرنے کے گرداب میں پھنسے ممالک کی بہترین مثال کانگو اور سوڈان میں جنگ اور غربت نے ایسے نظام کے قیام میں مدد ملی تھی جس کے ذریعے بدعنوان مقامی سیاستدانوں کی مدد سے قدرتی وسائل کے استحصال اور سستے مزدور طبقے کی خدمات حاصل کی جاسکیں۔

ایک اور افریقی ملک جہاں پر نسبتاً کم کڑے حربے استعمال کئے گئے تھے جس کو اپنی آنکھوں سے کینیا اور یوگنڈا میں جینی ولیمس نے دیکھا تھا اور وہ تھا غیر سرکاری تنظیموں کا کردار، کچھ حوالوں سے ان دو امریکیوں کی کہانی جینی کی کہانی سے زیادہ دل لرزا دینے والی ہے جو افریقیوں کی مدد کیلئے تعلیمی مشن میں شامل ہوئے تھے۔اس سے وہ کہانی بےنقاب ہوتی ہے جو کچھ حلقوں کی رائے میں امریکی حکمت عملی تشکیل دینے والے عہدیداران، غیر ملکی حکومتیں، غیر سرکاری ادارے اور بہت بڑی زرعی صنعت کی ملی بھگت تھی۔

باب نمبر:۵۱

سابق امن مشن کے رضا کاروں کی امید افزا باتیں

مالی چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا شمال مغربی افریقہ کا ایک ملک ہے جو ابتداء میں بظاہر کافی بےضرر محسوس ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جو بہت نظر انداز ہوا یہاں تک کہ سلطنت کے معماروں نے بھی اس کو کچھ خاص توجہ نہ دی تھی مگر بظاہر نظر آنے والا یہ روپ گمراہ کن تھا اور اس گمراہ کردینے والی ہیئت میں کارپوریٹوکریسی کی ان حکمت عملیوں کا راز پوشیدہ تھا جو افریقی براعظم کیلئے انتہائی اہمیت کی حامل تھیں۔

مالی نے ۱۹۶۰ء میں فرانس سے آزادی حاصل کی تھی اور اب وہ جمہوریہ کہلاتا ہے۔اس کی ایک تہائی آبادی (بارہ ملین) دارالحکومت باماکو میں آباد ہے۔محنت کش طبقے کا ۸۰ فیصد حصہ زراعت سے وابستہ ہے۔۹۰ فیصد مسلمان آباد ہیں۔۹ فیصد مقامی لوگ یہ اینی مسٹ دیسی جبکہ صرف ایک فیصد آبادی عیسائی ہے۔ یہاں سونے، یورینیم، باکسائٹ اور دیگر معدنی ذخائر موجود ہیں۔ اس کے سابق صدر ایلفا کونارا نے عالمی بینک کے منصوبوں پر عمل کرتے ہوئے ایسے اقدامات کئے تھے جس سے معیشت کی بحالی عمل میں آئی تھی اور اس کی بنیادی وجہ کپاس اور سونے کی پیداوار تھی۔اس نے آئینی ترمیم کرکے تیسری مدت کیلئے اقتدار میں آنے پر پابندی لگادی تھی۔۲۰۰۲ء میں اماڈو تورے ۶۵ فیصد ووٹ لےکر صدر بنا تھا۔

اپنی تقریروں کے دوران جب میں مالی کے متعلق لوگوں کی رائے پوچھتا تھا تو کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا لیکن جب میں ڈوور، ورمونٹ میں لائبریری تعمیر کرنے کیلئے چندہ جمع کرنے کی تقریب سے خطاب کررہا تھا جو نیو انگلینڈ میں میرے گھر کے قرب میں واقع ایک قصبہ ہے تو میری ملاقات ایک نوجوان جوڑے سے ہوئی تھی جو مالی میں رہا کرتے تھے اور انہیں اس ملک کی زمین اور لوگوں سے والہانہ محبت تھی۔اس کے بعد ہونے والی خط وکتابت کے ذریعے میں نے ان کے ساتھ اپنے گھر پر ایک ملاقات کا انتظام کیا تھا۔گریگ اور سنڈی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ نہ صرف کافی متاثر کن تھا بلکہ وہ جدید افریقہ کے تناظر میں دردناک ہونے کے ساتھ ساتھ کافی خوبصورت اور حوصلہ افزا بھی تھا۔انہوں نے اس ملک اور براعظم کیلئے ایک امریکی آواز بلند کی تھی جو زیادہ امریکی شہریوں کیلئے دھندلے خاکوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ان کا مستقبل، اپنے مالی کے

رہنے والے دوستوں اور اپنے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو قریب سے دیکھنا انتہائی روح افزا تھا۔

گریگ فلیٹ کے تعلیمی مشن کی رضا کارانہ تعیناتی کا مالی میں دورانیہ ۱۹۹۹ء-۱۹۹۷ء تک تھا۔ ۲۰۰۰ میں وہ دوبارہ مالی وہاں کے موسیقاروں کے ساتھ مل کر ایک میوزک البم ریکارڈ کرنے آیا تھا۔ اس کے البم ''زوایت موکٹار'' کا ایک گانا ''لاسوس'' مالی کے گانوں کی درجہ بندی میں اوّل نمبر پر آ گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے پورے ملک میں شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ سنڈی ہیل مین ۲۰۰۱-۱۹۹۹ء تک تعلیمی مشن کے رضا کار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہی تھی۔ وہ گریگ اس وقت ملی تھی جب وہ اپنی البم ریکارڈ کرانے آیا تھا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا ''وہ کیسے میری آنکھوں سے بچ سکتا تھا؟ لوگ اسے بہت اچھی طرح پہنچانتے تھے۔ وہ اسے سڑکوں پر روک کر رقص کرتے تھے اور گٹار بجاتے تھے۔ بچے اس کا تعاقب پائیڈ پائپر کی طرح کرتے تھے۔'' گریگ اور سنڈی نے تین سال بعد شادی کر لی تھی۔

انہوں نے تعلیمی مشن میں مختلف ادوار میں لیکن ایک جیسی وجوہات کی وجہ سے شمولیت اختیار کی تھی۔ امریکہ میں ملازمتیں شروع کرنے سے پہلے وہ دونوں دیگر ممالک اور ان کی ثقافتوں کو قریب سے جاننا چاہتے تھے۔ انہیں اس دنیا کے لئے کچھ کرنے کے نظریے نے کافی متاثر کیا تھا جس کا اظہار جان ایف کینیڈی نے تعلیمی مشن کی بنیاد ڈالتے ہوئے اس وقت کیا تھا جب یہ دونوں رضا کار شاید دنیا میں بھی نہیں آئے تھے۔ وہ دونوں اپنی آنے والی نسلوں کو ایک بہترین مستقبل فراہم کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ بہتر مستقبل ہی دنیا کو استحکام بخش سکتا تھا۔

ان دونوں کو زراعت میں کافی گہری دلچسپی تھی۔ سنڈی کی تو پیدائش ہی انڈیانا میں واقع ایک وسیع خاندانی فارم پر ہوئی تھی جبکہ گریگ اپنی والدہ کے باغ کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تعلیمی مشن کا خیال ہمیں اس لئے مناسب محسوس ہوا تھا کیونکہ اس میں ہمیں مالی کے لوگوں کو کھیتی باڑی کی تربیت دینی تھی۔ گریگ نے بھنویں چڑھاتے ہوئے کہا ''ہم اتنے بے وقوف تھے کہ ان کی باتوں میں آ گئے تھے۔''

مجھے اس نوجوان جوڑے سے خاصی اپنائیت محسوس ہوئی تھی ان کے نقطہ نظر سے مجھ پر یہ واضح ہوا تھا اس جدید سلطنت کا اس قدر تیز اور خفیہ انداز میں پھیلاؤ کیسے ممکن ہو سکا تھا۔ سنڈی اور گریگ تعلیمی مشن میں پوری نیک نیتی سے شامل ہوئے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے پاس کچھ ہنر ہے اور امریکی سرکاری ایجنسیوں اور عالمی ادارے جیسے کہ عالمی بینک وغیرہ کے ساتھ مل کر وہ افریقہ کے

حالات بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم ہوا کہ ان کے کردار تو کافی مختلف نوعیت کے ہیں اور انہیں ایک نئی سلطنت کے قیام کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے تا کہ استحصال کی ایک نئی تاریخ رقم کی جا سکے۔ عیاری کے پہلے اشارے اس وقت نمودار ہونا شروع ہوئے تھے جب ان پر یہ واضح ہوا تھا کہ ان کی ذمہ داریاں ان لوگوں کو وہ چیزیں سکھانی تھیں جو انہیں بہتر انداز میں معلوم تھیں۔ گریگ نے بتایا ''ہم جن مالی شہریوں کے ساتھ کام کر رہے تھے وہ خود کسان تھے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ تعلیمی مشن جیسی امریکی ایجنسی کیلئے یہ جال بنا کتنا مشکل ہوا ہوگا کہ چند ناتجربہ کار احمقوں کو وہاں بھیج کر تجربہ کار کسانوں کو زراعت کے متعلق تربیت دینے کی کوشش کرے۔ مالی کے لوگوں کو یہ سن کر کیسا لگتا ہوگا؟

احساس جرم اور پریشانی کے جذبات کے باوجود دونوں اعتراف کرتے تھے کہ انہیں تعلیمی مشن سے کافی فائدہ پہنچا تھا۔ انہیں اس دوران ان کی روایتوں، زبانوں، موسیقی اور وہ چیز سیکھنے کا موقع ملا تھا جو وہ وہاں سکھانے کیلئے بھیجے گئے تھے۔

زراعت سنڈی اور میں نے 2005ء میں ایک دوسرے ادارے جس کا نام بین الاقوامی مراکز برائے مواقعوں کی صنعت کاری (Opportunities Industrialization in Centers Int) ہم اس ادارے کی زرعی خدمات برائے افریقہ پروگرام کے شعبہ میں مشاورتی ماہر کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ یو ایس ایڈ کے پیسے سے چلنے والی یہ تنظیم ایسے امریکی کسانوں کو رضا کارانہ طور پر افریقہ بھیجتی تھی جو اپنا وقت اور ہنر کو افریقہ کے دیہی کسانوں کو جدید اور بہتر زرعی اصولوں سے روشناس کرانے کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔''

سنڈی نے بتایا ''ہم نے سوچا تھا کہ یہ تجربہ تعلیمی مشن سے مختلف ثابت ہوگا کیونکہ اس وقت تک ہم لوگ خود کافی ماہر کسان بن چکے تھے۔ مجھے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور میں مالی سے بھی واقف تھا مگر مجھے یہ جان کر بہت تکلیف ہوئی تھی کہ میں اب بھی اس پرانے طریقہ کار کا حصہ بن گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں مالی کے باشندوں کا حق چھین رہی ہوں جو یہ تمام اصول ہم سے زیادہ بہتر انداز میں سیکھا کر ٹھیک ٹھاک تنخواہیں کما سکتے تھے۔ میری قابلیت ہی کیا تھی؟ انہیں وہاں کی منڈی کا علم تھا اور اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ اس پروگرام نے ہمیں وہاں لے جانے کیلئے بہت پیسہ خرچ کیا تھا اس میں سفر، نقل و حمل، انشورنس اور دیگر روزمرہ کے اخراجات شامل تھے۔ ہم زرعی ماہرین اور مشیر گردانے جاتے تھے مگر میں اس گاؤں میں بیٹھ کر سوچا کرتی تھی کہ نجانے

یہاں کیوں بھیجا گیا تھا اور میں یہاں کیا کر رہی تھی۔ مجھے اس مقام پر لا کر بٹھا دینے پر جتنا پیسہ خرچ کیا گیا تھا اس سے کسی دیہاتی مالی خاندان برسوں تک آرام سے زندگی گزار سکتا تھا۔''

ان کے شکوک وشبہات اس وقت بڑھنے لگے تھے جب وہ ''جینیاتی ترمیم شدہ اقسام'' سے پہنچنے والے مضر اثرات سے واقف ہوئے تھے اور امریکی ایجنسیوں اور بڑے کاروباری اداروں جو ان اجسام کو تیار کیا کرتے تھے وہ بھی اس سازش میں شریک تھے۔ وہ دیہی خاندان جو ان زمینوں پر برسوں سے آباد تھے جو بیجوں کو بچا کر دوبارہ فصلیں اگایا کرتے تھے وہ ان کھادوں، کیڑے مار ادویہ اور غیر ملکی اداروں کی فروخت کردہ بیجوں کے محتاج ہو گئے تھے۔

''ایک شام مقامی لوگوں کے ہجوم نے مجھے الگ اور گریگ کو ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی دعوت دی، ہمارے پہنچنے پر وہ لوگ گاؤں میں ایک ٹیلیویژن سیٹ کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ ٹی وی پر ''جینیاتی ترمیم شدہ اجسام'' کے مخالف منعقد ہونے والی کانفرنس کا اشتہار نشر ہو رہا تھا جس میں مالی کے کسانوں کو ''جینیاتی ترمیم شدہ اجسام'' سے پیدا کی جانے والی فصلوں بالخصوص کپاس کے خلاف مظاہرہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ ہمیں اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہئے۔ ہم دونوں اگلے دن ہی روانہ ہو گئے تھے۔ وہ کافی حیرت انگیز اجتماع تھا جہاں پر جینیاتی ترمیم شدہ اجسام سے پیدا ہونے والی فصلوں، کاٹن کی فصل کیلئے ملنے والی سبسڈی اور افریقی زرعی ورثے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس میں مالی، گنی، برکینیا فاسو، ٹوگو، بینین اور گیمبیا سے آئے بہت سے کسانوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ، سیاستدان اور کارکن شریک ہوئے تھے۔ وہاں پر ہمیں بہت سی ایسی کہانیاں سننے کو ملی تھیں جس کے مطابق شہریت سے محروم کسان غیر متوازن اور ناجائز تجارتی حکمت عملیوں کی وجہ سے مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ وہاں پر جینیاتی ترمیم شدہ اجسام کی وجہ سے مرتب ہونے والے معاشی، ماحولیاتی، ثقافتی اور سیاسی اثرات کے متعلق بھی بہت سی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس دوران اس حقیقت کے متعلق بہت سے مباحثے سننے کو ملتے تھے کہ یو ایس ایڈ اور مونسانٹو مشترکہ طور پر کام کر کے مالی کے آئین کو ازسرنو مرتب کرنا چاہ رہی تھیں۔ یو ایس ایڈ برائے مالی میں کام کرنے والے کسی ملازم سے براہِ راست یہ اطلاع ملی تھی کہ ایک امریکی حکومتی ایجنسی مونسانٹو کے ساتھ مل کر مالی کی آئینی زبان میں یہ ترامیم کرنا چاہتی ہیں جس سے جینیاتی ترمیم شدہ اجسام سے تیار کردہ فصلیں متعارف کرانے، فروخت کرنے اور ان کو تحفظ فراہم کرنے کی اجازت مل سکے۔

سنڈی نے مزید بتایا ''کانفرنس کے دوران ہمیں کپاس پر دی جانے والی امریکی سبسڈی کے مالی کسانوں پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کے متعلق بھی جاننے کا موقع ملا تھا۔ امریکی کسانوں کو مصنوعی کم نرخوں پر کپاس فروخت کرنے کی اجازت دے کر ہماری حکومت افریقی تاجروں کو عالمی منڈی میں نقصان پہنچا رہی تھی۔ افریقی کسانوں کو اکثر اپنی کپاس سال بھر یا اس سے بھی زائد عرصے تک گوداموں میں رکھ کر نہایت کم نرخوں پر فروخت کرنی پڑتی تھی ورنہ وہ ضائع ہو جاتی تھیں۔ حالات کو مزید سنگین بنانے کیلئے ہمارے ماہرین کسانوں کو فوراً خوردنی اجناس کو چھوڑ کر نقد اجناس مثلاً کپاس اگانے کے مشورے دے رہے تھے۔ ہماری فصلوں کو بڑھانے کیلئے کسان بیج، کیڑے مار ادویات، بیمار پودے تلف کرنے کی ادویات، نئے ہل اور بہتر کھادیں قرضوں پر حاصل کر رہے تھے جس کی وجہ سے وہ سی ایم ڈی ٹی کے قرضوں میں جکڑے جا رہے تھے جس کی کپاس کی پیداوار اور فروخت براہ راست اجارہ داری تھی۔ سی ایم ڈی ٹی مالی حکومت اور ایک فرانسیسی کمپنی کے درمیان اشتراک سے عمل میں آئی تھی اور فرانسیسی شراکت داروں کی کمپنی میں ۶۰ فیصد حصص کے مالک تھے۔''

گریگ مسکراتے ہوئے بولا ''امریکی اکیلے ہی نہیں تھے۔ آخر کار فرانسیسی اس کاروبار میں اس وقت ہی شامل ہو گئے تھے جب ہم برطانیہ کا حصہ تھے مگر آج مجھے یہ کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم اس تجارت میں سب سے بڑی قوت ہیں۔ اس کانفرنس میں شریک شرکاء امریکی حکومت اور کثیر ملکی کارپوریشنز کی استحصالی حربوں پر شدید غم وغصے کا اظہار کرتے تھے۔ ہم طیش میں آنے والے قصے اور دل دہلا دینے والی تکالیف محسوس کرتے تھے وہ غصہ وہاں کی فضا میں موجود تھا۔ وہ واقعات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔''

''سنڈی اور میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مالی میں معاشی کارپوریٹ مفادات کی کی مرہون منت تھی۔ ان ترقیاتی اداروں کے چہروں سے ہمدردی جھلکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ایسے امدادی اداروں کی طرح پیش کرتے تھے جو یہاں کے عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے سرگرداں تھے لیکن تشہیری مہموں کے ذریعے ان کے اصل مقاصد پر پردہ ڈالا جاتا تھا جو قدرتی اور انسانی وسائل پر قبضہ اور منڈیوں پر اجارہ داری سے زیادہ کچھ نہ تھے کیونکہ مالی کی معاشی ترقی کارپوریٹ خواہشات سے ممکن ہوئی تھی اس لئے ان کے طریقہ کار میں شفافیت عنقا تھی، ان میں سے اکثر ترقیاتی منصوبے مالی کے عوام نہ تو شروع کئے تھے اور نہ ہی انتظام وغیرہ میں ان کا کوئی کردار تھا۔ ظاہر ہے نتائج تباہ کن تھے۔ مالی کے معاشی اور سماجی صورتحال پہلے سے کہیں زیادہ ابتر تھی۔ مزید یہ کہ ترقیاتی صنعت نے بہترین تنخواہیں حاصل کرنے

کیلئے غیر ملکیوں کا ایک طبقہ تشکیل دے دیا تھا جو عیاشی کی زندگیاں گزارتے تھے اور جن کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہ تھا جن کی مدد کرنے کیلئے وہ یہاں لائے گئے تھے۔"

سنڈی نے مزید بتایا "دوسری طرف امریکا میں ترقی کی جھوٹی کہانی پھل پھول رہی تھی۔ اس کہانی کے ذریعے افریقی عوام اور تیسری دنیا کے لوگوں کو جاہل پسماندہ، بے وقوف اور اپنی زندگیاں سنبھالنے سے قاصر انسانوں کی طرح پیش کیا جاتا ہے اور اس یقین سے ہم میں احساس برتری کا رویہ پروان چڑھتا ہے۔ اس سے ہمارے دلوں میں مقابلے کے رجحان پیدا ہوتے ہیں۔"

گریگ اور سنڈی نے مجھے ایک ایسے ادارے کے قیام کے ارادہ سے آگاہ کیا تھا جو مل جل کر جمہوری انداز میں مالی میں طویل المدتی ترقی کی بنیاد ڈال سکے جس کی توجہ کا مرکز نباتاتی زراعت، اشتراکیت اور انصاف پر مبنی تجارت پر ہوگا مگر یہ وہ صرف اس صورت میں کریں گے جب انہیں یہ یقین ہوگا کہ ایک ایسی اشتراکیت ہوگی جس سے مالی کے لوگوں کے علم اور قابلیت کا کھویا ہوا وقار بحال ہو سکے۔

سنڈی نے زور دیتے ہوئے کہا "یہ تنظیم افریقیوں کو اپنے لوگوں کو تعلیم دینے کیلئے معاوضہ دے گی۔ مالی کی سالانہ اوسط آمدنی لگ بھگ ۴۰۰ ڈالر ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ تعلیمی مشن کے ایک رضا کار کو تربیت دینے، اس کے سفری اخراجات، صحت کے متعلق اخراجات اور وظیفہ دینے میں جتنا خرچہ ہوتا ہے اتنے میں ہم درجن بھر مقامی لوگوں کو ان کے معیار کے مطابق بہترین تنخواہیں دے سکتے ہیں اور اس طرح وہ بہتر خدمت بھی انجام دے پائیں گے۔"

ہم نے اس نظام کو مستحکم کرنے والی اور اس نظام کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والی دونوں طرح کی غیر سرکاری تنظیموں کے درمیان فرق واضح کرنے کی اہمیت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ گریگ نے کہا "عام طور پر مخلص تنظیمیں مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں جو ان کے ملازمین عام طور پر مقامی زبانیں بولتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔"

میں نے ان بہترین غیر سرکاری تنظیموں کی بھی نشاندہی کی تھی جن کا ذکر میں کتاب کے اگلے حصے میں کروں گا جو کارپوریشنز کو اچھے اداروں میں تبدیل کرنے کے کام میں مصروف ہیں اور وہ یہ کام ذیلی قوانین میں ترامیم اور حکمت عملیوں میں تبدیلیاں لا کر کیا کرتی ہیں۔ وہ ساتھ ہی ہم سب کو اپنے طرز زندگی کے مضر اثرات کو اور مثبت اقدامات اٹھانے کی ذمہ داری سے آگاہ کرنے میں مدد کا باعث بنتی ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ بے ایمان غیر سرکاری تنظیمیں سلطنت کی غلام ہیں مگر ذمہ دار غیر سرکاری تنظیمیں ہماری آنے والی نسلوں کیلئے بہتر مستقبل تشکیل دینے کیلئے کوشاں ہیں۔

باب نمبر: ۵۲

تبدیلی لانے کا عزم

افریقہ سے متعلق ہر کہانی دھوکے پر مبنی ہے۔ مصر سے لے کر مالی یا مالی سے لے کر ڈیگو گارسیا تک بہانہ تراشنے اور سچ کو جھٹلانا ہی امریکی سلطنت کی حکمت عملیوں کا خاصہ ہے۔ یہ تاریخ کے چند بدترین رویوں میں سے ایک ہے۔ اس سلطنت نے اتنے لوگوں کو غلام بنایا اور اس کے اقدامات اور حکمت عملیوں سے اتنی اموات ہو چکی ہیں جتنی روم، اسپین، پرتگال، فرانس، برطانیہ اور ہالینڈ کے شاہانہ ادوار میں ہوئی تھیں یا جوزف اسٹالن اور اڈولف ہٹلر جیسے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی تھیں اور پھر بھی اس کے جرائم خوش نما تقریروں کے لبادہ میں چھپ کر لوگوں کی نگاہوں سے بچ جاتے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام اور میڈیا جھوٹ کی اس سازش میں شریک ہیں تو جہاں ایشیا ہمیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی حکمت عملیوں کے شاخسانے پیش کرتا ہے تو لاطینی امریکا جمہوریت کی راہ دکھاتا ہے اور مشرق وسطی یہ بتاتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کسی بھیانک ناکامی سے دوچار ہو چکا ہے تو افریقہ ہمارے لئے سب سے اہم سبق کا درجہ رکھتا ہے۔ مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے اگر آپ امریکہ کی جانب دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے افریقہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ کے گرد ایسے رکھے ہیں جیسے وہ کچھ چیخ چیخ کر کہنا چاہ رہا ہے جہاں پر نائیجیریا کا ڈیلٹا خلیج گنی سے ملتا ہے کہ دیکھ کر احتیاط سے آگے بڑھو اور کوئی قدم اٹھاؤ۔

افریقہ اس کتاب کو ختم کرنے کیلئے ایک نہایت موضوع عنوان ہے جو جدید امریکی سلطنت کی تاریخ سے متعلق ہے تاکہ ہم ساری بدصورتیوں کو بدلنے کیلئے کچھ ٹھوس کام کر سکیں۔ دنیا کے کسی بھی کونے سے زیادہ سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت افریقہ کو ہے۔ وہ اس سونے کی کان میں گانا گانے والی چڑیا کی لاش کی مانند ہے۔

یہ کان ایک ہلاک کر دینے والے پھندے کی طرح ہے۔ ہمیں اس سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا اور ساتھ ہی ہمیں اپنے بچوں کیلئے ایک مستحکم اور پرسکون دنیا میں زندگی گزارنے کیلئے راہیں ہموار کرنی ہیں اور ایسا کرنے کیلئے ہمیں افریقہ کی ہولناک شکایتوں کو غور سے سننا ہوگا۔ یہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اوقیانوس کے پار سے آنے والی اس آواز کو پورے دھیان سے سنیں جو چیخ چیخ کر

کچھ کہنا چاہ رہی ہے جو کچھ یوں ہے:

"تم ایک چھوٹے سے سیارے پر ایک معمولی سی آبادی میں رہتے ہو۔ اپنے بچوں کو بچانے کیلئے تمہیں میری بھی مدد کرنی ہوگی تاکہ میں بھی اپنی اولادوں کو بچا سکوں۔ وہ سب ایک جیسے ہی ہیں ہم سب ایک خاندان ہیں۔"

افریقہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انڈیانا کے کسانوں کو امیر کر کے تمالی کے کسانوں کو افلاس زدہ زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کی حکمت عملی اب مزید نہیں چل پائے گی۔ یہ انڈیانا کے کسانوں کیلئے ایک بار تو موثر ثابت ہو سکتی ہے مگر اب مزید نہیں۔ اس طرح یہی بات اور ہزاروں اشیاء پر لاگو ہوتی ہے جو ہماری پر آسائش زندگی کیلئے لازمی تصور کی جاتی ہیں۔ "قومی مفاد" کے دن ہوا ہو گئے۔ آنے والی نسلوں کی کامیابی "عالمی مفاد" میں پوشیدہ ہے جو پوری انسانی آبادی کا مفاد ہو بلکہ تمام جانداروں کی آبادی کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہم ایک جیسے لوگ ہیں اور یہ زمین ہم سب کیلئے وجود میں آئی ہے اور اس بڑے سے خاندان میں "یوگنڈا کے قصائی" عیدی امین کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی انگولا کا ساومبی، موبوٹو اور کانگو کے کبیلا، اباچا اور نائیجیریا کے اوباسانجو، لائبیریا کے ڈوئی کو اس قدر جگہ دی جا سکتی ہے جتنی کے جرمنی کے ہٹلر کو حاصل ہے اور نہ ہی نائیجیریا میں ضائع ہونے والے تیل کو کیلیفورنیا میں ضائع ہونے والے تیل پر فوقیت دی جا سکتی ہے یا ورجینیا کے باغات میں رہنے والے غلاموں کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوگی جتنی سوڈان کے غلاموں کی اور یہ پیغام آہستہ آہستہ پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں نیویارک کے سب وے نظام میں پورے شہر میں پوسٹر چسپاں تھا۔

افریقہ تمام مسائل کو اکھٹے پیش کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے شرمندہ کر دینے والے استحصال کا آخری معرکہ ہے اور اسے یہ مقام اس لئے حاصل ہوا کیونکہ ہم نے اپنے آپ کو خود فریبی کے نشے میں غرق کر رکھا ہے۔ ہم ٹیلیویژن پر چلتے سستے ہیرے اور سونے کے اشتہارات کا شکار ہو گئے ہیں۔ ہم لیپ ٹاپ اور سیل فون کی گرتی ہوئی قیمتوں کی شیخیاں بگھارتے ہیں۔ ہم گیس اور تیل ضائع کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں جب ان کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ہم نے سونے اور ہیروں کی کانوں کا صفایا کر دیا ہے اور کم سن بچے تیل ضائع ہونے سے پھیلنے والے زہر سے مر رہے ہیں اور ہم مادہ پرستی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ عذاب ایک دن ہمارے بچوں کو منتقل ہو جائے گا۔ انہیں بھی اس

دردناک زندگی سے گزرنا ہوگا، ہماری پھیلائی ہوئی گندگی کو انہیں صاف کرنا پڑے گا۔

افریقہ گلا پھاڑ کر چیخ رہا ہے۔ واقعی تبدیلی کا وقت آ پہنچا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس سے وہ تمام آلات موجود ہیں جو ہماری تعمیر کردہ اس دنیا کو بدلنے کیلئے ضروری ہیں۔ ہم یکجا ہو کر اس عذاب کو ختم کر سکتے ہیں اس سے پھیلی نجاستوں کو صاف کر سکتے ہیں اور یقین مانئے کہ اس زمین کو جو ہمارا گھر ہے بالکل پاک کر سکتے ہیں تاکہ ہم اطمینان سے اسے اپنے بچوں کے حوالے کر سکیں۔

چار بنیادی سوالات

۱۷ اکتوبر ۲۰۰۶ء کو میں اپنے مغربی میساچوسیٹس میں واقع گھر میں الارم کی گھنٹی سے علی الصبح اٹھ گیا۔ مجھے صبح کی پہلی فلائٹ سے رین فاریسٹ ایکشن نیٹ ورک نامی غیر سرکاری تنظیم کو چندہ جمع کرنے کیلئے منعقدہ تقریب میں تقریر کرنے کیلئے سان فرانسیسکو پہنچنا تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے دنیا کی چند بااثر ترین کارپوریشنز کو درخت کاٹنے کی حکمت عملیوں میں تبدیلی لانے کیلئے آمادہ کیا تھا۔ میں بستر سے نکل کر کافی بنانے کیلئے باورچی خانے میں پہنچا۔ میں اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے دور پہاڑوں پر طلوع ہوتے سورج کو دیکھنے لگا۔ نیوانگلینڈ موسم خزاں کی ایک شاندار صبح تھی۔ میں کیتلی چولہے پر رکھ کر اپنی نیند کو جھٹکتا کھانے کے کمرے میں پہنچا اور وہاں بڑی کھڑکی سے حسین پہاڑوں، قرمزی رنگ کی سورج میں خزاں رسیدہ پتوں کو اڑتا دیکھنے لگا۔ یکا یک میری توجہ برف سے اٹی ہوئی چھوٹی پہاڑی پر ہوتی حرکت پر مرکوز ہوگئی۔ جنگلی مرغابیوں کا ایک جھنڈ چٹان کی پشت پر چڑھ رہا تھا۔ وہ تقریباً سو مرغابیاں تھیں ان کے سائے ہچکولے کھاتے آہستہ آہستہ عجیب غیر فطری انداز میں آگے بڑھ رہے تھے جیسے کارٹون فلموں میں قدیم دور کے کارٹون پرندوں کو دکھایا جاتا ہے۔

میں نے کتابوں کے کیس پر رکھی گھڑی میں میں وقت دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ کافی دیر ہوگئی تھی۔ میں فوراً غسل کرنے چلا گیا۔ باہر نکل کر جب میں نے ریڈیو لگانے کی کوشش کی تو میں مقامی این پی آر اسٹیشن پر جا کر رک گیا۔ کافی کی آنچ آہستہ کرتے ہوئے مجھے رین فاریسٹ ایکشن نیٹ ورک میں پڑھے جانے والی تقریر کا خیال آیا۔ میں اس نکتے پر جس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا جو اس تنظیم کے صدر جم گولن اکثر دہرایا کرتے تھے کہ ہمیں ان کارپوریشنز کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے کہ ان کی مخالفت میں کھڑے ہونا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کو مزید دوام بخشنا ہے اور پھر اچانک ریڈیو اناؤنسر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

وہ کہہ رہی تھی ''سو سال سے کم عرصے میں تمام میپل درخت اور خزاں رسیدہ پتے میساچوسیٹس سے غائب ہو جائیں گے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق عالمی حدت میں اضافے کی وجہ

سے ہمارے علاقے کا موسم شمالی کیرولینا جیسا ہو جائے گا۔'' اور پھر اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''تو اس کا مطلب ہے کہ اس سال اس خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہوں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اگلے سال ہم اس حسین نظارے سے محروم ہو جائیں۔''

میں وہیں کھڑا کچھ دیر کھڑکی سے باہر گھورتا رہا۔ باہر پرانا لال رنگ کا میپل درخت ہوا سے جھکا جا رہا تھا اور اس کی شاخیں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہ مانوس آواز کسی بدشگونی کا پتہ دے رہی تھی جیسے موت کی آواز آرہی ہو۔ میں سخت پریشان ہوگیا تھا۔

اگلے دن میں سفر کے دوران مستقل اس ممکنہ حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ نیوانگلینڈ کی خزاں ماضی کا حصہ بن جائے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ خزاں میں گرنے والے پتوں کا خاتمہ ناممکن ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ پھر مجھے پہلی بار ان اسکیموز سے ہمدردی محسوس ہوئی جو آرکٹک کی برف پگھلتے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے تبت میں ملے ہمالیہ کے ان دو خانہ بدوشوں کا خیال آیا جو اپنے گلیشیئرز کے غائب ہونے کے عمل پر شدید افسردہ تھے۔ کئی سالوں سے میں عالمی حدت میں اضافہ کے خیال کو فکری سطح پر قبول کر چکا تھا مگر اس خیال سے کہ خزاں جس کو دیکھتا ہوا میں جوان ہوا تھا اور جو میرے سال کا سب سے پسندیدہ موسم ہے وہ اپنے وجود سے ہاتھ دھونے والا ہے یہ سوچ کر میں بہت غمگین ہوگیا تھا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا کہ ضروری نہیں ہے کہ سائنسی پیشین گوئیاں درست بھی ہوں۔ کم از کم وہ تو ضروری نہیں ہے کہ سچ ہوں جو ہم انسانوں کی پیدا کردہ صورتحال کا براہ راست نتیجہ ہوں۔ ہم انہیں روک سکتے ہیں۔ پھر مجھے کچھ ایسا یاد آیا جو میں اکثر اپنی تقریروں کے دوران کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کو بدلنے کیلئے ہمیں اس کارپوریٹوکریسی کو بدلنا ہوگا، ہمیں ان چند لوگوں کو اس سیارے کی قسمت طے کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے، ہمیں ان کو ان برفانی چوٹیوں، گلیشیئرز، خزاں کے مناظر اور اپنی اولادوں پر حملہ کرنے سے روکنا چاہئے۔

اپنے جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھتے ہوئے میں نے امریکہ کی جانب دیکھا یہ ایک ایسی سرزمین جس کیلئے میری کئی نسلیں انتھک محنت اور قربانیاں دیتی رہی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ایشیاء، مشرق وسطیٰ، لاطینی امریکہ اور افریقہ میں معاشی تباہ کاروں اور کرائے قاتلوں کی کہانیاں صرف کہانیاں ہی ہوں۔ ان کو سن کر فخر، غم، غصہ اور خوشی جیسے جذبات ابھریں لیکن یہ صرف ہمارے ماضی کی کہانیاں ہی بن کر رہ جائیں۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ہم ان سے کچھ سیکھ کر

کچھ اہم تعبیر کریں۔ یا پھر ہمارے لئے ایسے سبق بن جائیں جو ہمیں کچھ ٹھوس اقدام کرنے پر مجبور کریں۔

وہ دن میرے لئے نہایت اہم تھا۔ میں نے اسی دن وہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا تھا جو لوگوں کو متاثر کر کے انہیں دنیا کو بدلنے پر اکسا سکے۔ یہ وہی کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب کے تمام حصوں کو مکمل کر لیا تھا سوائے اس حصے کے جو سب سے اہم حصہ تھا۔ اس ایک حصے سے پہلے میری تمام کوششوں کی راہ میں شک حائل ہو جاتا تھا۔ مجھے یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ میں نے کیا کہنا ہے لیکن اس کا اظہار کس طرح کرنا ہے یہ میرے ذہن میں واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا کرتا تھا کہ تم ان لوگوں کو اس نظام کی تبدیلی پر آمادہ کر سکو گے جو آرام دہ زندگیاں گزار رہے ہیں اور اسی نظام کی وجہ سے وہ ان راحتوں تک پہنچ پائے تھے جبکہ انہیں معاشی تباہ کاروں اور کرائے کے قاتلوں کی موجودگی کا علم ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ اس امن اور خوشحالی کی ہمیں بھاری قیمت ادا کی گئی ہے؟ تم وہ الفاظ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤ گے جو لوگوں میں اتنی قوت بھر دے کہ وہ کارپوریٹوکریسی جیسی طاقت کے سامنے تن جائیں؟ تم کیسے انہیں اس قدر متاثر کر پاؤ گے وہ کارپوریٹوکریسی کو لوگوں کی خواہشات کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیں۔

اس دن جب میں مشرق سے مغربی ساحل کی طرف سفر کرتے ہوئے میں ان مضامین اور مسودوں کا مطالعہ کر رہا تھا جو میں اپنے ساتھ لایا تھا تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ سوال نئے نہیں ہیں۔ ایسے ہی کئی سوالات تاریخ میں ان تمام لوگوں نے پوچھے ہوں گے جو جبر کے خلاف کھڑے ہو کر انصاف کے حصول کی جدوجہد میں شریک رہے ہوں گے۔

اگلے چند دنوں میں میری ان کئی پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور نئی دوستیاں استوار ہوئیں جو رین فاریسٹ ایکشن نیٹ ورک اور اس کی ملحقہ تنظیم کے حامی ہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ان سوالات کے جوابات مزید چار سوالات کے جوابوں میں پنہاں ہیں۔

پہلا سوال جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ ہماری رجائیت پسندی کے متعلق ہے کہ ہم اپنے مقصد کے امکانات کے بارے میں کتنے امید افزا خیالات رکھتے ہیں یا کیا ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم تبدیلی کی امید کر سکیں؟ ہم یہ فرض کر کے چلتے ہیں کہ ہاں ہمارے پاس امید برقرار رکھنے کی تمام وجوہات موجود ہیں تو پھر ہم اگلے سوال کی جانب بڑھتے ہیں۔ اگلا سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم تبدیلی چاہتے ہیں؟ معاشی تباہ کاروں، کرائے کے قاتلوں اور دنیا میں پھیلی پریشانیاں اور

مصائب ہمیں بے چین ضرور کرتے ہیں مگر ہم اس بات کا ثبوت مانگتے ہیں کہ ہماری مشکلات ہماری تبدیلی کی جدوجہد کا مطالبے کے سفر کیلئے کافی ہیں۔ تو تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا اصول ہے جو ہماری تمام جدوجہد کو واجب قرار دے سکے؟ تو پھر ہمیں یہ یقینی بنانا ہوگا کہ ہم صرف اپنی ذاتی پسند ناپسند کی بناء پر اخلاقی، مذہبی یا فکری اقدار کسی پر مسلط نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہمارا مقصد کچھ ایسا وجود میں لانا ہے جو سچ پر مبنی ہو اور اس کائنات کیلئے دیرپا فائدے کا باعث بن سکیں اور آخری سوال کہ ہم سب اس کو ممکن بنانے کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟ مجھے اور آپ ہم سب کو اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کیلئے اپنی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا جائزہ لینا ہے۔ ہمارے طریقے اور خواہشات کیا ہوں گے اور وہ اس عظیم مقصد کے حصول کیلئے کس طرح کارآمد ہو سکتی ہیں؟

اگلے کچھ ابواب میں ہم ان سوالات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ ہم ان جوابات کی تلاش میں اہم تاریخی اور حالیہ دونوں تناظر میں زمینی حقائق کو بنیاد بنا کر ان سوالات کے جوابات کی تلاش کریں گے۔ ہم ان مردوں اور عورتوں سے تبادلہ خیال کریں گے جو اپنے کئی سوالات کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں ہیں یا ان میں سے کچھ کو جواب مل گئے ہیں اور اب ان جوابات کی روشنی میں ایسے اقدامات اٹھا رہے ہیں جو ہم سب کو اپنے فیصلوں کو مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم ماضی میں اپنائی گئی موثر تحریکوں پر نظر ڈالیں گے اور ان پر بھی ہماری نگاہ رہے گی جو آج کل کی دنیا میں کافی بارآور ثابت ہو رہی ہیں۔ موجودہ حالات میں فکری پہلو بھی بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اور ساتھ ہی اپنے کئے گئے اقدامات کی اخلاقی اثرات کو بھی ٹٹولنا ہوگا لیکن یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم اپنے رویوں میں عاجزی، انکساری پیدا کریں تاکہ ہم زیادہ دیرپا اور ٹھوس نتائج حاصل کر سکیں۔

باب نمبر: ۵۴

تبدیلی ممکن ہے

ہمیں اس خیال پر یقین رکھنا ہوگا کہ تبدیلی ممکن ہے تا کہ ہم ایسے مقاصد طے کریں جن کے حصول کیلئے عمل کیا جا سکے اور خطرات کا سامنا کیا جا سکے۔ کیا ہمارے پاس خوش امیدی کی وجوہات موجود ہیں؟

میں نے ان صفحات میں امریکی انقلاب کا کئی بار تذکرہ کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی موازنہ ہرگز نہیں ہے۔ ہم آج جس صورتحال سے دوچار ہیں جہاں ہم کارپوریٹوکریسی کے گمراہ کن ہاتھ کے زیر اثر زندگیاں گزار رہے ہیں یا ابتدائی دور میں امریکہ میں آ کر آباد ہونے والے لوگوں کی جدوجہد میں بہت سے عوامل مشترک ہیں۔ اس وقت کی طرح آج بھی کارپوریٹوکریسی کے رویے میں تبدیلی لانے کی ایک خواہش زور پکڑ رہی ہے مگر امریکی انقلاب اس وقت برپا نہیں ہوا تھا جب تک زیر تسلط آبادیوں کو یہ یقین نہیں ہو گیا تھا کہ کامیابی ممکن ہے۔

برطانوی غلاموں نے ۱۷۵۵ء میں فرانسیسیوں اور ریڈ انڈین کے مابین جنگ مونو نگاہیلا (درندہ صفت) جنگ کے دوران یہ سوچا تھا کہ سلطنت کمزور پڑ رہی ہے۔ جارج واشنگٹن جو اس وقت برطانوی جنرل ایڈورڈ براڈوک کے ماتحت تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے برطانوی تاریخ کی سب سے بھیانک شکست دیکھی تھی اور اس کا ان پر گہرا اثر پڑا تھا۔ براڈوک قتل ہو گیا تھا اور واشنگٹن ہیرو بن کر ابھرے تھے اور نو آبادیاتی علاقوں میں اپنے مقامی رہنمائی کیلئے بے پناہ عزت بڑھ گئی تھی اور ساتھ ہی اس فوج کا دبدبہ جاتا رہا تھا جو اس سے پہلے ناقابل شکست تصور کی جاتی تھی لیکن برطانیہ کے وفادار ٹوریوں کے علاوہ بہت سے امریکیوں نے بھی کوئی فیصلہ لینے سے احتراز کیا تھا۔

پھر انقلاب کے دوران ۱۷۷۵ء میں جنگ بنکر ہل میں امریکیوں نے برطانوی فوج کو گھمسان کی جنگ کے بعد شکست دے دی تھی کیونکہ امریکی فوج کا اسلحہ ختم ہو گیا تھا اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانوی فوج نے فتح کا اعلان کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود آدھی برطانوی فوج یا تو ہلاک ہو گئی تھی یا زخموں سے چور تھی۔ اس صورتحال نے نو آبادیاتی علاقوں کو کافی اعتماد بخشا تھا۔

۱۷۷۶ء میں کرسمس کی رات کے موقع پر جنرل واشنگٹن جب ڈیلاویئر عبور کر رہے تھے اور اس دن ہی اس کے مشہور ہیسین جنگجوؤں کو ٹرینٹن کے مقام پر شکست فاش ہوئی تھی تو تقریباً آٹھ ہزار نوجوان کانٹی نینٹل فوج کا حصہ بن گئے تھے۔ ایک سال سے کم عرصے میں سارا ٹوگا کے میدان میں نو آبادکاروں کی فتح نے امریکی برتری ثبت کر دی تھی اور برطانوی حکومت کو بھی یہ سمجھ آ گیا تھا کہ اب ان سے اپنے مفادات کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا اگر وہ اس تبدیلی کو دل سے مان لیں۔ وہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا جس نے فرانسیسیوں کو امریکیوں کا حلیف بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری ذاتی مونو نگاہیلا جنگ نوے کی دہائی کے اوائل اور نئے ہزاریے کے ابتدائی سالوں کے دوران شروع ہوئی تھی جب میں ایمیزون میں ''ڈریم چینج'' کی وجہ سے بہت سے دوروں پر آنا جانا ہوتا رہا تھا۔ ہر بار جب میں جنگل پہنچا تو مجھے تباہی کے نئے آثار دیکھنے کو ملے تھے۔ مجھے ہر بار وہ شوار یاد دلایا کرتا تھا کہ ان کارروائیوں کا مستقبل میں کیا اثر پڑے گا اس کا شعور بہت کم پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ وہ اس کی طرف بھی توجہ مبذول کرایا کرتے تھے کہ کارپوریٹوکریسی کو شکست دی جا سکتی ہے بالکل ان برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کی طرح جو انڈین جنگ میں مضبوط قوت تصور کئے جاتے تھے۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا تھا کہ تبدیلی صرف خواہش ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہماری نسل کی بقاء کیلئے لازمی ہے۔

ہمیں تاریخ سے یہ سیکھنے کو ملتا ہے کہ تباہ حال سلطنتوں کی صورت میں افراتفری برپا ہوتی ہے، جنگیں شروع ہو جاتی ہیں اور پھر ایک نئی سلطنت ابھرتی ہے۔ جدید دور کے تناظر میں افراتفری اور جنگوں کی صورت میں انسانی زندگی فنا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ میری سمجھ میں آنے کیلئے جنوبی امریکی جنگلات کارآمد ثابت ہوئے تھے۔ میں یہ سوچ کر واپس آ گیا تھا کہ ہمیں اس کا متبادل تلاش کرنے کی ضرورت ہے مگر پھر میں نے سوچا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے؟ دراصل مجھے ثبوت کی ضرورت تھی۔

ایمیزون کے دوروں کے ساتھ ہی میں مختلف ورکشاپس میں اعلیٰ افسران کو مختلف مسائل کے حل نکالنے کیلئے تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال کے موضوع پر ایک کورس پڑھایا کرتا تھا۔ میرے زیادہ تر طالب علم دنیا کی چند طاقتور ترین اداروں جیسے ایکسون، جنرل موٹرز، فورڈ، ہارلے ڈیوڈسن، شیل، نائیکی، ہیولیٹ پیکارڈ اور عالمی بینک کے ملازمین شامل تھے۔

اس وقت بہت سی ایسی فلمیں اور کتابیں مشہور تھیں جو اس موضوع پر مبنی تھیں کہ آئین کی

چودھویں ترمیم کے مطابق کارپوریشنز کو ایسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے کسی زندہ جیتے جاگتے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس تصور کو اس وقت قانون کا حصہ بنایا گیا تھا جب ۱۸۸۶ء میں سپریم کورٹ نے سانٹا کلارا کاؤنٹی اور سدرن پیسیفک ریل روڈ کمپنی کے مابین تنازعہ کے دوران اس کے حق میں فیصلہ دیا تھا اور اس وقت سے یہ قانون کا حصہ ہے۔ میں ان اعلیٰ افسران کو یہ بات واضح کرتا تھا کہ کارپوریشن کو بھی لازم ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھیں جو ایک انسان پر عائد ہوتی ہیں۔ اس کو بھی ایک اچھا شہری بن کر رہنا چاہئے جیسے کہ ایک معزز، قابل احترام، اخلاقی قدروں کا خیال رکھنے والے رکن کسی معاشرے میں زندگی گزارتا ہے جبکہ بین الاقوامی کارپوریشنز کے سلسلے میں پوری دنیا اس کا معاشرہ بن جاتی ہے۔

جبکہ دراصل کارپوریشنز اچھے شہریوں کے رویے کے برعکس ایسا طرز عمل اختیار کرتی ہیں۔ وہ سیاستدانوں کو رشوتیں دے کر ایسے قوانین تشکیل دیتے ہیں جو معاشرہ کو بڑے پیمانے پر دھوکے دینے کا باعث بنیں۔ بالخصوص وہ ان کارپوریشنز کو وہ اخراجات ادا کرنے سے بچنے کی اجازت دیتی ہیں جو ان کے کاروباری کارروائیوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ماہرین معاشیات جسے ''خارجی عوامل'' کہتے ہیں وہ نرخ مقرر کرنے کی معاشی اور سماجی نقصانات، ماحولیاتی آلودگی، معاشرے پر مزدوروں کے بیمار پڑنے اور زخمی ہونے والے مریضوں پر خرچ ہونے والی رقوم، نقصان دہ اشیاء بنانے کی اجازت دینے کیلئے اداروں کو نامعلوم رقوم کی منتقلی، سمندروں اور دریاؤں میں پھینکے جانے والی گندگی، مزدوروں کو معقول تنخواہوں کا ادا کرنا، کام کرنے کی جگہ غیر معیاری ماحول کی فراہمی اور سرکاری زمینوں سے نسبتاً کم نرخوں پر قدرتی وسائل کشید کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ مزید یہ کہ اکثر یتی کارپوریشنز حکومتی سبسڈی، مستثنیات، عالیشان تشہیری اور عوامی رائے ہموار کرنے کی مہمات اور پیچیدہ نقل و حمل اور مواصلاتی نظام کی محتاج ہیں جو ٹیکس ادا کرنے والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے ان کے عہدیداران کم تنخواہیں وصول کرتے ہیں اس کے علاوہ دوسری سہولیات جیسے ریٹائرمنٹ کے منصوبے جو ٹیکس کٹوتیوں کی مد میں ڈال کر ختم کر دیا جاتا ہے۔

کسی بھی باضابطہ نظام میں یہ تمام خارجی عوامل کی صورت میں اشیاء کی قیمتوں میں شامل کئے جاتے ہیں۔ وہ اشیاء اور خدمات جو اس طرح کے نقصانات کے دور کر کے تیار کی جاتی ہیں وہ یقیناً سستی ہوتی ہیں البتہ صارفین ان اشیاء پر اضافی رقم ادا کرتے ہیں جن کی تیاری میں ماحول اور معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ اس قیمت میں ان نقصانات کی تلافی کا خرچہ

بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ کسی بھی صحیح معنوں میں آزاد منڈی کی معیشت میں اس طرح کے اخراجات خود اشیاء تیار کرنے والے کو ادا کرنا چاہئے مگر ایسا ہوتا نہیں ہے کیوں؟ کیونکہ حساب کتاب کرنے والی کمپنیاں مناسب اور معقول قوانین کو نظرانداز کرتے ہیں انہیں صرف ان قوانین کا احترام کرنا پڑتا ہے جو قانون کا حصہ ہیں جنہیں ان سیاسدانوں نے تشکیل دیا ہے جو کارپریٹوکریسی کے محتاج ہیں۔

جدید کارپوریشنز کو کسی بھی زندہ شخص جیسے حقوق حاصل ہیں لیکن ذمہ داریاں نبھانے کے پابند نہیں ہیں بلکہ انہیں ڈاکہ ڈالنے کی قانونی اجازت ہوتی ہے۔ اس معاشی نقطہ نظر کو اور کسی بھی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ غریبوں اور مستقبل کی نسلوں کو لوٹتی ہیں تاکہ وہ امیر کو مزید امیر بنا سکیں۔

جب میں ورک شاپس منعقد کرایا کرتا تھا اور ان خیالات کے بارے میں سوچا کرتا تھا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ ماننا کہ ہمیں اچھی کارپوریشنز کے طرز عمل میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے لیکن یہ بالکل مختلف بات ہے کہ لوگوں کو اس بات کیلئے تیار کیا جائے کہ وہ اس تبدیلی کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ جدید دنیا میں سارا ٹوگا، بنکر ہل اور ٹرینوں کی برابری کن سے کی جاسکتی ہے؟ وہ کون سے ایسے عوامل ہیں جن سے ہمیں ہمت حاصل ہوسکتی ہے؟

مجھے ان سوالات کے جواب مختلف رسالوں میں شائع شدہ ان مضامین میں ملا تھا جو میں اکتوبر کے اس حسین دن سان فرانسیسکو کی فلائٹ پر مطالعہ کیلئے لے کر پڑھا تھا۔ جس دن مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ نیوانگلینڈ کی خزاں رسیدہ پتے اپنے اختتام کے قریب ہیں وہ بہت ساری وجوہات کی وجہ سے کافی اہم دن تھا۔

باب نمبر: ۵۵

ہردم تیار فوجی

''ماحولیاتی جنگجو''

''کونکرڈیل پر پڑے منٹ مین'' کونکرڈ پر پڑے سریع الحرکت فوجی

''ہرے چھاپہ مار'' جنگل کے ماہر چھاپہ مار

یہ تمام اصطلاحات رین فاریسٹ ایکشن نیٹ ورک کی غیرسرکاری تنظیم کیلئے استعمال کی جاتی تھیں جہاں میں تقریر کرنے جارہا تھا اگرچہ رین نامی یہ تنظیم انقطاع کے خطرے سے دوچار جنگلات کو محفوظ رکھنے کے کام کیلئے وجہ شہرت رکھتی تھی لیکن فلائٹ کے دوران میں نے جن مضامین کا مطالعہ کیا تھا۔انہیں پڑھ کر مجھے کچھ ایسا یاد آ گیا تھا جس پر میں نے پانچ سال پہلے غور کیا تھا لیکن بعد میں فراموش کر بیٹھا تھا۔ان مضامین میں یہ بتایا گیا تھا کہ رین کی مثال کچھ اور بڑے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کی جاتی تھی۔رسالوں میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے ان میں کارپوریٹ حلقوں میں آسمانی کتابوں کا درجہ رکھنے والا رسالہ ''فورچیون'' سے لے کر ''ٹرائی سائیکل، دی بدھسٹ ریویو'' جیسے نامور مطبوعات شامل تھیں۔ان میں تفصیل سے یہ بتایا گیا تھا کہ رضاکارانہ اظہار رائے کی آزادی کو سول نافرمانی کی تحریکوں، سڑکوں پر لگائے جانے والے تھیٹرز اور پرامن احتجاج کے ذریعے استعمال کرتے ہیں۔رین کے کارکن کارپوریشنز کے سربراہی دفاتر کے باہر احتجاجی پلے کارڈ لے کر پہنچ جاتے ہیں اور ان اداروں کی قد آدم دفاتر پر اوپر سے نیچے تک بینرز لگا دیتے ہیں جن پر ان اداروں کی جانب سے کی جانے والی قانونی خلاف ورزیوں کی تفصیل درج ہوتی ہے۔وہ اخبارات میں پورے پورے صفحے کے اشتہارات چھپواتے ہیں اور مدیران کو خطوط تحریر کرتے تھے لیکن وہ جائیداد اور عوامی جان کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے سے اجتناب برتتے ہیں اور وہ ان اداروں کے عہدیداران کو ایسی حکمت عملیاں تشکیل دینے میں مدد دیتے تھے جس سے اس معاملے کے تمام فریقین کو اطمینان حاصل ہو سکے۔ان کامیابیوں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہم عوام ان کارپوریشنز کو تبدیلی پر مجبور کر سکتے ہیں۔رین نے عملاً یہ ثابت کر دکھایا تا کہ ہم مل کر بڑی سے بڑی طاقت کے ارادے کو جھکا سکتے ہیں۔اس تبدیلی سے ہی کارپوریشنز کے مفادات کو بھی

نقصان نہیں پہنچتا اور معاشرہ بھی کثیر فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

ان مضامین نے میرے ذہن میں ۱۹۹۰ء کی دہائی کے دوران رین کی اس مہم کی یاد تازہ کر دی تھی جس نے مٹسوبشی جیسی کارپوریٹ ادارے کے ارکان کو اپنی حکمت عملیوں سے اس تبدیلی کیلئے رضامند کر دیا تھا جو اس وقت دنیا کے گرم علاقوں کے جنگلات کی سب سے تباہ کن دشمن سمجھی جاتی تھی۔جب مٹسوبشی کے عہدیداران نے رین کی ابتدائی تجاویز کو رد کرتے ہوئے مذاکرات سے صاف انکار کر دیا تھا تو انہوں نے فرداً فرداً ملاقات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔مٹسوبشی کے افسران کو رین کے بانی اور ایگزیکٹو ڈائریکٹر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔یہ ملاقاتیں کان کشیدہ اور ذاتی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔

لیکن آخر میں رین کو فتح حاصل ہوئی تھی۔۱۲ نومبر ۱۹۹۷ء کو مٹسوبشی کی گاڑیوں کی فروخت کا ادارہ جو امریکا کیلئے مختص تھا اور مٹسوبشی الیکٹرک امریکا نے رین کے ساتھ ایک تاریخی معاہدے پر دستخط کئے جس میں ان کی طرف سے اس عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اداروں کو ماحولیاتی تحفظ اور سماجی ذمہ داری کا پابند بنائیں گے ساتھ ہی اس عزم کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے چودہ خصوصی اقدام متعارف کرائے تھے۔

اس معاہدے کے طے پانے کے کچھ مہینے بعد میں نے کیلی فورنیا کے ساحلی علاقے میں ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔اس میں مجھے رین کے بانی اور ایگزیکٹو ڈائریکٹر رینڈی ہیس کی بات چیت سننے کو ملی تھی جو اس اجتماع کے ۳۶ شرکاء میں سے ایک تھے۔میں اس شخص سے ملنے کیلئے بے تاب تھا جس نے اس مشکل کام کو ہاتھ میں لیا تھا اور وہ جیت بھی رہا تھا۔میرے خیال میں وہ جدید دور کا ہیرو تھا جو ٹام پینی، ہیریٹ ٹبمین، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر، سیسر، شاویز راشیل کارسن جیسے لوگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنے اور اس دنیا کی طرف رویے میں تبدیلی لانے پر مجبور کر رہے تھے۔

کانفرنس کا یہ مرکز بحیرہ سے اوپر پہاڑیوں میں واقع تھا۔میں نے وہاں مزید ایک ہفتہ رکنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن میں نے شرکاء کیلئے مختص کمروں میں ٹھہرنے کی بجائے خیمے میں رہنے کا ارادہ کیا تھا۔میں نے اپنا خیمہ صنوبر کے درختوں کے جھنڈ کے ذرا اوپر ایک ڈھلان پر لگایا تھا جو چٹان کی چوٹی سے جڑی ہوئی تھی اور وہاں سے سمندر صاف نظر آتا تھا۔اگرچہ مجھے ڈھلان پر سونا پڑ رہا تھا مگر میں وہاں سے کھڑکی کے ذریعے ناہموار ساحل کے خوبصورت منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ [illegible] رات

بہت خوبصورت اور مطلع صاف تھا اس لئے میں نے مزید جھنجھٹ نہیں پالی تھی۔ خیمہ جلد ہی نصب ہوگیا تھا میں ڈوبتے سورج کو دیکھنے نہیں گیا تھا۔ صنوبر کی درختوں سے اٹھتی خوشبو میں سمندر کی فضا سے مل رہی تھی جو کافی مسحور کن احساس پیدا کر رہی تھی۔

اچانک میں اٹھ بیٹھا اور اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے کیلئے سو گیا تھا۔ میں بمشکل اٹھ کر نیچے استقبالیہ تک پہنچا، میں اس خوبصورت دیہاتی ماحول کو چھوڑ کر اس دعوت میں صرف رین کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر سے ملنے کی بے تابی کی وجہ سے آیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ رینڈی کا بدترین دشمن مٹسوبشی کا ایک عہدیدار بھی اسی دعوت میں شرکت کیلئے آ رہا تھا۔

میں رینڈی کی تصویریں اخبارات میں دیکھ چکا تھا اس لئے فوراً اسے پہچان گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرا کر اس کی خدمات کی تعریف کی اور اس کی حالیہ کامیابی پر مبارکباد دی۔ ہم لوگ میرے آمیز دن میں گزرے وقت کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔ پھر اس نے دروازے کی جانب دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے وہ اس شخص کی جانب بڑھا جو ابھی ابھی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔ ان لوگوں نے مصافحہ کرکے کچھ بات کی اور پھر ہم تمام لوگ کانفرنس کے باضابطہ آغاز کیلئے نشستوں پر بیٹھ گئے میرے برابر والی نشست پر بیٹھی خاتون نے مجھے بتایا کہ جو شخص ابھی وارد ہوا ہے جو مٹسوبشی کا ڈائریکٹر ہے۔
اس پہلی ملاقات کے بعد وہ اور رینڈی مستقل ایک دوسرے کو نظرانداز کر رہے تھے۔ اگلا دن ملاقاتوں سے بھرپور دن تھا۔ رات کے کھانے کے دوران میں نے رینڈی کو بیئر پینے کی دعوت دی جہاں پر ہم اپنے پچھلے دن کی بات چیت جاری رکھ سکیں۔ ہم بحر پیسیفک کے اوپری چٹان پر پہنچ گئے اور تنگ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ بیٹھنے کی جگہ پر ہم ایک شخص کو پہلے سے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مٹسوبشی کا عہدیدار بھی ہمیں دیکھ کر اتنا ہی حیران رہ گیا تھا۔ اس نے جلد اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور کہنے لگا ''کیا خوبصورت غروب آفتاب ہے آئیے میرے ساتھ بیٹھیے۔''

ہم لوگ قدرے پریشان ہوگئے تھے۔ میں ان دو سخت جان مریضوں کے درمیان تن تنہا پھنس چکا تھا۔ ہم دوپہر کے واقعات پر بات کرتے ہوئے کانفرنس میں زیر بحث معاملات پر تبادلہ خیال کیا اور دیگر شرکاء جن میں سے کچھ مشترک دوست بھی تھے کہ بارے میں بھی رائے زنی کی۔ ہم لوگوں نے جان بوجھ کر حالیہ تنازعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔

سورج سمندر میں غروب ہو چکا تھا۔ سورج گلابی سے جامنی ہوتا جا رہا تھا۔ ہم لوگوں نے بیئر کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میں اور رینڈی ایک ہی کین سے پی رہی تھی جبکہ وہ اپنے کین سے پینا ہی بہتر سمجھ رہا تھا اور پھر وہ مخاطب ہوا ''رینڈی میں نے تمہیں کچھ اہم بات کہنی ہے۔''
رینڈی میری طرف دیکھنے لگا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میری طرح اس کو بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن مٹسوبشی کا ڈائریکٹر پھر مخاطب ہوا ''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اور مٹسوبشی کے کئی دیگر عہدیداران کمپنی کی حکمت عملیوں کو تبدیل کرنے کا کہہ چکے تھے۔ یہ تجاویز رین کے منظر عام پر آنے سے پہلے گردش کر رہی تھیں مگر ہمیں اپنے مالکان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیں اپنی ملازمتوں کا ڈر تھا۔ تمہارے مظاہرین اور اشتہارات نے مسئلہ واضح کر دیا تھا۔ وہ کافی مشکل کام تھا لیکن تم لوگوں نے اپنی ہمت سے اسے صرف موجودہ حصص مالکان تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ حصص مالکان کے بچوں اور اپنے بچوں کی خریداری بھی اس میں شامل رین نے ہمیں ایک موقع فراہم کیا تھا۔ ہم نے اپنی کمپنی اور خود کو صحیح راستے اختیار کرنے کیلئے رضامند کیا تھا۔'' اور پھر اس نے رینڈی کی طرف جھکتے ہوئے کہا ''شکریہ''

اسی رات پیسیفک سے ایک طوفان اٹھا تھا میں نیند سے بیدار ہوا تو بارش میرے خیمے پر برس رہی تھی اور میں شام کے واقعات کے متعلق غور کرنے لگا۔ مٹسوبشی کے عہدیدار کے الفاظ کافی حوصلہ افزا تھے۔ معاشی تباہ کار کی ملازمت کے دنوں کی طرح جیسے مجھے احساس ہوا تھا وہ اور اس کے ساتھی عہدیداران کو بھی سمجھ آ گیا تھا کہ اس دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کیلئے کیا کرنا ہوگا مگر وہ ایک ایسے نظام میں پھنس گئے تھے جو اپنے اپنے ضمیر کی آواز سننے سے روکتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ کسی طرح میں بھی اپنے کئے گئے غلط فیصلوں پر دل میں کڑھا کرتا تھا مگر چیزوں کی کشش مجھے اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ بڑے بڑے بزنس اسکولز، بین الاقوامی تنظیمیں اور نامور ماہرین معاشیات ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر تعمیر کئے گئے بنیادی سہولیات کے منصوبے ترقی کی کنجی ہیں جو غربت ختم کرنے کا واحد راستہ ہیں۔ مجھے اس نظریے پر عمل کرنے کیلئے تعریفی کلمات سے نوازا جاتا تھا۔ مجھے ترقیاں دی گئیں، تنخواہیں بڑھائی گئیں، میرے نیچے ماتحتوں کی ایک پوری فوج تھی، طاقت کا نشہ، جنسی سرگرمیاں، بہترین اداروں کے حصص میں اشتراک، ہر طرح کا مالی تحفظ اور وہ تمام چیزیں میرے قدموں میں ڈال دی گئی تھیں جو ہمارے معاشرے میں ترقی کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں۔ مجھے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں

میں خطاب کرنے کیلئے بلایا جاتا تھا اور سربراہان مملکت کے ساتھ ضیافتوں کیلئے مدعو کیا جاتا تھا۔

مٹسوبشی کے عہدیدار کو بھی ایسے ہی لالچوں کا سامنا تھا اور اس کے ساتھیوں کو بھی ایسی ہی دلکش، ترغیبات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی ملازمتوں کا ایک ہی مقصد تھا، زیادہ سے زیادہ منافع کمانا، ان کی ترقیاں، فوائد بچوں کی صحت کے اخراجات سب سہ ماہی شرح منافع پر ٹکی ہوئی تھیں۔

انہیں دنیا کو شراب کے رنگ میں ڈوبے شیشے سے دیکھنے کی تربیت ملی تھی اور پھر رین (Ran) نمودار ہوا۔

ہوا ایک دم زور پکڑ گئی تھی۔ میرا خیمہ اڑا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قدرت بھی چیزوں کو صحیح قرینے سے سجانا چاہ رہی ہو۔ مجھے آنڈین شامین کے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ ''اس دنیا کو تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دنیا خطرے میں نہیں ہے لیکن ہاں ہم انسان ضرور خطرے میں ہیں۔ اگر ہم نے اپنے طور طریقے نہیں تبدیل کئے تو یہ زمین ہمیں مکھیوں کی طرح جھٹک کر اڑا دے گی۔'' اور اب لگ رہا تھا وہ جھٹکا دیا جا رہا ہے۔ یہ رات اسی جھٹکے کی علامت محسوس ہوئی تھی۔ یہ جھٹکے ہمیں اکثر سیلابوں، خشک سالیوں، جان لیوا وبائی امراض اور پگھلتے برفانی گلیشیئرز کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

اور پھر اچانک ایک زوردار آواز سنائی دی۔ پانی میرے خیمے تک آ گیا تھا۔ میرے خیمے کی رسی ڈھیلی ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے اوپر بے تحاشہ غصہ آنے لگا کہ میں نے خیمہ تانتے ہوئے باریکیوں کا خیال کیوں نہ رکھا۔ میں جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹنے لگا بڑی مشکل سے ٹارچ ڈھونڈ کر اس طوفانی بارش میں اس گھر میں گھس گیا جہاں وہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

مجھے ایک صوفے پر ایک کمبل اور تکیہ دیکھ کر تھوڑا اطمینان ہوا جیسے کسی نے میرے لئے وہ وہاں رکھ چھوڑے تھے۔ میں نے پانی سے بھیگے جوتے اتار کر سونے کی کوشش کرنے لگا پانی چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز میں مجھے نیند آ گئی تھی۔

باب نمبر: ۵٦

افسانوی داستان کو بدلنا

میں صبح جلدی اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دور دور تک بادل کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ شاندار موسم کے باوجود مجھے بیزاری کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ امیزون کے جنگلات میں خیمہ تاننے میں اس بری طرح ناکام ہو گیا تھا۔ میں اپنے کیلئے کپڑے بدل کر دروازہ سے باہر آ گیا تھا۔ جب میں دوبارہ اس میدان کی طرف بڑھا تو مستقل ہوا سے فضا ٹھنڈی ہو چکی تھی جو رات کے طوفان کا پتہ دیتی تھی۔ جب میں اپنی عارضی قیام گاہ تک پہنچا تھا تو میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ خیمہ بھی غائب ہو چکا تھا۔

میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ شاید میں نے انجانے میں غلط موڑ لے لیا ہو لیکن ہرے بھرے میدان کے بیچ پیلی رنگ کی گھاس کچھ اور اشارہ کر رہی تھی۔ شاید کوئی اور اس خیمے کو اتار کر لے گیا ہو گا۔ مگر کون؟ اور کیوں؟ میری نظریں دور ساحل پر جم گئیں۔ طوفان کی وجہ سے بہت بڑی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ چند پر جوش تیراک اس میں بھی غوطہ زن تھے۔ پھر میں نے صنوبر کے درختوں میں چٹان کے پاس کچھ دیکھا۔ وہ مجھے خیمے سے ملتی جلتی چیز لگ رہی تھی۔

میں سرپٹ دوڑا۔ خلاف توقع خیمہ بھی سالم تھا اور اپنے کھانچے سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے کھینچ نکالا۔ ایک جگہ سے اس کی المونیم کی سلاخ مڑ گئی تھی اور اس پر کچھ مٹی لگ گئی تھی مگر تمام تر آوارہ گردی کے باوجود وہ کافی بہتر حالت میں تھا۔ میں اسے دوبارہ لگانے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ اس بار میں نے زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا خصوصاً رسیاں باندھنے میں زیادہ احتیاط برتی تھی۔ میں واپس گھر کے اندر پہنچا اور بالٹی لے کر باہر واپس آیا۔ اس دوران شکر کہ کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ میں نے بالٹی کو پانی سے بھرا، خیمے کے پاس لے کر پہنچا اور مٹی صاف کرنے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں چٹان کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ بارش کی وجہ سے صنوبر کے درختوں کی خوشبو کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ میں لکڑی سے بنے بینچ پر بیٹھ گیا۔ میں سورج کی طرف پیٹھ کر کے سمندر کی جانب منہ کر کے بیٹھ گیا اور اپنی خطاؤں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے خیمہ اکانے سے

بنیادی اصول کونظر انداز کر دیا تھا۔ہمیں ہمیشہ بدترین حالات کیلئے تیار رہنا چاہئے جیسے کہ کل رات کا طوفان، معاشی تباہ کار کی حیثیت سے بھی میں نے اپنی ملازمت کے پس پردہ حقائق کو اتنی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ میں دنیا کو ایک محفوظ، باشعور اور زیادہ ہمدرد جگہ بنانے کی بجائے ایک ایسی سلطنت کی تعمیر میں لگا رہا تھا جو غربت سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے بجائے کارپریٹوکریسی کے حکم بجالانے کے کام پر مامور تھی۔

پھر میں مٹسوبشی کے عہدیدار کی کمزوری پر غور کرنے لگا اور کئی دوسرے لوگوں کی طرح اس نے بھی طوفان کے امکانات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس بات کی توقع ہی نہیں کر رہا تھا کہ بارانی جنگلات کو نقصان پہنچانا دراصل اپنے بچوں کے مستقبل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے اپنے مخبر کو یہ کہہ کر ان تمام چیزوں کو دیکھ کر ان دیکھا کرنے کیلئے کوئی نئی ترکیب ڈھونڈ نکالی ہوگی جیسے کہ کسی دن کوئی ذہین فطین شخص ان دوررس مضر اثرات سے محفوظ رہنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالے گا۔ جیسے کہ شمسی اور ہوا کی قوت، گیس اور تیل سے چلنے ولی گاڑیاں یا ہائیڈروپونک طریقہ کاشت وغیرہ۔ وہ بھی ہم سب کی طرح بہانے تراش پایا ہوگا۔

مجھ سے کچھ فاصلے پر لہر کو چٹان سے ٹکراتا دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ ڈریم چینج ادارے کے ورکشاپ میں حصہ لینے والے اور امیزون کے دوروں پر گئے عام لوگ اس حقیقت کو زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتے تھے کہ کارپوریشنز کے اصلی عہدیدار دولت کیلئے شیطان اور انسان کے درمیان کا فرق مٹا بیٹھے ہیں یا یہ کہ کارپوریشنز اتنی بااثر ہوتی ہیں کہ ان کو ٹس سے مس کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا حیلہ ہے۔ حقیقت ماننے سے انکار کر دو تاکہ ذمہ داری ہمارے یعنی عوام پر نہ آجائے، اگر کارپوریشنز اتنی ہی طاقتور ہیں اور ان کے سربراہان یا مالکان شیطان ہیں تو پھر ہم سب اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ ان کی تشہیری مہموں کو مان لیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ مصنوعات کی خریداری میں دلچسپی پیدا کر لیں۔

رین اور اس کے رضا کار اس من گھڑت افسانے کو بدل رہے ہیں۔ وہ کارپوریٹ عہدیداروں کو اپنا ذہن منفرد انداز میں استعمال کرنے کی تلقین کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ہم سب کو یہ بھی بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ عہدیداران نہ تو بے ایمان ہیں اور نہ ہی شیطان اور کارپوریشنز مکمل طاقت کی مالک نہیں ہیں یا یہ کہ ہم بھی کمزور نہیں ہیں۔ وہ ہمیں یعنی عہدیداران اور باقی سب کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہے تھے کہ ہمیں اپنی طرز زندگی کی ذمہ داری لینی ہوگی۔

ساتھ ہی اپنی اولادوں کو ورثے میں دی جانے والی اس دنیا کی بھی ذمہ داری نبھانا ہوگی۔

جب میں اس بنچ سے اٹھا تو میں کافی پرجوش تھا۔ رینڈی اور مٹسوبشی کے عہدیدار سے ہونے والی ملاقات نے مجھے نئے امکانات سے روشناس کرایا تھا۔ اگلے دو دن میں نے ان شرکاء کے ساتھ گزارے تھے جو بڑی کارپوریشنز میں ملازمت کرتے رہے تھے۔ معاشی تباہ کار کی حیثیت سے میں ایسے لوگوں کو جانتا تھا کیونکہ میں خود ان ہی میں سے ایک تھا انہیں ورکشاپس میں تربیتی کورسز کراتا رہا تھا اور ان کے ساتھ سیمینارز اور دعوتوں میں شریک رہا تھا۔ اس اجتماع میں ان کی شرکت اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ وہ بھی کاروبار کرنے کے متبادل طریقوں پر غور کرنے کیلئے تیار ہیں مگر میرے ذہن میں کچھ مخصوص سوالات کلبلا رہے تھے۔ میں ان لوگوں کو ایک نئے زاویے سے جانچنا چاہتا تھا میں اپنے مفروضے کو پرکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ مفروضہ صحیح ثابت ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ زیادہ تر معقول لوگ اپنے بچوں کو زیادہ بہتر دنیا منتقل کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے رین جیسی تنظیم کی مداخلت کو اپنی زندگی میں نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں اور پھر اس ساری ٹیم کے اثرات حیران کن ہوسکتے ہیں۔

میں اپنے مفروضے کو مستقل پرکھ رہا تھا۔ کارپوریٹ عہدیداران سے ملاقاتوں کے علاوہ میں کئی لوگوں کی مرتب کردہ تحقیق کا بھی مطالعہ کر رہا تھا جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگرچہ ان عہدیداران میں ہمدرد بیمار شخصیات بھی موجود تھیں جو زندگی کی قدر نہیں کرتے ہیں اور اپنے علاوہ کسی اور کی خوشیوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر معاشرے میں موجود ایک غالب عنصر کی عکاسی ضرور کرتے ہیں مگر زیادہ عہدیداران اپنے اعمال کے نتائج کی پرواہ کیا کرتے ہیں اور انہیں اس بات میں بھی گہری دلچسپی ہے کہ وہ اپنی اولادوں کیلئے کس طرح دنیا چھوڑ کر رخصت ہوں گے۔ رینڈی بیس جیسے حضرات سے ڈرنا اور ان کی ملازمتوں کا خاصہ ہے مگر اندر ہی اندر وہ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کی موجودگی کو رحمت سمجھتے ہیں۔ جب رین جیسی تنظیمیں ان کی سربراہی میں عمارت پر بڑے بڑے بینرز لگاتی ہیں تو یہ عہدیداران سکھ کا سانس لیتے ہیں۔

ان نتائج پر پہنچنے کے فوراً بعد میں ذاتی پریشانیوں سے دوچار رہا تھا۔ خاندان میں کچھ لوگوں کی بیماریوں اور میرے والد کی وفات کے بعد میں کافی الجھ گیا تھا۔ میں نے اپنی سرگرمیاں محدود کر دی تھیں۔ امیزون کے دورے اور وہ سارے ورکشاپس جو کافی عرصے سے طے تھے وہ بھی

مجھے ملتوی کرنے پڑے تھے اور پھر ۹/۱۱ کا واقعہ ہوگیا۔ زمینی سفر بالکل ختم ہونے کے بعد میں ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' لکھنے میں منہمک ہوگیا تھا اور پھر اس کی کامیابی کے بعد تقریری دوروں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت سے لے کر ۲۰۰۶ء میں اس فلائٹ تک جو میں نے رین کے لئے چندہ جمع کرنے کیلئے منعقدہ تقریب میں پہنچنے کیلئے کی تھی تک میں ان تمام مہموں کے بارے میں سوچ نہیں سکا تھا جو مٹسوبشی اور کارپوریٹوکریسی کے دیگر ستونوں کو ہلانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

مجھے اس فلائٹ کے دوران پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ اگر ہمیں اس دنیا کو تبدیل کرنا ہے جس پر کارپوریٹوکریسی کی حکمرانی ہے تو پھر ہمیں کارپوریشنز کو تبدیل کرنا ہوگا۔ میں جتنا اس بارے میں سوچ رہا تھا اتنا ہی میرا یقین مضبوط ہوتا جارہا تھا کہ رینڈی اور اس کے عملے اور رضاکاروں نے کچھ بڑا اور اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ وہ ہڑتالیں اور نعرے بوسٹن کی بندرگاہ پر چائے کے کریٹ اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کے برابر ہے اور سارا ٹوگا میں کامیابی سے پہلے آپ کو یہ چائے دریا برد ضرور کرنا ہوگی۔

باب نمبر: ۵۷

نیا سرمایہ دارانہ نظام

رین بظاہر کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو دنیا کی طاقتور ترین کارپوریشنز کو خوفزدہ کر سکے۔ ۲۰۰۶ء میں اس کا عملہ چالیس افراد سے بھی کم تعداد پر محیط تھا جبکہ ان کا سالانہ بجٹ ۳ملین ڈالرز تھا یا یہ کافی معمولی محسوس ہوتا ہے اگر آپ ان کی خدمات پر نظر رکھیں۔ کئی دفعہ میں اس ابتدائی تقریر کے بعد سان فرانسسکو جا کر ان لوگوں سے مل چکا تھا۔

رین کے بورڈ کے چیئرمین گولن نے میری کارپوریٹوکریسی کی کمزوریوں کے حوالے سے پوچھے جانے والے سوال کے جواب میں کہا تھا'' دباؤ پڑنے کی صورت میں متاثر ہونے کے کافی امکانات ہوتے ہیں۔ کئی بار یہ دیکھا گیا ہے کہ دباؤ کی صورت میں وہ اپنی اہم حکمت عملیوں میں ردّوبدل کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔'' جم روانی سے جاپانی زبان بولا کرتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان پہلے مغربی باشندوں میں سے تھا جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی حصص جاتی کمپنی ''نومورا'' کے سربراہی دفتر ٹوکیو میں خدمات انجام دیتا رہا تھا اور پھر مورگن اسٹینلے کیلئے اس نے دنیا کے مختلف حصوں میں کام کیا تھا اور پھر اس نے اپنی سرمایہ فراہم کرنے کی کمپنی شروع کردی تھی۔ وہ کارپوریٹ دنیا کے اسرار و رموز سے واقف تھا۔

جم نے ہوم ڈیپو کی مثال دیتے ہوئے بیان کیا'' انہیں تیار کرنے کیلئے آپ کو صورتحال کے مطابق اپنے رویے میں لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔ ہوم ڈیپو دنیا میں عمارتی لکڑی کی سب سے بڑی خوردہ فروش کمپنی تھی اور وہ ہمارے ساتھ کام کرنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ تو پھر ہم نے ان کی دکانوں پر مظاہروں اور ان کے حصص کے مالکان سے ملاقاتوں کے ذریعے دباؤ بڑھانا شروع کردیا تھا۔ ہمارے دوست اور ہوم ڈپو کے ملازم نے ہمیں انٹرکام کوڈ کے بارے میں بتایا اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ ان کی تمام دکانوں کا کوڈ ایک ہی رکھا گیا تھا۔ ایک دن ہمارے رضاکاروں نے وہ کوڈ استعمال کیا اور یہ اعلان کرنا شروع کردیا کہ'' ہوم ڈیپو کے خریدار برائے کرم متوجہ ہوں، دسویں شیلف میں سستے داموں بکنے والی لکڑی امیزون کے جنگلات سے کاٹ کر لائی گئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ فرش پر خون بہہ رہا ہو تو ذرا احتیاط رہیے ان درختوں کی لکڑی کاٹنے سے مقامی آبادیوں کے دربدر ہونے، مٹی کے گھٹاؤ اور ہماری زمین کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔'' جب ہم نے طالب علموں پر مشتمل گروہ

تشکیل دے دیے تھے تو پھر ہم ایک دن میں ۱۶۲ دکانوں کا دورہ کر رہے تھے۔ جیسے کہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ہوم ڈیپو کے سربراہی دفتر اٹلانٹا میں خونریزی کا تانا بانا بندھ گیا تھا اور پھر وہ ہم سے بات کرنے کیلئے تیار ہوگئے تھے۔ جب انہوں نے انقطاع کے خطرے سے دوچار جنگلات سے کاٹی گئی قدیم لکڑی اور شہتیر کی فروخت کو روکنے کیلئے رضامندی ظاہر کر دی تھی تو پھر دیگر اہم عمارتی لکڑی کے خوردہ فروش کمپنیوں بشمول ''لودے'' نے اس مہم میں شرکت کا اعلان کر دیا تھا۔

جم نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ''میں ایک سرمایہ دار ہوں۔ کارپوریشنز اس وقت دنیا کی سب سے قوت آفریں حقیقت ہے۔ ان کے پاس اختیار ہے وہ تبدیلی لانے کی قوت کی حامل ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کو ممکن بناسکیں اور میں براہِ راست تحریکوں کے ذریعے تبدیلی لانے پر یقین رکھتا ہوں۔''

فورچیون کے مطابق رین ''خیمہ میں گھسے ایک مچھر'' کی طرح ہے کیونکہ اس ادارے نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی تھی کہ اس کے مقاصد کتنے بڑے ہیں یا ان کے حصول میں کون کون سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ رین کے مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے والی کارپوریشنز میں کنکوس، اسٹیپلز، بوائز کاسکیڈے، سٹی گروپ، بینک آف امریکہ، جے پی مارگین چیس، ملکڈونلڈ اور گولڈ مین ساچز شامل ہیں۔

رینڈی ہیس نے رین کے روزمرہ معمولات کی ذمہ داری ۲۰۰۳ء میں مائیک برون کو سونپ دی تھی اور تنظیم کا بانی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں فعال انداز میں نبھانے لگا تھا۔ نیا ایگزیکٹو ڈائریکٹر اس سے پہلے مختلف مہموں کا ڈائریکٹر رہ چکا تھا اور حکمت عملیاں ترتیب دینے میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس نے مجھے یہ بتایا کہ لوگوں کو اس بات پر یقین نہیں آتا ہے کہ چار ملین ڈالرز کی مالک ایک تنظیم ۱۰۰ بلین ڈالرز کی کارپوریشنز کو حکمت عملیاں تبدیل کرنے پر کیسے مجبور کرسکتی ہیں۔ مائیک نے بتایا ''ہم عالمی انصاف کی تحریک کا حصہ ہیں، جس میں رہنے والے سرمایہ دار، روشن خیال، مخیّر حضرات اور ہمدرد شامل ہیں۔ ہمارا جن تنظیموں کے ساتھ اشتراک ہے ان میں فاریسٹ اتھیکس، بینک ٹریک، ورلڈ وائلڈ لائف فنڈز، فرینڈز آف دی ارتھ، امیزون واچ، دی پاچاماما الائنس، دی رکوس سوسائٹی، گرین پیس، گلوبل ایکسچینج، دی سیرا اسٹوڈنٹ کولیشن، دی اسٹوڈنٹ انوائرمنٹل ایکشن کولیشن، رین فاریسٹ ایکشن گروپ اور دیگر تنظیمیں شامل ہیں اور مجھے پوری امید ہے کہ ہم کارپوریٹ امریکہ کو بدل سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ

مسکرانے لگا۔

میں نے اس سے اس کے اعتماد کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا۔

''چار وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ ہماری عالمی معیشت اور ہمارا طرز زندگی صاف ستھرے ماحول، صاف ہوا اور پانی اور ترقی کرتی اور مختلف النوع حیاتیاتی علوم پر منحصر ہے۔ یہ تمام بنیادی انسانی حقوق ہیں۔ جیسے کہ ہمارے اسٹیکر میں واضح الفاظ میں لکھا ہے ''مردہ سیارے پر کوئی ملازمتیں نہیں ہوں گی۔'' دوسری وجہ یہ ہے کہ کارپوریٹ عہدیداران اور چیف ایگزیکٹو اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں ان میں سے بہت سے اس بات کو آہستہ آہستہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ان تمام مسائل کے حل کا حصہ بن سکتے ہیں نہ کہ از خود مسئلے کا۔ تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ ہم ان کارپوریشنز کو اپنا حلیف مانتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہیں، ہم ایسی صورتحال چاہتے ہیں جس میں سب کو اطمینان حاصل ہو سکے۔ ہم انہی حکمت عملیوں کی ذمہ دار قیادت کے حوالے سے مفید مشورے دے سکتے ہیں اور آخری وجہ یہ ہے کہ ہم ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ کے سلسلے میں ہمیں عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے اور رین جیسی تنظیمیں ان تمام اداروں کا احتساب کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اس سارے عمل میں اعلیٰ عہدیداران کے فکری انداز کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ رین کی عالمی مالیاتی مہم سے ڈائریکٹر ایلس ہوگ کی پرورش حصص کی خرید وفروخت کرنے والے باپ کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا ''لوگ بھول جاتے ہیں کہ کارپوریشنز میں انسان ہی کام کرتے ہیں جن میں اکثر اولادوں کو پال رہے ہیں اور وہ تمام مستقبل کے حوالے سے کافی فکرمند ہیں۔''

۲۰۰۶ء میں رین کے نئے منصوبے جمپ اسٹارٹ فورڈ نے رین کو ایک نئی جہت عطا کی تھی۔ ان کی مہم کا مقصد اس کارپوریشن کی سوچ میں تبدیلی لانا تھا جو براہِ راست درختوں کی تباہی سے منسلک نہیں تھی۔ اس مہم کی ڈائریکٹر جنیفر کرل نے نشاندہی کی ''گاڑیاں تیل سے چلتی ہیں، بہت سارا تیل بارانی جنگلات سے حاصل کیا جاتا ہے اور دوسری طرف تیل ماحول کو نقصان پہنچانے کے عمل کا ایک اہم عنصر ہے جس کا اثر درختوں اور ہم سب انسانوں پر بھی ہو رہا ہے۔'' اس مہم نے یہ اشارہ دیا تھا کہ رین کے مقاصد میں بارانی جنگلات سے کہیں زیادہ اور اہم عناصر کی بہتری شامل ہے۔

کرل کو جمپ اسٹارٹ فورڈ مہم کے نتیجہ کے حوالے سے کوئی شکوک نہ تھے۔ رین کی تمام

مہموں نے قابل ذکر نتائج حاصل کئے تھے۔ اس نے کہا ''سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔ سوال یہ کہ کیا ہم مقررہ مدت میں اسے حاصل کر پائیں گے یا نہیں؟''

ایسا ہونا ممکن نہ تھا اگر کارپریٹوکریسی کو اپنے من چاہے نتائج ملنا شروع ہو گئے۔ دی ہاؤس ویز اینڈ مینز کمیٹی نے رین کو ۱۹۹۳ء سے لے کر اب تک کے اپنے تمام مظاہروں کے حوالے سے معلومات داخل کرنے کا حکم دیا۔ یہ طریقہ کار ظاہر کرتا تھا کہ بڑے تجارتی اداروں اور کانگریس کے درمیان قریبی روابط پائے جاتے ہیں۔ اس تحقیقات کا مقصد یہ تھا کہ رین کے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ مائیک برون کے مطابق اس کی تنظیم حکم کی مکمل تابعداری میں مامور ہے۔ ۳۱ مئی ۲۰۰۵ء کو رین نے سینکڑوں دستاویزات اور ویڈیو فلمیں پیش کر دی تھیں۔ مائیک نے افسردہ انداز میں تصدیق کی اس سے ہمارا وقت اور پیسہ دونوں ضائع ہو رہا ہے۔ ہم یہ یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ ہماری مدد کرنے والی شخصیات کسی طرح کی تکلیف کا شکار نہ بن سکیں۔ اس لئے ہم نے جو معلومات فراہم کی ہیں اس پر سے تمام نام اور تصاویر ہٹالی گئی ہیں۔ کیسا بے کار طریقہ کار ہے۔ مگر ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس نظام پر پورا یقین ہے اور ہم کسی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کیلئے تیار نہیں۔''

میں نے اس سے ویز اینڈ مینز کمیٹی کے اقدام پر اس کی رائے معلوم کرنی کی کوشش کی۔

اس نے قدرے توقف سے کہا ''مجھے کیسا محسوس ہوا؟ ایک طرف تو میں سخت جھلاہٹ کا شکار ہوں۔ انہیں ان اداروں کو پکڑنا چاہئے جو اپنے اختیارات کو بے دردی سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ ہماری جیسی تنظیموں کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے جو اپنی نسلوں کے ورثے کے تحفظ کیلئے کوشاں ہیں لیکن دوسری جانب مجھے امید ہے کہ یہ رویہ امریکی عوام کو اپنی طاقت سے آگاہی کا احساس دلانے کا کام کرے گا خصوصاً جب ہم متحد ہو کر منظم انداز میں اسے استعمال کریں۔ کانگریس معمولی امدادی اداروں کے خلاف اس وقت تک کارروائی نہیں کرتی ہے جب تک اہم اور بااثر حضرات کو ان سے خطرہ نہ محسوس ہونے لگے۔''

سان فرانسسکو میں اگلے چند دنوں اور ہفتوں میں ہونے والی ملاقاتوں نے مجھے احساس دلایا تھا کہ بہت سے بااختیار لوگ ان غیر سرکاری تنظیموں سے خوفزدہ ہیں۔ کارپریٹوکریسی ابھی بھی اس صورتحال کو قابو کئے ہوئے ہے لیکن انہیں احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔

باب نمبر: ۵۸

شکایتوں کی فہرست

رین اور اس جیسی دوسری تنظیموں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کارپوریشنز ناقابل شکست نہیں ہیں اور انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور انہیں تبدیل ہونا پڑے گا۔ اگلے چند اسباق میں ہم ان غیر سرکاری تنظیموں کی چند کامیاب حکمت عملیوں پر نظر ڈالیں گے۔ انہوں نے صنعتوں کی دیوہیکل طاقتوں کو دریاؤں کی صفائی، اوزون کی سطح کو نقصان پہنچانے والے مواد کی غیر قانونی انتقاع کے خطرے سے دوچار جاندار، اقلیتوں کیلئے کشادگی، نسلی امتیاز پر پابندی اور کئی ایسی حکمت عملیاں نافذ کرالی ہیں جو سماجی، ماحولیاتی، انسانی حقوق اور انسانی بنیادوں کے مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس سے مماثلت رکھتی حکمت عملیوں کے ذریعے کارپوریشنز کے بنیادی مقاصد میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے تاکہ وہ اس زمین کے اچھے شہری بن سکیں جو معاشروں اور ماحول کے مفادات کا خیال رکھیں نہ کہ چھوٹی سی عالمی سطح پر چند مخصوص لوگوں کے مفادات کو تحفظ دینے کیلئے سرگرداں رہیں۔

وسیع تحقیق اور تبادلہ خیال سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تبدیلی ممکن ہے اور اس کا عمل مختلف طریقوں سے جاری ہے۔ کارپوریشنز آہستہ آہستہ ہمارے احساسات کے آگے جھکتی جا رہی ہیں اور ہم میں اس معاشرے کی بنیادوں میں از سر نو تبدیلی لانے کی طاقت موجود ہے۔

اب یہاں دوسرا سوال اٹھتا ہے۔ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایشیاء، لاطینی امریکہ، مشرق وسطی اور افریقہ میں ہم معاشی تباہ کاروں، کرائے کے قاتلوں اور عسکری مداخلت کے تباہ کن نتائج دیکھ چکے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے نوآبادکاروں نے برطانوی حکومت کی حکمت عملیوں کی صورت میں پیدا ہونے والی مصیبتوں اور ناانصافیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ تو پھر ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا یہ تمام بدصورتیاں ہمیں ٹھوس اقدام اٹھانے کیلئے آمادہ کرنے کیلئے کافی ہیں۔

انقلاب سے پہلے بنجمین فرینکلن جیسے صحافی، پیٹرک ہنری جیسے مقرر اور ٹام پین جیسے مشتہرین برطانوی حکومت کی پھیلائی ہوئی سماجی ناہمواریوں اور فاصلوں کو بے نقاب کرنے کی اہمیت سمجھ گئے تھے۔ ان کے پاس ٹھوس وجوہات، اعداد و شمار اور مفید اور مفصل معلومات پیش

کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اور ان کے دلائل کی روشنی میں برطانوی بادشاہت کے خلاف شکایتوں کی طویل فہرست وجود میں آئی تھی جسے آزادی کا اعلامیہ کہا گیا تھا۔ وہ عمل کرنے کیلئے محرک اور حکمت عملی دونوں کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ آج ہمارے پاس کارپریٹوکریسی کے خلاف شکایتوں کی زیادہ طویل فہرست موجود ہے جو ہمیں اکثر اوقات اخبارات، انٹرنیٹ، فلموں اور کتابوں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ ان شکایتوں میں چند ایک اہم یہ ہیں:

کارپریٹوکریسی کی حکمت عملیوں اور اقدامات کی وجہ سے

☆ دنیا کی نصف سے زائد آبادی آج بھی ۲ ڈالر یومیہ پر زندگی گزار رہی ہے تیس سال پہلے بھی ان کی اصل آمدنی تقریباً اتنی ہی تھی۔

☆ دو بلین آبادی آج بھی بنیادی ضروریات جیسے کہ بجلی، صاف پانی، صفائی، زمینوں کی ملکیت، ٹیلی فون، پولیس اور آگ سے بچاؤ جیسی سہولیات کے بغیر رہ رہی ہے۔

☆ (امریکی کانگریس کی جوائنٹ اکنامک کمیٹی کی تحقیق کے مطابق) عالمی بینک کے تعاون سے وجود میں آنے والے ۶۰ - ۵۵ فیصد منصوبے ناکامی کا شکار ہو چکے ہیں۔

☆ تیسری دنیا کے قرضوں کے نظم و نسق کی مد میں جتنی رقم خرچ ہوتی ہے وہ تیسری دنیا کو صحت اور تعلیم جیسی سہولیات فراہم کرنے سے زیادہ ہے اور تقریباً اس رقم سے دوگنا زیادہ رقوم یہ ممالک غیر ملکی امداد کی صورت میں ہر سال وصول کرتے ہیں۔ قرضے معاف کرنے کے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود تیسری دنیا کے قرضے ہر سال بڑھ رہے ہیں جو حالیہ عرصے میں ۳ ٹریلین ڈالرز تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ کوئی حوصلہ افزا اعداد و شمار نہیں ہے۔ ۱۹۹۶ء میں شروع کئے گئے قرضوں کی معافی کے نئے سلسلے میں جی ۷ کے ممالک آئی ایم ایف اور عالمی بینک نے شدید قرضوں سے دوچار ممالک کے ۸۰ فیصد قرضے معاف کرنے کا اعلان کر دیا تھا مگر ۱۹۹۶ء سے ۱۹۹۹ء کے دوران ان شدید قرضوں سے دوچار ممالک کی قرضوں کی مد میں خرچ ہونے والی رقوم میں ۲۵ فیصد اضافہ ہو چکا تھا جو مکمل اعداد و شمار کے مطابق ۶ء۸۸ ٹریلین ڈالر سے بڑھ کر ۴ء۱۱۴ ٹریلین ڈالر ہو گیا تھا۔

☆ ۱۹۷۰ء میں ترقی پذیر ممالک کو تجارتی منافع ایک بلین ڈالر تھا جو نئے ہزاریے کی ابتداء میں ۱۱ بلین ڈالر کے تجارتی خسارے میں بدل چکا تھا اور مستقل اس تخمینہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

☆ تیسری دنیا کی دولت ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں کئی گنا ارتکاز کا شکار ہے جو کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی

کی بنیادی ضرورتوں کے منصوبوں اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں چلنے والی نجکاری کی لہر سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ زیادہ تر ممالک میں شروع کے ایک فیصد خاندان ذاتی دولت کا ۹۰ فیصد حصہ کے مالک ہیں۔

☆ کثیر ملکی کارپوریشنز نے ترقی پذیر ممالک کے پیداواری اور تجارتی شعبے پر قبضہ کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا بھر کی ۴۰ فیصد کافی کی تجارت صرف چار ادارے کرتے ہیں جبکہ تیس سپر مارکیٹ اسٹورز تقریباً دنیا کی ایک تہائی پنساری کی اشیاء کی فروخت میں شامل ہیں۔ تیل اور دیگر معدنیات نکالنے والے اداروں کی مٹھی بھر تعداد نہ صرف منڈیوں پر قابض ہیں بلکہ انہوں نے ان ممالک کی حکومتوں کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جہاں یہ ذخائر موجود ہیں۔

☆ کارپوریٹ لالچ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۶ء کی دوسری سہ ماہی میں ایکسون موبل نے ریکارڈ توڑ منافع ۴ء۱۰ بلین ڈالر کے منافع کا اعلان کیا تھا جو کسی بھی دوسری امریکی کمپنی کی تاریخ میں سب سے زیادہ منافع تھا اس سے پہلے ۲۰۰۵ء کے چوتھی سہ ماہی میں ایکسون نے ۷ء۱۰ بلین ڈالر کے منافع کا اعلان کیا تھا۔ ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء ہی دو ایسے سال ہیں جب تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے دنیا کے غریب طبقے کی پریشانیوں میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا۔ تیل کی کمپنیوں کو ٹیکس میں دی جانے والی چھوٹ کی وجہ سے بڑی سبسڈی، تجارتی معاہدے اور بین الاقوامی مزدور اور ماحولیاتی قوانین کی وجہ سے بہت آسانیاں حاصل رہتی ہیں۔

☆ امریکی کارپوریشنز کا وفاقی ٹیکس کی مد میں ادا کی جانے والی رقوم کا کل حصہ ۱۰ فیصد سے بھی کم رہ گیا ہے جو ۲۰۰۱ء میں ۲۱ فیصد تھا اور جنگ عظیم دوئم کے دوران ۵۰ فیصد سے زیادہ تھا۔ امریکہ کی چند بڑی اور بے تحاشہ منافع کمانے والی کارپوریشنز میں سے ایک تہائی نے نئے ہزاریے کے کم از کم پہلے تین میں سے ایک سال میں کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔ ۲۰۰۲ء میں امریکی کارپوریشنز ٹیکس کی پابندیوں سے آزاد ممالک جیسے آئرلینڈ، برمودا، لکسمبرگ اور سنگاپور میں ۱۴۹ بلین ڈالر کے کاروبار کی حق دار قرار پائی تھیں۔

☆ دنیا کی سو سب سے بڑی معیشتوں میں ۵۱ کارپوریشنز ہیں اور ان میں سے ۴۷ کمپنیاں امریکی ہیں۔

☆ پانچ سال سے کم عمر کے ۳۴ ہزار بچے ہر روز بھوک، حفاظتی تدابیر سے جن بیماریوں سے بچایا جاسکتا ہے ان کے شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ امریکہ اور بہت سے ایسے ممالک جن کو واشنگٹن جمہوری ممالک قرار دیتا ہے مندرجہ ذیل غیر جمہوری خصلتوں کا مظاہرہ کرتی ہیں:

میڈیا کو بڑی کارپوریشنز اور حکومتیں اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتے ہیں، سیاستدان ان کے انتخابی مہموں میں بھاری پیسہ لگانے والوں کے مقروض رہتے ہیں اور بند دروازوں کے پیچھے تشکیل دی جانے والی حکمت عملیوں کے متعلق ووٹرز کو آگاہ نہیں کیا جاتا۔

☆ جب اقوام متحدہ نے ۱۹۹۷ء میں بارودی سرنگوں پر پابندی لگانے کیلئے بین الاقوامی معاہدہ صفر کے مقابلے میں ۱۴۲ ووٹ سے منظور کرلیا تھا تو امریکہ نے اس کی حمایت کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے بچوں کے حقوق سے متعلق معاہدے کی ۱۹۸۹ء میں توثیق کرنے سے انکار کر دیا تھا، ساتھ ہی وہ بین الاقوامی معاہدے برائے حیاتیاتی ہتھیار، کیوٹو پروٹوکول اور بین الاقوامی عدالت برائے جرائم کی بھی توثیق کرنے سے واضح انکار کیا تھا۔

☆ ۲۰۰۶ء میں عسکری ہتھیاروں کے حصول کیلئے خرچ کی جانے والی رقم نئے ریکارڈ یعنی ۱۰۱ ٹریلین ڈالرز تک پہنچ گئی تھی اور امریکہ اس میں سے نصف مالیت خرچ کرتا ہے (جو تقریباً ہر امریکی مرد، عورت اور بچے پر حساب سے فی کس ۱۶۰۰ ڈالرز بنتا ہے)

☆ ۲۰۰۶ء میں امریکہ ورلڈ پریس فریڈم کی درجہ بندی میں ۵۳ ویں نمبر پر تھا (جبکہ ۲۰۰۲ء میں وہ ۱۷ ویں نمبر پر تھا) اس دوران امریکہ کو سرحدوں سے آزاد صحافیوں اور دیگر این جی اوز کی جانب سے صحافیوں کو جیل میں بند کرنے اور انہیں ڈرانے دھمکانے کیلئے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

☆ امریکی قومی قرضہ (یہ وہ رقوم ہوتی ہیں جو امریکی وفاقی حکومت کو ان قرض خواہوں کو دینا ہوتا ہے جو امریکی قرضہ جاتی دستاویزات کے مالک ہوتے ہیں) دنیا کا سب سے بڑا قومی قرضہ ہے جو اگست ۲۰۰۶ء میں ۸.۵ ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا تھا جو امریکی شہری پر فی کس ۲۸۵۰۰ ڈالر کے برابر ہے اور یہ یومیہ ۱.۷ بلین ڈالر کے حساب سے بڑھ رہا ہے۔ اس قرضے کا بہت حصہ جاپان اور چین کے مرکزی بینکوں اور یورپی یونین کے اراکین کے پاس

موجود ہے جس کی وجہ سے ہم آج ان کے رحم و کرم پر ہیں۔

☆ امریکا کا بیرونی قرضہ (یہ کل سرکاری اور نجی قرضہ ہے جو غیر ملکی شہریوں کو غیر ملکی کرنسی، اشیاء اور خدمات کی صورت میں واپس کرنا ہوگا) یہ بھی دنیا کا سب سے بڑا قرضہ ہے جو ۲۰۰۵ء میں اندازاً ۹ ٹریلین ڈالرز کے برابر تھا (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ واشنگٹن ان ملکی اور غیر ملکی قرضوں کو ہتھیار کی صورت میں استعمال کر رہا ہے جیسے کہ ان کے ذریعے ملکوں کی حکومتوں کو کارپریٹوکریسی کے احکامات ماننے پر مجبور کرنے پر خرچ کرتا ہے یا پھر دیوالیہ، معاشی پابندیوں یا آئی ایم ایف کی عائد کردہ انتہائی سخت شرائط لگانے کی دھمکیاں دیتا ہے اور اس کے باوجود امریکہ دنیا کا سب سے مقروض ملک ہے)

یہ ایک مختصر سی فہرست تھی جو ہمارے دلوں میں کوئی شکوک نہیں چھوڑتی کہ ہمیں تبدیلی کیلئے کوششیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں ان شکایتوں کا کارپریٹوکریسی کی تعمیر کردہ بدنما دنیا کی حقیقت کو تبدیل کرنے کیلئے محرک کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ تمام تر سماجی ناانصافیوں کی اصل بنیاد کارپوریشنز ہیں۔ انہیں تبدیل کر کے ہم تبدیلی ممکن بنا سکتے ہیں۔

ہمیں کارپوریشنز کو جمہوری اور شفاف بنانے کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ ہمیں ایسی سرمایہ دارانہ سلطنت کو مزید قبول نہیں کرنا چاہئے جہاں تمام فیصلہ سازی کے عمل اور تمام دولت پر امراء قابض ہوں اور بالخصوص جب وہ یہ سب کچھ چھپ کر کر رہے ہوں۔ ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ان اصولوں کو تسلیم کریں جو ہماری مقدس دستاویزات میں درج ہیں۔ انصاف، مساوات، ہمدردی اور حکمرانی کے وہ رہنما اصول جن کا مقصد آنے والی نسلوں کا استحکام اور امن ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس انہیں دلانا چاہئے کہ ہم ایک عالمی معاشرہ میں بستے ہیں اور کارپوریشنز کو چاہئے کہ وہ اپنے نئے مقاصد وضع کرے جو اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ چند مخصوص لوگوں کے مفادات کیلئے کام کریں انہیں چاہئے کہ وہ اپنے ملازمین کا بھی خیال رکھیں نہ صرف ملازمت کے دوران بلکہ ملازمت کے بعد بھی ان کے حقوق کو مدنظر رکھیں، اپنے گاہکوں کو بہترین خدمات پیش کریں اور جو چیزیں وہ بناتے ہیں ان کیلئے خام مال فراہم کرنے والوں کا بھی احترام کریں جو ان کیلئے کانیں کھودتے ہیں۔ پودے اگاتے اور چنتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں، کانٹ چھانٹ کرتے ہیں اور ساتھ ان علاقوں کے ماحول اور آبادیوں کے حقوق کا بھی خیال رکھیں جہاں ان کے ملازمین رہائش پذیر ہوں۔

اس عمل کی ایک اور ضرورت یہ بھی ہے کہ ہمارے پرورش کے جو پہلو ہیں ان کا بھی احترام کیا جائے خصوصاً جن کا براہِ راست تعلق خواتین سے ہو۔ ہمیں اس نظریے کو دفن کر دینا چاہئے کہ یہ صرف مردوں کی دنیا ہے جہاں جو طاقتور ہے وہی فیصلہ ساز ہوگا۔ ریان ایسلر نامی ایک مصنف جن کی کتاب "چیلس اینڈ دی بلیڈ" قومی سطح پر کافی مقبول ہوئی تھی انہوں نے اپنی اس تصنیف میں کافی محققین کی رائے شامل کی تھی جنہوں نے ان اقدامات کے تجزیے کئے تھے جو یہ بتاتے ہیں کہ طرز زندگی کا معیار معاشرے میں عورت کے مقام کے ساتھ کس حد تک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ۸۹ ممالک سے حاصل کئے گئے اعداد وشمار کو بنیاد بنا کر ان کی تحقیق سے جو نتائج اخذ کئے تھے اس کے مطابق عام معیار زندگی ناپنے کا بہتر طریقہ کل قومی پیداوار نہیں بلکہ عورت کا معاشرے میں رتبہ ہے۔

اپنی نئی کتاب "دی ریئل ویلتھ آف نیشنز" میں ڈاکٹر ایسلر کہتی ہیں کہ "ایسے معاشروں میں جہاں عورت کی قدر ومنزلت کی جاتی ہے اور وہ حکومتوں میں نصف تعداد میں شامل ہوتی ہیں جیسے کہ قطب شمالی ممالک میں دیکھا گیا ہے تو وہاں حکومت کے مالی معاملات میں شہریوں کی دیکھ بھال کی حکمت عملیوں کو ترجیح دی جاتی ہے جیسے کہ ملکی صحت کا نظام، بچوں کی نگہداشت، ذمہ دار والدین بننے کی تربیت اور بچوں کی دیکھ بھال کیلئے تعطیلات اور تنخواہوں کا اجراء وغیرہ۔ جب عورتوں کا مقام ورتبہ اونچا ہوگا تو قوم کا عام طرز زندگی بھی بہتر ہوگا اور جب عورت ذلت اور استحصال کا شکار ہوگی تو معیار زندگی برباد ہو جائے گا۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہماری بقاء کا انحصار ہمارے ہمدردی کرنے اور خیال رکھنے کے جذبے پر منحصر ہے۔ ہمیں دیکھ بھال کرنا، ایک دوسرے کو سہارا دینا اور محبت کرنا سیکھنا ہوگا۔

ہمارا چھوٹا سا سیارہ ٹائیٹینک کی طرح آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے اور ٹائیٹینک کے برعکس جس میں کچھ چھوٹی کشتیاں موجود تھیں جو وقت پر کام آ گئی تھیں لیکن ہمارے پاس کوئی اور کشتی نہیں ہے۔ ہمارے سب سے مضبوط ادارے کارپوریشنز کو طاقت فراہم کرنا ہوگی۔ انہوں نے اس جہاز کو برف کے پہاڑ سے ٹکرا دیا تھا اور اب انہیں ہی اسے بچا کر نئی سمت میں رواں دواں کرنا ہوگا۔

اور ہم عام عوام کو صحیح فیصلہ کرنا ہوگا درست اور ٹھوس حکمت عملی اپنا کر ان کی مدد کرنا ہوگی۔

ہمیں آواز اٹھانی چاہئے تاکہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔ ہمیں کارپوریشنز کو شفاف اور جمہوری بنانے کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

ہمیں رہنما اصولوں کی نشاندہی کے ساتھ بڑے مسائل کی وضاحت سے پہلے اس رکاوٹ کو

اپنے راستے سے ہٹانا ہوگا جو ہم میں سے بہت سوں کو ان سوالات کو پوچھنے سے روکتی ہے جو دراصل ان اہم معاملات کے حل سے وابستہ ہیں اور میرا اس رکاوٹ سے آمنا سامنا اٹلانٹک میں واقع ایک جزیرے پر ہوا تھا جب میں وہاں منعقدہ کانفرنس میں شریک تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ کارپوریٹوکریسی کسی مہارت سے اس مخالفت یعنی غیر سرکاری تنظیموں کو خوف کے ذریعے خاموش کرنے میں کامیاب ہے جو ان کے طرز عمل کو بدلنے کیلئے کافی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنے اندیشوں کا سامنا کرنا

۲۰۰۶ء میں جب میں کارپوریشنز پر غیر سرکاری تنظیموں کے اثرات کا جائزہ لے رہا تھا تو میں نے ۲۳ مردوں اور عورتوں پر مشتمل ایک جماعت میں مارتھاس وائن یارڈ کے جزیرے پر شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ہم نے کئی دن تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرنا تھا۔ ان تمام بحث ومباحثے نے مجھے اس غصے کی یاد دلائی تھی جو دور انقلاب میں نوآبادکاروں میں پایا جاتا تھا۔ بہت سے آبادکار برطانوی طاقت سے خوفزدہ تھے، بہت سے ٹوریز اور وفادار (Torics & Loyalists) نوریز اور لوالسٹ بھی کسی سخت فیصلے کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ وہ ان کا خیال تھا ''برطانوی سلطنت بہت بڑی اور طاقتور ہے۔ ہم یا ان سے ہار جائیں گے اور پھر ان کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں اذیتوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔'' ۲۰۰۶ء میں منعقدہ ان مباحثوں کا پورا خیال میساچوسٹس کے ساحل سے کچھ دور بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری اصل دنیا کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہو۔

کسی دور میں وہیل پکڑنے کیلئے جہازوں کے بڑے بڑے بیڑے وائن یارڈ پر رکا کرتے تھے اور آج کل کی مشرق وسطیٰ اور امیزون کی اٹھارہویں صدی کی برابری کرنا، یہ علاقہ اپنی یہ وجہ شہرت کھو بیٹھا ہے کیونکہ یہ دونوں علاقے موجودہ حالات میں امریکا کی صنعتوں اور گھروں کیلئے تیل اور لکڑی کے سب سے بڑے وسیلے ہیں جیسے جنگلات اور صحرا آج کل برباد کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت وہیل کی پوری آبادی کو نیست ونابود کر دیا گیا تھا۔ وہ تو قریبی پینسلوینیا کے علاقے میں تیل کے ذخائر دریافت ہو گئے جس کی وجہ سے وہیل سے حاصل کیے جانے والا تیل کا سستا متبادل منظر عام پر آ گیا تھا اور وہیل سے تیل حاصل کرنے کی پوری صنعت ختم ہو کر رہ گئی۔ حالیہ عرصے میں یہ جزیرہ دو مشہور خاندانوں کلنٹن اور کینیڈی اداکاروں، ادیبوں اور موسیقاروں کی آماجگاہ کی حیثیت سے جانا جانے لگا تھا۔ مشہور زمانہ فلم ''جاز'' بھی اسی مقام پر فلمبند ہوئی تھی۔ ۲۰۰۶ء میں جب میں یہاں آیا تھا تو اس وقت یہ جگہ اس ماحولیاتی عدم توازن کا عکس دکھائی دیتی تھی جو ہماری ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ ہرنوں کی کثیر آبادی ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ ہرنوں

کے جسموں میں پائے جانے والے طفیلی کیڑوں سے پھیلنے والی بیماری ''لائمے'' کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بہت سے رہائشی اس بیماری سے متاثر ہوئے تھے۔ نتیجتاً کم لوگوں کو سرسبز میدانوں اور سحر انگیز جنگلات کی طرف جانے سے منع کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا ''انہیں دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کے آرام دہ ماحول میں بیٹھ کر ان کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوا جائے۔''

اس اجتماع میں شریک ۲۳ حضرات کی اکثریت ان مختلف غیر سرکاری تنظیموں کی نمائندگی کر رہے تھے جو ہمارے امیر کبیر مخیّر میزبان کے چندے سے چلا کرتی تھی۔ یہ تمام تنظیمیں ماحولیاتی تحفظ، انقطاع کے خطرے سے دوچار جاندار، انسانی حقوق اور صحت اور جنس کے متعلق مسائل کے خاتمے کیلئے وقف تھیں۔

میں نے مختلف مواقعوں پر شرکاء سے درخواست کی تھی کہ وہ کارپوریشنز کو راہ راست پر لانے کے مقصد کیلئے بھی وقت نکالیں اور اس سلسلے میں رین کی مثال پیش کیا کرتا تھا مگر ان کے ردعمل پر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے ''کارپوریشنز کے افسران پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہم کارپوریٹ اداروں کی دنیا سے دور رہتے ہیں۔ یہ کافی بدعنوان لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بہت طاقتور لوگ ہوتے ہیں ہمیں شکست بھی دیں گے اور سزا بھی۔''

''بہت خطرناک کام ہے۔ بہتر یہی ہے کہ خطرہ مول نہ لیا جائے۔''

میں نے ایک دن انہیں کہا ''دیکھیں آپ تمام لوگ کسی نہ کسی اہم کام میں شامل ہیں مگر ایک طرح سے آپ لوگ صرف ابتدائی طبی امداد فراہم کر رہے ہیں جبکہ ہم تو جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہیں تو ہمیں ابتدائی طبی امداد کی ضرورت بھی ہے لیکن اگر ہم نے بیماری کا علاج نہ شروع کیا تو جو اصل مسائل کی جڑ ہے تو پھر شاید ساری دنیا کی ابتدائی طبی امداد کے طریقے بھی بچا نہ پائیں گے۔ آپ یہ صحیح کہتے ہیں کہ آپ کارپوریشنز کی بے ایمانیوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتے ہیں مگر خدا کیلئے ان کا سدباب کرنے کیلئے کوئی حکمت عملی تشکیل دیں۔''

ایمنسٹی انٹرنیشنل برائے مغربی خطہ کی ڈپٹی ڈائریکٹر مونا سیڈینا نے بتایا ''ایمنسٹی کے ادارے میں اس بات کا احساس پایا جاتا ہے۔ ۱۵۰ ممالک کے ۸ ملین اراکین کارپوریشنز کی طاقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم تو دراصل بدترین کارپوریشنز کے بھی حصص خریدتے ہیں تاکہ ہم ان کی تقاریب میں شریک ہو سکیں اور حصص کے مالکان ہونے کی حیثیت سے قراردادیں، انقل

کراسکیں جوان اداروں کوان تمام ممالک میں جہاں ان کا کاروبار ہے انسانی حقوق کے حوالے سے حکمت عملیاں شروع کرنے پر مجبور کرسکیں۔''

مونا کی بات کرنے سے مجھے بہت ہمت ہوئی۔

کچھ دن بعد جب ہم کھڑکی کے کنارے بیٹھے اٹلانٹک سے جدا ہوتی ہوئی ایک بڑی جھیل کو دیکھ رہے تھے تو مونا نے مجھے ٹونی کروز کا قصہ سنایا۔ ایمنسٹی کے کارپوریٹ ایکشن نیٹ ورک کو آرڈینیٹر برائے کیلی فورنیا ٹونی کروز نے گوگل کے مشترکہ بانی سرگی برن اور لیری پیج اور یاہو کے چیف ایگزیکٹو ٹیری سیمل اور جیری یانگ کو حصص مالکان کیلئے منعقدہ تقاریب میں براہِ راست تبادلہ خیال کیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ ان اداروں کو چین میں اظہار رائے آزادی کو دبانے والی طاقتوں کی مدد بند کرنی چاہئے۔ ساتھ ہی ہمارے چالیس ہزار کے قریب کارکنوں نے ان اداروں کے خلاف آن لائن مہم میں حصہ لیا تھا۔ اس نے بتایا ''اب تک ہم ان اداروں کو از خود لئے گئے اقدام لینے پر مجبور نہیں کر پائے ہیں مگر ہم نے ''بزنس ویک'' میں ایک مضمون چھپوایا تھا اور اے بی سی ٹیلیویژن کے مراکز سے کچھ وقت حاصل کرلیا تھا۔ ہمیں یقین ہے ہماری محنت رنگ لائے گی۔ دباؤ سے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔''

ایمنسٹی کے پروگرام برائے انسانی حقوق اور کاروبار کی ڈائریکٹر میلا روز بیتھل نے مجھے فون پر سب کچھ اس وقت بتایا جب میں نے اس سے کئی دن بعد رابطہ کیا تھا۔ اس نے کہا ''رین نے قابل ستائش خدمت انجام دی ہے۔ ان کا کام بہت دشوار تھا۔ انہیں درخت کاٹنے اور ان کی نقل وحمل پر چند مخصوص پابندیوں کو قبول کرنے کیلئے انتظامیہ کو مجبور کرنا تھا۔ آپ کو ہوسکتا ہے یہ محسوس ہو کہ ہماری حصص کے مالکان کی جانب سے دائر کردہ قراردادوں کا طریقہ نسبتاً آسان ہے اور ادارے انسانی حقوق کا احترام کرنے کی ان عزائم کو خوش دلی سے قبول کرلیں گے جس میں سب کی بہتری ہے مگر اس کے باوجود ہمیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایکسون موبل اس کی ایک واضح مثال ہے۔''

تیل کے کاروبار کا دیو، دنیا کی سب سے بڑی انرجی کی کمپنی کا مختلف ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی شرمناک تاریخ موجود ہے۔ ایمنسٹی نے کیمرون، چاڈ، نائیجیریا اور انڈونیشیا پر توجہ مرکوز کردی تھی۔ میلا نے بتایا کہ ''ہم نے دیکھا کہ ایکسون موبل کے طریقہ کار پر تنقید کرنے کی صورت میں وہ کس قدر سختی سے ہماری کوشش کو دبانے میں مصروف عمل رہے تھے۔

ہم نے اپنے اراکین کے ذریعے ان کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کو لاتعداد پوسٹ کارڈز ارسال کئے تھے۔ ہم نے معاینوں کا انتظام کیا، تربیتی کورسز کرائے اور مظاہروں کا راستہ اپنایا۔ ویلنٹائن ڈے پر ہم نے انہیں کارڈ بھجوائے جس میں ان سے انسانی حقوق کی پابندی کرنے کی درخواست کی گئی تھی اور اس سلسلے میں ہم نے اپنے ہم خیال حصص کے مالکان سے اتحاد قائم کئے تھے۔

اے ایف ایل، سی آئی او، ٹیچرز ریٹائرمنٹ سسٹم آف امریکہ، بوسٹن کامن ایسٹ مینجمنٹ، الائیڈ انڈسٹریل، کیمیکل اینڈ انرجی ورکرز انٹرنیشنل یونین (پیس)، انٹرفیتھ سینٹر آن کارپوریٹ ریسپونسیبلٹی اور والڈن ایسیٹ مینجمنٹ کے ساتھ مل کر ایکسون موبل کو ۱۹۹۸ء کے بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن کے کام کی جگہ کے حوالے سے وضع کردہ بنیادی اصولوں کے اعلامیہ کے مطابق احکامات کی پابندی کے حوالے سے ایک رپورٹ مرتب کر کے دی گئی تھی۔ یہ قرارداد دائر کرنے کے بعد ہمارے اتحادی اور ہم کارپوریٹ عہدیداران سے ملاقات کی۔ ایکسون موبل نے اپنے بیان میں آئی ایل او اور اعلامیہ کی حمایت کی اور اسے کارپوریٹ سٹیزن شپ رپورٹ میں شامل کرلیا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں حصص مالکان کی سالانہ ملاقات میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے چیئرمین چپ پٹس نے واضح کیا تھا کہ اتحادی اراکین اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ''ان وعدوں کے پورا کرنے کی ذمہ داری کمپنی پر لاگو ہوتی ہے۔''

میلا نے اعتراف کیا کہ ''ہمیں وہ سب حاصل نہ ہوسکا جس کی ہمیں خواہش تھی مگر ہم نے ایک اچھی ابتداء کردی تھی۔ ہماری تنظیم کو اس سارے معاملے سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ ہم ان لوگوں کو بدل کر رہیں گے ایک وقت میں ایک کمپنی پر محنت کرنا ہی بہتر ہے۔''

مارتھا وائن یارڈ پر ہونے والی ملاقاتوں نے مجھے بے حد پریشان کردیا تھا کیونکہ وہاں موجود حضرات کارپوریشنز کی طاقت سے خائف تھے لیکن میرے دل میں ایمنسٹی اور ایسی دوسری تنظیموں کیلئے بہت احترام پیدا ہوگیا تھا بالکل ان امریکیوں کی طرح جو بنکر گل کے محاذ پر اپنے خوف سے نبرد آزما تھے۔ کارپوریشنز کے خلاف صف آراء ہوکر انہوں نے کافی امیدافزا کام کیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ مونا کی بات چیت سن کر کچھ لوگ ضرور اس جنگ کیلئے تیار ہوگئے ہوں گے۔

باب نمبر: ۶۰

وال اسٹریٹ کو مالی طاقت سے تبدیل کر کے رکھ دینا

"موو آن ادارے کے ماتحت کام کرنے والی تنظیمیں اصل امریکی شہریوں کو سیاست کے عمل میں واپس لے کر آئیں گی۔ ۳۔۳ ملین اراکین جو پورے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں بڑھئی سے لے کر گھریلو خواتین اور تجارتی ماہرین بھی شامل ہیں سب مل کر ہمارے ملک کے باغیوں کے ترقی کے خواب کو سچ کر دکھائیں گے۔ موو آن ایک ایسا ادارہ ہے جو مصروف مگر فکر مند شہریوں کے خیالات کو ایک ایسے نظام میں آواز دینا چاہتے ہیں جس کو بے تحاشہ دولت اور طاقتور میڈیا چلا رہا ہے۔"

موو آن ویب سائٹ

ستمبر ۱۹۹۸ء میں کلنٹن کے مواخذے میں قوم کے قیمتی وقت کے ضیاع پر ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے موو آن کے بانی جون بلیڈز اور ویس بوائڈ نے مہم کا آغاز کیا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک آن لائن عرضداشت دائر کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ کلنٹن کو الزامات کا نشانہ بنانے کے بجائے زیادہ اہم مسائل پر بات کی جائے۔ پہلے ہی چند دنوں میں لاکھوں لوگوں نے عرضداشت پر دستخط کر دیے تھے۔ اس کے بعد سے موو آن نے انٹرنیٹ کو اظہار رائے کی آزادی کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح دیگر مہموں میں موو آن مسائل کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔

☆ دارفر، سوڈان میں نسل کشی کا خاتمہ

☆ ایسے قوانین منظور کیے جائیں جس کے مطابق ووٹنگ مشینز پر تفصیلات کاغذ پر درج کی جائیں۔

☆ سیاسی مہموں کیلئے حکومت اخراجات برداشت کرنے کے قوانین وضع کیے جائیں تاکہ امیدواروں کا کارپوریٹ حلقے سے تعلق رکھنے والے چند دن چندہ دینے والوں پر انحصار ختم کیا جا سکے۔

☆ امریکہ کے زیر اثر جیلوں میں تشدد پر پابندی لگائی جائے۔

☆ شمسی چھتوں کو پبلک یوٹیلیٹی کمیشن کی وضع کردہ پالیسیوں کا حصہ بنایا جائے۔

☆ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی امریکی دھمکی کے خطروں کے حوالے سے عوام میں شعور پیدا کیا جائے۔

☆ معاشی تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔

☆ چند مخصوص کارپوریشنز میں میڈیا کا ارتکاز پر پابندی لگائی جائے۔

موو آن کے ایک ایگزیکٹو ڈائریکٹر ایلی پاریسر نے مجھے آگاہ کیا "عوام سرد مہری کا شکار نہیں ہیں بلکہ وہ یہ مانتے ہیں کہ وہ اکیلے کوئی بڑا معرکہ سرانجام نہیں دے سکتے اور اسی وجہ سے موو آن واشنگٹن میں لوگوں تک بات پہنچانے کیلئے سرگرداں ہے۔ ہم سب مل کر تیل اور ادویات فروخت کرنے والے اداروں اور واشنگٹن میں ان کے حلیفوں کے خلاف ایک ایسی پالیسی بنانا چاہتے ہیں جو دونوں فریقین کیلئے مددگار ثابت ہو۔ ایک ایسی حکمت عملی ترتیب دی جائے جس سے سب کو فائدہ ہو نہ کہ صرف چند کارپوریٹ اداروں کو ہی فائدہ حاصل ہو سکے۔"

رین، ایمنسٹی اور موو آن جیسی تنظیمیں مظاہروں، ریلیوں، سڑک پر ڈرامے پیش کیے جانے کے عمل، اخباروں میں اشتہارات چھپوانا، بینر لگوانا، چیف ایگزیکٹو کو پوسٹ کارڈ ارسال کرنا، حصص کے مالکان کی طرف سے قراردادیں منظور کرنا، تقاریر، مدیران کو خطوط، سیاسی نمائندوں کا مختلف حلقوں میں دوروں کا پروگرام، انٹرنیٹ پر عرضداشت پیش کرنا اور دیگر ایسی تراکیب کے ذریعے ایسے مسائل کی جانب توجہ مبذول کرائی جاتی ہے جو تبدیلی کے عمل کو ممکن بنا سکیں اور ساتھ ہی کارپریٹوکریسی کو یہ پتہ چل سکے کہ ان کے حربے اب قابل قبول نہیں ہیں۔ بہت سے زاویوں سے ان کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ افریقی امریکی آبادی کا ہے۔

کسی بھی اور ایک گروہ سے زیادہ افریقی امریکی پرامن مظاہروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ سارا سلسلہ خانہ جنگی سے پہلے شروع کیا گیا تھا اور حالیہ عرصے میں یہ سدرن کرسچن لیڈر شپ کانفرنس، نیشنل ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل اور دیگر سول تحریکوں کی وجہ سے پروان چڑھا تھا۔ امریکہ میں غلامی کی کہانی اور اس کو ختم کرنے کی جدوجہد اور مساویانہ حقوق کا حصول اور ان غلاموں کی اولادوں کی بہتر دیکھ بھال کا قصہ بہت قدیم، وسیع، خوفناک، مایوس کن اور روح افزا جیسے عوامل سے بھرپور ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اسی تحریک کی وجہ سے سول نافرمانی کا نظریہ وجود میں آیا تھا لیکن ہم میں سے کافی شہری اس حقیقت سے واقف

نہیں ہیں کہ اس کی قیادت ہی وال اسٹریٹ کو کارپوریٹوکریسی کا آلہ کار بنانے میں کافی فعال تھی۔
افریقی امریکی نہ صرف اپنے مظاہروں اور ریلیوں کیلئے خاص حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے اس کردار کو بھی اہم سمجھتے ہیں جس نے یہ باور کرایا تھا کہ مالی طاقت کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔انہوں نے ایک ایسے عمل کی بنیاد ڈالی تھی جس کی پیروی کئی این جی اوز نے کی تھی۔

۱۹۹۶ء میں یہ الزامات منظر عام پر آئے تھے کہ ٹیکسا کو کے ملازمین نسلی جملے استعمال کرتے ہیں۔پادری جیسی جیکسن نے ٹیکسا کو کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا۔اس نے اپنے ایک دوست جو نیویارک کی ریاست کے مالیاتی عہدیدار ایچ کارل میک کال سے رابطہ کیا اور انہیں ہڑتالوں میں شامل ہونے کی درخواست کی جس پر میک کال نے جواب دیا ''جیسی جب آپ کروڑوں کے حصص مالک ہوں تو پھر آپ ہڑتالیں نہیں کرتے ہیں۔'' کیونکہ میک کال نیویارک میں سرمائے کا کرتا دھرتا تھے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ دباؤ بڑھا سکتے ہیں۔اس نے ٹیکسا کو کے چیئرمین پیٹر بیجور کو ایک خط میں کمپنی کی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے ملازمین کے حوالے سے حکمت عملیوں پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔آخر میں میکسیکو کو بیرون عدالت ۱۷۶ملین ڈالر دے کر معاملہ رفع دفع کرنا پڑا تھا اور ساتھ ہی اس نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ افریقی امریکی ملازمین کی تنخواہوں میں کافی اضافہ کر دیں گے۔

اس مہم کی کامیابی نے جیکسن کو وال اسٹریٹ کے منصوبہ کی بنیاد ڈالنے کا احساس دلایا تھا۔
یہ ایک مالی حربہ تھا جس کے ذریعے وہ حصص کی ملکیت کو تخلیقی اور فعال انداز میں استعمال کر کے افریقی امریکی حصص کے مالکان میں شعور پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا۔ان تراکیب پر عمل کر کے جیکسن اور ان کے ساتھیوں نے کوکا کولا، ۷الیون، شونیز، کورس اور دیگر کارپوریٹ طاقتوں کی حکمت عملیوں میں تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جیکسن نے اس عمل کی وضاحت کی ''جب آپ حملہ آور کی حیثیت سے کسی ملاقات میں شریک ہوتے ہیں تو آپ کا اس ادارے پر ایک خاص حق ہوتا ہے اور اسی لئے ہم حصے پیدا کرنے والے حصص خریدنے والے بن چکے ہیں۔''

اس نظریے کو دوسرے کئی اور سرمایہ داروں نے بھی درست سمجھ کر اپنانا شروع کر دیا۔کئی ایسے حصص مالکان جو معاشرے کی طرف اپنی ذمہ داری کو سمجھتے تھے پنشن اور دیگر سہولیات کے حصول کیلئے ایسی کارپوریشنز کے خلاف ڈٹ گئے جو ماحولیاتی اور انسانی حقوق کے قوانین پر

عملدرآمد نہ کرنے سے انکار کر دیتی تھیں۔جب کبھی امریکہ کے مختلف حصوں میں جانا ہوتا ہے تو میں نے اکثر یونیورسٹی کے طالب علموں کو کارپوریشنز کے خلاف مزاحمت کرتا ہوا دیکھا ہے۔کئی ایک اداروں میں طلبہ میں ان الزامات پر شدید اشتعال پایا جاتا ہے کہ کوکا کولا کئی ممالک میں اپنے ملازمین سے نہایت بے انصافی پر مبنی رویہ روا رکھتا ہے۔کئی ایک ایسے الزامات بھی سامنے آئے ہیں کہ وہ (کوکا کولا) کولمبیا میں یونین رہنماؤں کو قتل کرنے کیلئے کرائے کے قاتلوں کا استعمال تک کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔جولائی ۲۰۰۶ء میں ٹی آئی اے اے، سی آر اے ایف سوشل چوائس اکاؤنٹ نے کوکا کولا کو اپنی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ٹی آئی اے اے، سی آر اے ایف جو تعلیمی، طبّی اور ثقافتی شعبوں میں ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمین کو سہولیات فراہم کرنے کا ادارہ ہے اس کے چیف ایگزیکٹو ہربرٹ ایلیسن نے سی آر اے ایف، کالج ریٹائرمنٹ ایکویٹیز فنڈ کی سالانہ تقریب میں اس اخراج کا اعلان کیا تھا جس کی وجہ سے کوکا کولا ۱۲ء ملین ڈالر کے حصص سے محروم ہو گئی تھی۔ٹی آئی اے اے، سی آر ایف ایف کے اس فیصلے کی اصل وجوہات کوکا کولا کی سمندر پار بوتلیں بھرنے کے کارخانوں پر مزدوروں کے حقوق کے تحفظ میں ناکامی، سوڈے سے بننے والی مصنوعات کو بچوں کیلئے قابل استعمال ہونے کی تشہیر اور پانی کے استعمال میں ماحولیاتی اقدار کا خیال نہ رکھنا شامل تھیں۔

ایک ایسی منفرد ترکیب جس میں معاشی حیثیت کو استعمال کیا گیا تھا ایک غیر سرکاری تنظیم نے وضع کی تھی جو امیزون کے قبائل کے ساتھ کام کرتی تھی

باب نمبر:۶۱

تیسری دنیا کے قرضے ادا کرنا

پاچاماما الائنس ۱۹۹۴ء میں اس تعلیمی دورے کے دوران وجود میں آئی تھی جو میری قیادت میں امیزون گیا تھا۔ اس دورے کے آخر دن شرکاء نے امیزون کے قبائل کو تیل کی کمپنیوں سے اپنی زمینیں بچانے کے لئے ۱۸،۰۰۰ ڈالرز کا عطیہ دیا تھا۔ بل ٹوئسٹ جولائنی ٹوئسٹ کا شوہر ہے جو ایک این جی او کے لئے چندہ جمع کیا کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایک دفعہ گوئٹے مالا بھی جا چکا ہے اس نے اس مہم کا انتظام سنبھالنے کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور بعد میں اس تنظیم کے بورڈ کا فعال چیئر مین بن گیا تھا۔ ۲۰۰۶ء تک پاچاماما الائنس ۱.۵ ملین ڈالرز مالیت کی تنظیم بن چکی تھی۔ اس نے مقامی آبادیوں کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے اور ملاقات کرنے کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے دوطرفہ ریڈیوز اور ایک جہاز بھی خرید لیا تھا۔ انہوں نے ایسے وکلاء کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں جن کے ذریعے وہ تیل کی کمپنیوں کو مقامی لوگوں کی زمینوں پر مداخلت کرنے کو قانونی کارروائیوں کے ذریعے روک سکیں۔ اس تنظیم نے کئی ایسی فلمیں بنائی تھیں اور ورکشاپس کا اہتمام کیا تھا جن کے ذریعے امریکی شہری اپنی صلاحیتوں کے ذریعے تبدیلی کے اس عمل میں شامل ہو سکیں لیکن ان کی اصل کامیابی اس منصوبے کا اجراء تھا جس نے تہلکہ مچا دیا تھا۔

ایک دن جب ہم لوگ ایکواڈور کے امیزون جنگلات سے گزر رہے تھے تو بل ٹوئسٹ نے مجھ سے پوچھا ''کیا ہو اگر ہم ان قد آور درختوں کی طاقت کے ذریعے ایکواڈور کے غیر ملکی قرضے ادا کر دیں۔''

ہم کا پوک کہ ایک بڑے سے درخت کے سائے تلے بیٹھ گئے اس کی بڑی بڑی جڑیں تنے سے ہوتی ہوئی زمین میں ایسے داخل ہو رہی تھیں جیسے قرون وسطیٰ کے دور میں یورپ کے چرچ کے پشتے ہوا کرتے تھے۔ ہم لوگ وہیں بیٹھ گئے اور اس حقیقت پر غور کرنے لگے کہ بارانی جنگلات ہم سب کے لئے کتنے ضروری ہیں۔ یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں آکسیجن بناتے ہیں، عالمی موسم پر اثر انداز ہوتے ہیں، صاف پانی کی فراہمی کا باعث بنتے ہیں۔ ہزاروں طرح کے

پودے، جانور، کیڑے، پرندے اور مچھلیاں آباد ہیں۔ ان ہی جنگلات کا درختوں سے کینسر، ایڈز اور دوسری مہلک بیماریوں کے لئے دوائیں تیار ہوتی ہیں۔ پھر ہماری گفتگو کا رخ ایکواڈور کے غیر ملکی قرضوں کی جانب مڑ گیا جو تقریباً اس کے سالانہ قومی بجٹ سے دوگنا ۱۸ بلین ڈالر تھے۔ یہ لاطینی امریکہ کے کسی بھی ملک کے سب سے زیادہ قرضوں میں سے ایک اہم ملک تھا۔ ان قرضوں کی ادائیگی پر جو رقوم خرچ ہوتی ہیں ان سے صحت، تعلیم، رہائش اور دیگر اہم سماجی اور ماحولیاتی منصوبوں کا اجراء ممکن ہو سکتا تھا۔

میں نے اسے آگاہ کیا کہ ایکواڈور کا زیادہ تر قرضہ معاشی تباہ کاروں کی عیاریوں کا نتیجہ تھا جو تیل کی امریکی کمپنیوں، تجارتی اداروں اور مقامی بدعنوان افسروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے عمل میں لائی گئی تھیں اور اس طرح ایک بار پھر عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی حکمت عملیوں نے ایکواڈور کے عوام کے خون کے عوض کارپوریٹوکریسی کے مفادات کو فائدہ پہنچایا تھا۔

بل مخاطب ہوا ''اور اب ایکواڈور کے پاس ان تمام قرضوں کو ادا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ ہماری یعنی امریکہ کی تیل کی کمپنیوں کو خام تیل فروخت کرے اور اس وجہ سے بارانی جنگلات کی تباہی کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ وہ یکدم ایک چمکتی ہوئی نیلے رنگ کی تتلی کو دیکھ کر رک گیا جو ہمارے قریب ہی منڈلا رہی تھی۔ پھر وہ بل کے کندھے پر جا بیٹھی اور پھر وہاں سے لال بروملیاڈس کے پودوں پر لہراتی ہوئی بیٹھ گئی۔ بل پھر بولا ''میرا خیال یہ ہے کہ ان تناور درختوں کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا جائے جس سے ساری دنیا کو یہ پیغام پہنچے گا کہ یہ جنگلات دنیا کے لئے تیل سے زیادہ قیمتی ہیں۔ ہم دراصل اس قرض کے بدلے خطرات کا ادل بدل کریں گے۔ ایکواڈور اس دولت کی حفاظت کرے گا جو ساری دنیا کے لئے اہم ہے اور اس کے بدلے ہم قرضوں سے چھٹکارا پائیں گے۔

میں نے کچھ سوچ کر کہا ''یہ ایک اچھا خیال ہے لیکن اس کے لئے بہت رقم درکار ہوگی۔''

''یقیناً''۔ یہ کہہ کر بل ایسے مسکرایا جیسے اس نے اس بارے میں پہلے سے سوچ رکھا ہو اور وہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کافی پراعتماد اور سنجیدہ بھی تھا۔ اس نے اپنی تعلیم اسٹینفورڈ یونیورسٹی سے مکمل کی تھی اور اس کو انتظامی مشاورت، آلات کی ٹھیکیداری اور مالیاتی خدمات سے جڑے اداروں کا بھی کافی تجربہ تھا۔

یہ بات چیت ۲۰۰۱ء میں ہوئی تھی۔ اگلے چند سال بل نے اپنی تمام تر توانائیاں ان خواب

میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے صرف کردی تھیں۔ اگست ۲۰۰۶ء میں TPA کے نمائندے نے ایکواڈور کے وزیر ماحولیات اور وزیر معاشیات اور مالیات کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ امیزون میں ''گرین پلان'' نافذ کرنے کے لئے امکانات پر تحقیقاتی رپورٹ مرتب کریں۔ اس معاہدے کے ذریعے اس خطے کی دیرپا ترقی کے لئے اخراجات کا حصول ممکن ہوسکے گا اور ساتھ ہی تیل کی تلاش میں ہونے والے منفی اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔ بارانی جنگلات کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے گا اور مستقبل میں ہونے والے ممکنہ سائنسی فوائد کی آگاہی حاصل کی جائے جن سے پودوں کی طلب کا واضح امکان موجود ہے۔ اگر ان تمام فائدوں کی قدر کا اندازہ لگایا جائے تو اس کے عوض ایکواڈور کے ماحول کے تحفظ کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر ایکواڈور کے جنگلات کے کسی مخصوص علاقے سے حاصل ہونے والے فوائد کی مالیت ایک بلین ڈالر ہے اور اگر ایکواڈور ان جنگلات کی حفاظت کی ذمہ داری لیں اور اسے طبی اور دیگر محققین کو مفید انداز میں استعمال کرنے کی اجازت دے اور اس کے عوض ایکواڈور کے ایک بلین ڈالرز کے قرضے معاف ہوسکتے ہیں اور اس نظام کی افادیت میں اضافہ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے کہ اگر امدادی ادارے اور قرضہ دینے والے ممالک اس بات کا خیال رکھیں کہ تیل کی کمپنیاں اور جنگلات کو نقصان پہنچانے والے دیگر عناصر کا اس مخصوص علاقے میں داخلہ ممنوع ہوگا۔

TPA کے رکن کی حیثیت سے میں نے ۱۹۹۴ء میں ایک معمولی واقعہ سے شروع ہونے والی اس تنظیم کو آج ایک ایسی طاقت میں بدلتے دیکھا ہے کہ جو ایکواڈور کی حکومت اور تیل کی صنعت کے دیوؤں سے ٹکر لینے کو تلی بیٹھی ہے۔ بل نے مجھے حالیہ ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ ''گرین پلان پہلا قدم ہے۔ قرضوں سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لئے نت نئی تراکیب ترتیب دے کر ہم ایک اور نمونہ وضع کرنا چاہتے ہیں جسے دوسری کئی غریب ممالک اپنی زمینوں کو استحصال سے بچانے کے لئے استعمال کرسکیں گے اور ہم اس منفرد تراکیب کے ذریعے دیرپا اور انصاف کے اصولوں پر مبنی ترقی کے لئے رقوم جمع کرنا چاہتے ہیں۔

ساتھ ہی TPA نے پانچ ممالک میں تقریباً تین سو کارکنوں کو ''خواب دیکھنے والوں کی بیداری'' کے عنوان سے سیمینارز میں تربیت دی تھی تاکہ عوام روزمرہ کی زندگی میں لیے جانے والے فیصلوں، ترجیحات اور سرگرمیوں کے ذریعے دنیا کے حالات پر اثر انداز ہوسکیں۔ اس حکمت عملی کا اصل مقصد یہ ہے کہ چند کارکن اگلے چند برسوں میں کروڑوں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاسکیں

اور یہ لائنی ٹوئسٹ کے مستقبل کے حوالے سے دیکھے گئے خواب کا ایک حصہ ہے۔'' ہم ان امراض کی علامات جیسے کہ بارانی جنگلات کی تباہی اور ناانصافی پر مبنی قرضے کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں مگر ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہمیں اصل بیماری کا بھی علاج کرنا ہے جو دراصل اس دنیا کو مادہ پرستی کے آئینے سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

لائنی، بل اور میں اکثر اس سارے بحران کی اصل بنیادوں پر وار کرنے کے خیال پر بھی بحث کیا کرتے ہیں اور ایسا کرنے کے لئے ہمیں اس تیسرے سوال کا جواب دینا ہوگا جو ہمیں کتاب کے اس حصہ کے آغاز میں ہم سے پوچھا گیا تھا کہ ہم اپنے اقدامات کو واجب قرار دے سکتے ہیں۔

امریکی نوآبادکاروں کے پاس رہنما اصول موجود تھا۔ وہ جبر کے مخالف تھے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشاں۔ ہمارے دور میں بھی یہی اصول مشعل راہ ہیں مگر یہ دیکھتے ہوئے آج دنیا میں کئی مختلف نظریے اور روایتیں موجود ہیں ہمیں شاید ایک زیادہ مستند اور ہمہ جہت مقصد وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ جبر، آزادی اور خودمختاری جیسے نظریات کی ایک نئی تشریح وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ ہم نے کتاب کے ابتدائی حصوں میں پڑھا کہ افریقہ میں بہت سے لوگ امریکہ کو ایک غاصب کے روپ میں دیکھتے ہیں یا لاطینی امریکہ، ایشیائی اور مشرق وسطیٰ میں عوام کو اس بات کا یقین ہے کہ امریکہ ان حکومتوں کی حمایت کرتا ہے جو ہماری خودمختاری اور آزادی کو پامال کرتی ہیں تو پھر ہم اس تیسرے سوال کا جواب کیسے دیں گے؟ ہم کیسے ان کو یقین دلائیں کہ ہم اپنے اخلاق، مذہبی اور فکری نظریات ان پر مسلط کرنے کے بجائے کچھ ایسا تخلیق کرنا چاہتے ہیں جو سب کے لئے اصل اور دیرپا فائدے کا باعث بن سکے۔

پانچ مشترکہ اقدار

۲۰۰۶ء کی ایک روشن صبح تھی۔ میں نے ایک دن پہلے یونیورسٹی آف کولوراڈو میں تقریر کی تھی اور اب سارہ میک کیون اور جوزف پہانے میرے ہوٹل بولڈر سے لینے آئے ہوئے تھے۔ یہ دونوں یونیورسٹی آف ڈینور میں زیر تعلیم تھے اور دونوں نے اپنے ادارے میں میرا خطاب کرانے کے لئے انتھک محنت کی تھی۔ سارہ انٹرنیشنل اسٹڈیز اور پولیٹیکل سائنس کی طالبہ تھی اور لاطینی امریکہ، افریقہ اور جنوبی ایشیا میں کچھ وقت گزار چکی تھی جبکہ جوزف کا دھیان انٹرنیشنل اسٹڈیز، ہسپانوی زبان اور آرٹ میں تھا۔ وہ چھ ماہ ارجنٹائن میں رہ چکا تھا جہاں وہ مینڈوزا کی کیویو یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا تھا۔

میں جوزف کا ساتھ گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ سارہ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی کیونکہ چٹانی علاقہ پیچھے رہ گیا تھا اس لئے میں ڈینور تک ایک پرسکون سفر کی توقع کر رہا تھا۔ ان کے ذہنوں میں وہی سوالات منڈلا رہے تھے۔ انہوں نے گھر سے میری معاشی تباہ کاری کی حیثیت سے گزارنے والی زندگی اور اپنے رویوں میں حالیہ تبدیلی کے حوالے سے بے مثال سوالات کئے۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ ان کی اس دنیا کے بارے میں کیا رائے ہے جو ہماری نسل انہیں منتقل کر رہی ہے۔

سارہ نے جواب دیا ''ہمیں خوف محسوس ہوتا ہے، ہم عمر کے ایسے دوراہے پر ہیں جب ہم چیزوں کا جلد اثر قبول کر لیتے ہیں۔ آپ کی عمر کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم جو بیس سال کی عمر میں بن جائیں گے تو وہی ہم اپنی بقیہ زندگی میں بھی کرتے رہیں گے۔ اسی طرح کے الفاظ ہمیں خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ ہم اپنے آنے والے وقت کی بے یقینی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔

جوزف نے مزید کہا کہ ''ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں آگے نہیں بڑھنا چاہتے لیکن ہم اس دوڑ کا حصہ نہیں بننا چاہتے اور نہ ہی اپنی عمر کے اگلے چالیس برس مادہ پرستی کے نہ ختم ہونے والے زینے پر چڑھنا چاہتے ہیں کہ روز روز ملازمتیں بدلتے رہیں اور درمیانی عمر میں تھک کر گر جائیں۔''

اسی دن شام میں ہم لوگ ڈینور کے ایک ریسٹوران پہنچے تو وہاں ہماری ملاقات کچھ اور طالب علموں اور یونیورسٹی آف ڈینور میں فائز تجربہ کار پروفیسر رابرٹ سے ہوئی جو میری طرح

ساٹھ کی دہائی میں تعلیمی مشن میں رضاکار ہوا کرتے تھے۔ طالب علموں کے لئے وہ نہ صرف ایک قابل استاد تھے بلکہ ایک ایسے انسان بھی تھے جو اپنے قول کے پکے اور قابل تقلید مثال تھے۔

پروفیسر رابرٹ نے مجھے کہا ''یہ بچے حیرت انگیز ہیں۔ وہ اس دنیا کی بدصورتیوں کو دیکھتے ہیں اور اسے بدلنے کے لئے پرعزم ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام انہیں اس گلے سڑے معاشرے کا غلام بنانا چاہتا ہے۔ میرے اور آپ کے جیسے لوگ انہیں اس گرداب سے نکال کر ان کی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں استعمال کرنے کی ترغیب دینی چاہئے تاکہ بہت سے ذہین انسان اپنی منزل پا سکیں۔

اس شام میں نے کئی طالب علموں کو ورثے میں ملنے والے تباہ شدہ نظام کے متعلق سنا تھا۔ انہوں نے رین ایمنسٹی، موو آن اور پاچاماما الائنس اور دیگر این جی اوز سے ملنے والی اس امید کا بھی تذکرہ کیا تھا جو ان کی رہنمائی کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ میں ان کی قوت ارادی اور جذبے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

سارہ جوزف اور ایک اور طالب علم ایرک کورنا کی مجھے رات کے کھانے کے بعد واپس ہوٹل چھوڑنے آئے تھے۔ ایرک نے مجھے اپنی اس تحقیق کے متعلق بتایا جو وہ ایک مقامی کمپنی نیو بیلجیئم بریونگ کمپنی کولوراڈو پر کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''صرف ایسا نہیں ہے کہ مجھے ان کی بیئر پسند ہے بلکہ جس طرح وہ ملازمین کے ساتھ پیش آتے ہیں وہ بھی کافی قابل تائش ہے۔ وہ ایک مثال ہیں کہ کاروبار کس طرح کرنا چاہئے۔'' پھر اس نے مجھے کہا ''ہم نے کچھ ایسے عوامل دریافت کئے ہیں جو ذمہ دار اداروں میں مشترک ہوتے ہیں۔''

سارہ بولی ''پانچ اقدار ہیں۔ مساوات، شفافیت، اعتماد، تعاون اور ترقی سب کے لئے جو ادارے ہیں لازم ہے۔ اصل میں یہ تمام جمہوریت کے بنیادی اجزاء ہیں۔'' انہوں نے مجھے ان اداروں کے بارے میں بتایا جو ان اقدار کو اپنی تجارتی سرگرمیوں میں شامل کر رہے ہیں۔ وہ ارجنٹائن میں ٹائلز بنانے والی فیکٹری سے لے کر وسط غزنی میں قدرتی اجزاء تیار کئے جانے والی خوراک کے کارخانے تک بہترین نمونے تلاش کر رہے تھے۔

ڈینور یونیورسٹی کے وہ طالب علم اس تیسرے سوال کا جواب ترتیب دینے میں کارفرما ہیں اور پھر کچھ ہائی اسکول کے طالب علم سے میری بالکل انوکھی جگہ پر ملاقات ہوئی اور ان کے خیالات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔

مواقعوں سے بھرپور وقت

۲۰۰۶ء میں مجھے امن کے بہت ہی تجربہ کار نمائندے کی حیثیت سے امن کیلئے منعقدہ قومی اجتماع میں شرکت کے لئے سیٹل آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مجھے وہاں خصوصی مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا۔ ایسے مردوں اور عورتوں سے ملاقات کرنے کا خیال ہی کافی دلچسپ تھا جنہوں نے اپنے ملک کے لئے اپنی جانیں خطرہ میں ڈالی تھیں اور آج وہ امن قائم کرنے کے لئے واویلا مچارہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان میں سے بہت سے اپنے ہاتھ پیر کھو بیٹھے تھے اور دیگر مختلف سنجیدہ نوعیت کے زخموں کا شکار بنے تھے اور یقیناً بہت سے جسمانی کے علاوہ جذباتی اذیت سے بھی گزرے ہوں گے لیکن اب وہ کیا سوچتے ہیں؟

فلائٹ کے دوران میں اپنے دوست لیٹین رابرٹس کی کتاب ''گڈریمبرنگ'' کے تدوین سے پہلے کے مسودے کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ یہ کتاب دنیا بھر کے مختلف علاقوں کی حکایتوں پر مشتمل تھی۔ مجھے مندرجہ ذیل اقتباس بہت دلچسپ محسوس ہوا تھا:

> ''ہم مواقع میں گھرے ایک پیچیدہ وقت میں زندہ ہیں۔ اخبار پڑھتے ہوئے ہمیں روزمرہ کے بحرانوں سے اتنا ڈر محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سرخیوں سے چھلانگ مار کر باہر آجائیں گے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بحران اور افراتفری تبدیلی اور بصیرت کے مرکزی اجزاء ہیں۔ وہ ہمیں ان مواقعوں سے آگاہ کرتے تھے جو ہم پہلے دیکھ نہیں پارہے تھے۔ ایسے ادوار ہمیں سننے اور موصول کردہ پیغامات پر عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔''

اس پیراگراف نے میری اس سوچ کا خلاصہ کردیا تھا جو میں ان این جی اوز کے لئے دل میں محسوس کرتا تھا جو کارپوریشنز کو بہتر شہری بننے کے لئے آمادہ کررہی تھیں اور ان کے عہدیداران کو صحیح فیصلے کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ یقیناً مواقعوں سے گھرا وقت ہے اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ عمر رسیدہ شہریوں کو یہ خبر ضرور سننی چاہئے۔

ایک دفعہ سیٹل پہنچنے کے بعد میں عمر رسیدہ افراد کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور ان کے ساتھ شام میں مائیک پر کچھ شعر پڑھ کر سنائے تھے اور دیگر ورکشاپس میں شرکت کی تھی۔ میں ایک خاتون کے ساتھ بیٹھا بیئر پی رہا تھا جنہوں نے فوج میں اکیس سال گزارے تھے لیکن عراق پر دوسری بار قبضہ کرنے پر انہوں نے شرمندہ ہو کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں نے ٹانگوں سے محروم ایک شخص کی دردبھری شاعری سنی جس پر اس کے ساتھی فوجیوں کی طرف سے خوب داد دی گئی تھی۔ ''میں نے اپنی ٹانگیں اس لئے قربان کی تھیں تاکہ جارج بش اور ڈک چینی تیل اور دیگر معدنیات اپنی آئسکریم پر چھڑک کر کھا سکیں۔''

میں نے ان کی مدد سے کئے گئے غلط کاموں پر غم وغصہ محسوس کیا تھا اور وہ ان تمام غلط کاموں کو اپنی قوت ارادی سے درست کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کوئی تقریر نہیں لکھی۔ میں بس اپنے دل کی آواز سنانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری تقریریں سنیں گے لیکن ان ریٹائرڈ فوجیوں سے براہ راست بات کرنا چاہتا تھا۔

میں جب اس وسیع ہال میں ان لوگوں کے سامنے کھڑا ہوا اور میری نظر ان کے چہروں پر پڑی تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا ان کے ساتھ گہرا تعلق ہو۔ میرا وہ غصہ ختم ہو چکا تھا جب بحیثیت بوسٹن یونیورسٹی کے طالب علم نے انہیں بوسٹن نیوی یارڈز پر ویتنام جنگ کے لئے روانہ ہونے سے روکا تھا۔ مجھے وہ جھنجھلاہٹ بھی پگھلتی محسوس ہوئی جس کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب انہوں نے پانامہ سٹی پر بمباری کی تھی۔ میں وہاں کھڑا صرف اس ہمدردی کو محسوس کر پا رہا تھا جو ایک انسان دوسرے انسان سے اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ کسی کے استحصال کا شکار بنایا جا رہا ہو اور یہ لوگ کارپوریٹوکریسی کے استحصال کا شکار بنے تھے۔ ماضی میں چاہے ہم لوگوں کے درمیان کتنے ہی اختلافات ہوں وہ میری بہنیں اور بھائی ہیں۔ انہوں نے بھی اسی غلطی کو قریب سے دیکھا ہے اور اب وہ امن کے نمائندے کی صورت میں جمع ہو گئے ہیں۔ مجھے اس خیال کی طاقت نے بہت متاثر کیا تھا کہ اتنے سارے فوجی اس کے لئے اکھٹے ہو جائیں۔

میں نے جو کچھ وہاں تقریر میں کہا تھا اس کی تفصیلات میرے ذہن سے محو ہو گئی ہیں ہاں مجھے یہ یاد ہے کہ میں نے لیٹین رابرٹس کی کتاب کا وہ پیغام سمجھایا تھا کہ یہ بحران ایک تبدیلی کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ میں نے ان سے اپیل کی کہ صرف بش انتظامیہ پر سارے الزامات نہ عائد کریں بلکہ اس حقیقت کو پہچانیں کہ کارپوریٹوکریسی کسی ایک صدر سے کئی گنا طاقتور اور بڑی ہے۔ میں نے ان

این جی اوز کا ذکر کیا جو تبدیلی کے اس عمل میں بہادری سے برسرِپیکار ہیں اور میں نے رین کے ان رضا کاروں کو سلام پیش کیا جنہوں نے ہوم ڈپو کی دکانوں پر عام عوام سے رابطہ کے نظام کے ذریعے پیغام پہنچایا۔ میں نے ان عمر رسیدہ فوجیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ اور اپنی تنظیم پر یقین رکھیں اور یہ جان لیں کہ وہ اس طرح کی دنیا تعمیر کر سکتے ہیں جس کے لئے انہوں نے وہ یونیفارم زیب تن کی تھیں اور جمہوریت کے دفاع کا حلف لیا تھا اور پھر میں نے ان سے وہی بات کی جو میں پہلے بھی کئی سامعین سے کہہ چکا تھا۔

''میری اولاد کی اولاد صرف اسی صورت میں پرامن، دیرپا اور مستحکم دنیا میں رہ سکتی ہے اگر افریقہ، لاطینی، امریکہ اور ایشیا میں ہر بچہ مستحکم، دیرپا اور پرامن دنیا میں پرورش پائے۔'' اس بار میں یہ الفاظ دہرا رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس رہنما اصول کا ایک حصہ بیان کر رہا ہوں۔

جیسے ہی میں اسٹیج سے اتر کر نیچے آیا اور اپنی کتاب پر دستخط کر کے دینے لگا تو دو نوجوان میری طرف بڑھے۔ ایک منتظم نے انہیں جھڑک کر کہا ''آپ کو نظر نہیں آتا؟ ان سے ملنے کے لئے ایک طویل قطار انتظار میں کھڑی ہے۔''

مگر وہ پھر بھی نہ مانے۔ انہوں نے اپنا تعارف اور یونیورسٹی پری پیراٹوری اسکول سیٹل اولیمپیا ہائی اسکول میں بارہویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے کرایا تھا۔ ان کے نام جوئیل برے اور ٹاکر تھامپسن تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ''معاشی تباہ کار کے اعترافات'' کے مطالعہ نے انہیں تبدیلی کے اس عمل میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ جب ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تو ان میں سے ایک بولا کہ وہ میری اولاد کی اولاد کے حوالے سے بیان پر بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے کہا ''وہ میری اولاد ہیں، اولاد کی اولاد نہیں اور یہ ہم سب کے سمجھنے کے لئے انتہائی اہم بات ہے۔ ہماری اولاد کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا اگر تمام بچوں کو ایک بہتر مستقبل نہیں ہے۔''

وہ میز کی پشت پر میری کرسی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے انہوں نے میری کتابوں پر دستخط کرنے کا انتظار کیا تھا۔ جوئیل نے بتایا ''ہم نے ایک کلب کا اجراء کیا ہے جس کا نام گلوبل اویئرنس اور چینج رکھا ہے۔''

ہم نے اس کو دو کلبوں کی شکل میں بنایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم اپنے اسکولوں اور شہروں کے درمیان بڑے اجتماعات کا اہتمام کرانا چاہتے ہیں تاکہ زیادہ لوگوں تک اپنا پیغام پہنچا سکیں۔

ٹاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چند ہفتوں کی منصوبہ بندی کے بعد ہم نے کئی ایسے لوگوں اور تنظیموں سے رابطہ قائم کر لیا ہے جن کے مقاصد بھی ملتے جلتے ہیں تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ طالب علموں اور اساتذہ کی حمایت حاصل کر سکیں۔

جوئیل نے مزید بتایا کہ ''اب تک ہم نے جس سے بھی بات کی ہے اس کا ردعمل کافی پرجوش اور مثبت تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سیاست، ماحولیات، عمرانیات اور معاشیات کے دیگر شعبوں پر کام کر سکیں مگر آپ کی کتاب پڑھنے اور ایل گور کی فلم ''این انکوینیئنٹ ٹرتھ'' دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ماحولیات اور معاشیات پر کام کریں گے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے کافی گہرا تعلق ہے۔

انہوں نے مزید کہا ''ہم جانتے ہیں کہ آپ کافی مصروف رہتے ہوں گے مگر ہم آپ کو ای میل کے ذریعے اپنی کارروائیوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ٹاکر نے میری جانب کاغذ کا ٹکڑا بڑھا دیا تاکہ میں اس پر اپنا ای میل ایڈریس لکھ سکوں۔

سیٹل سے واپسی کے کئی دن بعد مجھے جوئیل اور ٹاکر کی ای میل موصول ہوئی تھی جس میں یہ تفصیلات درج تھیں:

> بنیادی مقصد ''کلب برائے عالمی شعور اور تبدیلی ایک ایسا کلب ہے جو شعور، تبدیلی اور عالمی مسائل کے حل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ جس دنیا کے ہم باشندے ہیں وہ آج کئی سماجی، سیاسی، معاشی اور ماحولیاتی مسائل سے دوچار ہے اور ہم ان تمام مسائل کے اثرات اپنی زندگیوں میں ہی دیکھ لیں گے۔ ہمیں نہ صرف حل تلاش کرنا ہوگا بلکہ اسے نافذ بھی کرنا ہوگا اور اس کے لئے ہمیں معاشرے میں آباد سارے حلقوں کی بھرپور مدد اور حمایت کی ضرورت ہے۔ کلب برائے عالمی شعور اور تبدیلی کا مقصد ہے کہ لوگوں کو ان مسائل سے آگاہ کریں اور وہ ان کے حل میں فعال انداز میں حصہ لیں۔ ہم اکٹھے ہو کر ہی ان اثرات کو زائل کر سکتے ہیں جو ہماری اپنی غلطیوں سے وجود میں آئے ہیں۔ ہمارے زندہ رہنے کی صلاحیت اس وقت خطرے سے دوچار ہے۔''

ان طالب علموں کی جلد بازی پر میں کافی شکر گزاری محسوس کر رہا تھا۔ ان کے جوش [illegible]

تعلیمی نظام کی وجہ سے کوئی کمی واقع نہیں ہو پارہی تھی جوان کی توجہ ان دیرینہ مسائل سے ہٹا کر ہوم ورک، کالج گریڈز، کالج میں داخلے اوران کی قابلیت جانچنے کے مختلف طریقوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ وہ ٹیلیویژن کے نشے سے بھی بے ہوش ہونے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہی خوف کی وجہ سے اپنی اقدار سے پیچھے ہٹنے کو تیار ہیں۔ یہ دونوں جوان ان مسائل کی سنجیدگی کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں وہ جان گئے ہیں کہ ان کی زندہ رہنے کی صلاحیت خطرہ میں ہے۔ صرف ان کی اولادیں یا اولادوں کی اولادیں ہی ان اثرات سے زیر بار ہوں گی بلکہ آنے والے کئی نسلیں ان خوفناک مسائل سے دوچار رہیں گی جو میری نسل ان کے لئے چھوڑ کر جارہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ کوئی حل اس وقت تک کارآمد نہ ہوگا جب تک اس میں پوری شمولیت نہ ہو لیکن اس کے باوجود انہیں یقین ہے کہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور ہوں گے۔

جب میں نے دوبارہ اس ای میل کا مطالعہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ رہنما اصول میں اس عزم کو بھی شامل کرنا ہوگا کہ ساری دنیا کو اس عمل کا حصہ بنانا ہے اور اس میں این جی اوز کے وضع کردہ ان اصولوں کو بھی شامل کرنا ہوگا جو سماجی، ماحولیاتی اور معاشی انصاف پر مبنی ہیں اور اس نظریے میں ان پانچ مشترک اقدار کو بھی شامل کیا جانا چاہئے جو ڈینور یونیورسٹی کے طالب علموں نے مرتب کئے تھے۔ ساتھ ہی اس میں اس زنانہ خواہش کو بھی جگہ ملنی چاہئے کہ بچے بڑے ہو کر اپنے آپ کو محفوظ محسوس کریں۔ سماجی اور مذہبی خواہش کے بجائے اسے اس قوانین پر مبنی ہونا چاہئے جو دنیا کے تمام باشندوں کے سینوں میں پل رہی ہے جس کو تمام مرد اور عورتیں اپنی تمنا سمجھ سکیں بلکہ تمام جانداروں کے احساسات کی ترجمانی کریں اور اسے نہایت سادہ زبان میں بیان کیا جانا چاہئے تاکہ سب اسے یاد رکھ سکیں اور یہ سوچ کر میں نے ان تمام خیالات کو تحریر کرلیا۔

جامع اصول ایک عزم ہے۔ جس کے مطابق ہمیں دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد باشندوں کے لئے ایک مستحکم، دیرپا اور پرامن دنیا کی تعمیر کرنی ہے۔

میں اس میں وہ سطر شامل کرنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا جو یہی تھی کہ کوئی ایک بچہ اس طرح کی دنیا کا وارث نہیں ہو سکتا جب تک ایسی دنیا تمام بچوں کو نہ مل سکے۔ اگرچہ یہ بات بالکل واضح تھی۔ اسی طرح انصاف و مساوات کا نظریہ بھی بالکل واضح ہے۔ پھر میں نے پودوں، جانوروں اور ماحول کو بھی اس میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر میں نے سوچا کہ لفظ مستحکم اور دیرپا ان تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں بہتر یہی تھا کہ اسے مختصر اور غیر پیچیدہ

رکھا جائے۔

ہم ایک مستحکم، دیرپا اور پرامن دنیا کے قیام کے لئے پرعزم ہیں۔

ڈینور اور سیٹل سے پہلے تک میں اس وقت کو دنیا کی تاریخ کا ایک اہم دور قرار دیتا تھا مگر اب مجھے احساس ہوا تھا کہ کالج اور ہائی اسکول کے طالب علموں اور ریٹائرڈ فوجیوں نے اس جنگ کے خاتمہ کا مطالبہ کر کے بشمول تمام این جی اوز کے کارکنوں اور عہدیداران سے بات چیت کے بعد جو نظریہ میرے سامنے آیا تھا جو شاہانہ سرمایہ دارانہ نظام کے بجائے جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کرتا ہے تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ تاریخ کا سب سے اہم موڑ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہم غلطی کر بیٹھے ہیں اور ہمیں استعمال کیا جارہا ہے اور ہمارے حکمران عدم استحکام اور ناانصافی کی بناء پر اس طاقت پر قابض ہیں اور اس میں حقیقتوں کو جاننے کے باوجود ہمیں ان کی سچائی پر شک کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ ہماری اس جھجک کو ایک سوال میں بیان کیا جاسکتا ہے جو مجھ سے ہر بار تقریروں کے بعد پوچھا جاتا ہے اور یہی ہمارے آج کا سب سے بڑا سوال ہے۔

ہمارے دور کا سب سے اہم سوال

''اس سے پہلے کہ میں آپ سے سوال پوچھوں میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں۔'' مرکز میں لگے مائیکروفون کے قریب کھڑی خاتون شاید تیس سے چالیس برس کے درمیان تھی۔ اس کے بال خوبصورت اور بھورے رنگ کے تھے اور اس کے چہرے پر ایک دل موہ لینے والی مسکراہٹ تھی جو مجھے میرل اسٹریپ کی یاد دلا رہی تھی۔ اپنے ہلکے نیلے رنگ کے بلاؤز اور پیلے رنگ کی پتلون میں وہ استاد، وکیل، فنکار یا گھریلو خاتون کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بولی ''دنیا بدلنے کے لئے ہمیں کارپوریشنز کو ان کے مقاصد تبدیل کرنے کے لئے رضامند کرنا ہوگا، انہیں کچھ امیر لوگوں کی خدمت گاری کا خیال ترک کر کے ہم سب کے لئے ایک بہتر زندگی کی فراہمی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ ساتھ ہی انہیں ان آبادیوں اور ماحول کا بھی خیال کرنا ہوگا جہاں ہم سب رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور پھر مخاطب ہوئی ''میں یہ سب جانتی ہوں۔''

اس وقت تک میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ کیا کہنے والی ہے۔ وہ وہی سوال پوچھنے والی تھی جو ہمیشہ پوچھا جاتا ہے جس سے سب خوفزدہ ہیں اور وہ سوال ہی میرے چار سوالوں کی فہرست میں آخری نمبر پر آتا تھا جس کا جواب ہم سب کو ڈھونڈنا چاہئے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر میری طرف جارحانہ انداز میں دیکھنے لگی اور بولی ''مگر میں اس سلسلے میں ذاتی طور پر کیا کر سکتی ہوں؟''

میں نے آپ سے کہا ''ہاں۔ یہی پوچھا جانا تھا۔'' پھر میں نے گلا کھنکارتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ عرصے پہلے جب میں تقریری دورے پر نکلا تھا تو میں حیران ہوتا تھا کہ لوگ ہمیشہ یہی سوال کرتے ہیں یا پھر یہ ہٹلر کے دور کے بعد، ایٹم بم، ویتنام، واٹر گیٹ، 9/11، عراق جنگ کے بعد عام رویہ بن چکا ہے؟ کیا ہم ہمیشہ سے اتنے ہی معمولی اور بے بس محسوس کرتے تھے؟ یا یہ رویہ اب رونما ہوا ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے میں اکثر اپنے دادا کے بارے میں سوچا

کرتا تھا۔ کساد بازاری کے دور میں ان کا فرنیچر کا معمولی سا کاروبار نیو ہیمپشائر میں تھا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے انتقال کر گئے تھے لیکن میں نے ان کی قدر و منزلت کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے کبھی کوئی اہم فیصلے اپنے ملازمین کی آمادگی کے بغیر نہیں کیے تھے۔ وہ اس بات کے ماننے والے تھے کہ ان کے بچے کبھی اچھی زندگی نہیں گزار سکتے اگر معاشرے کے غریب ترین رکن کے بچے اچھی زندگی نہ گزار پائیں اور اسی وجہ سے انہوں نے اس معاشرے کو کساد بازاری سے نکالنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ اور ان کے دوسرے ہم خیال کاروباری حضرات نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی جمع شدہ رقوم کے ذریعے مجبور لوگوں کے کھیت اور مکان چند پھوٹی کوڑیوں کے عوض نہیں خریدیں گے بلکہ انہوں نے ایسے کاروبار شروع کیے تھے جس سے بے روزگار، لکڑہاروں، بڑھیوں، جمعداروں، پلمبرز، درزی اور پردے بنانے والوں کو روزگار مل سکے۔ میرے دادا میرے لئے کبھی بھی ایک نیک اور فیاض

شخصیت کے طور پر نہیں بیان کئے گئے بلکہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اتنے ذہین ضرور واقع ہوئے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے پوتے، نواسوں کا مستقبل صرف اس وقت محفوظ ہوگا اگر ان تمام مفلس کسانوں اور مزدوروں کے پوتے نواسوں کا مستقبل محفوظ ہوگا۔

میں اپنے والد صاحب کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہٹلر کو یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتے تھے کہ ''وہ ایک یورپی آمر ہے اور اگر کچھ لاکھ لوگوں کو مارا ہے تو کیا ہو گیا؟ میں یہودی نہیں ہوں، میں اٹلانٹک کے اس پار رہتا ہوں اس لئے میں محفوظ ہوں۔'' انہوں نے اس صورتحال کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تراش سکتے تھے یا زبان کے استاد ہونے کی حیثیت سے وہ ترجمہ کرنے والوں کی تربیت کر سکتے تھے لیکن اس کے بجائے انہوں نے نیوی میں رضا کار کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور ان مسلح حفاظتی دستوں کی کمان بھی سنبھالی جو اٹلانٹک کے اس پار کھڑے تجارتی جہازوں پر پہرہ دیا کرتے تھے اور یہ کافی خطرے والی ملازمت تھی۔

مجھے ان حقوق کا مطالبہ کرنے والی خواتین، یونین کے منتظمین، شہری حقوق کے کارکن، ویتنام جنگ کے مخالفین، وہ لڑکیاں جو بندوق میں پھول اٹکائے اور وہ طالب علم جو بیجنگ اور ما[illegible] کی سڑکوں پر ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے ان کا خیال آنے لگا۔ وہ وقت تو گزر گیا لیکن ان میں

سے بہت سا احتجاج اس وقت ہوا تھا جب میں ایک ہوش مند انسان تھا۔

اور انہیں کو سوچ کر مجھے آج کے حالات کا خیال آیا۔ ان تمام مردوں اور عورتوں کو جو اوریگن کے جنگلات میں بلڈوزر کے آگے لیٹ گئے تھے اور کولمبیا کے ان کسانوں کا جنہوں نے اپنے آپ کو باڑھ کے ساتھ زنجیروں سے باندھ لیا تھا تاکہ کارپوریٹ اداروں کے غنڈے انہیں ان کی زمینوں سے زبردستی بے دخل نہ کر سکیں یا وہ کھلاڑی جنہوں نے سویٹ شاپس کی تیار کردہ یونیفارم پہننے سے انکار کر دیا تھا، جنہوں نے عمارتیں پھلانگ کر احتجاجی بینر ٹانگے تھے یا جنہوں نے شعر کے ذریعے لوگوں کو بتایا تاکہ صرف ان اداروں یا نجی دکانوں سے خریداری کریں جو ماحولیاتی تحفظ اور معاشی ذمہ داریوں سے واقف ہوں یا پھر میری اپنی بہن کی طرح ان نوجوانوں کا خیال آتا ہے جو نہایت دلکشی کارپوریٹ ملازمتوں کو ٹھکرا کر اپنے آپ کو ایسے مقاصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں جو آپ پیسہ سے کچھ بڑھ کر حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں اور وہ سب کچھ آج کی دنیا میں کر رہے ہیں۔

میں نے اس بھورے بالوں والی خاتون کو دیکھا جس نے ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز اور خاکی رنگ کی پتلون زیب تن کی ہوئی تھی اور اسے کہا گیا ”آپ جانتی ہیں کہ میں یہ سوال اکثر سنتا ہوں اور مجھے نہیں پتہ کہ سوال کیوں اتنا دہرایا جاتا ہے۔ میں اور آپ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جو جمہوریت اور جمہوری روایات پر فخر کرتے ہیں۔ جو عمل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے والد اور دادا کے حالات زندگی سنائے اور پھر میں نے کہا ”خدارا یہ نہ سوچیں کہ آپ تنہا ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے حاضرین کی طرف غور سے دیکھا اور کہا ”کتنے لوگوں کے ذہنوں میں یہی سوال ہے، آپ سے کتنے لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ ان چیزوں کو بہتر بنانے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟“

یہ سن کر کثیر تعداد نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ پھر میں نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ اپنا سر ہلایا اور پھر میں نے اس سے پوچھا ”ہم اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کرتے ہیں؟ میں آپ کو ایک اشارہ دیتا ہوں کہ کارپریٹوکریسی اس وقت کو ہم سے چھیننے میں اس لئے کامیاب ہو گئی کیونکہ اس کے پاس ایک مددگار تھا۔“

وہ کچھ سوچنے لگی اور پھر اس نے مجھے وہی میریل اسٹریپ والی مسکراہٹ دی اور بولی ”ہم“ میں فوراً بولا ”صحیح۔ وہ ہم سے ہماری لائف نہیں چھین سکتے اگر ہم انہیں اجازت نہ دیں۔“

یہ سن کر وہ مائیکروفون چھوڑ کر اپنی نشست کی طرف بڑھی مگر پھر کچھ سوچ کر بولی ”تو پھر میرا سوال وہی ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

پھر میں نے اسے جواب دیا ”اپنی طاقت واپس لے لیں اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی ایسا ہی کرنے کے لئے آمادہ کریں۔“ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ”مسئلہ بہت بڑا ہے، کارپوریشنز اور حکومت بہت طاقتور ہیں میرے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔“ ”تو پھر آپ ذمہ داری سے منہ نہ موڑ رہے ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے قدرے توقف کیا ”خدا کا شکر ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے ۱۷۷۰ء کی دہائی میں نہ نہیں کہا“ ”اوہ! برطانیہ کا بادشاہ؟ وہ بہت طاقتور ہے اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے سامعین کو بتایا جو اس سے پہلے میں کئی دیگر اجتماعات میں بھی لوگوں کو بتا رہا تھا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سمجھیں کہ ہمارے بھائیوں نے اپنی گردنیں پھانسی کے پھندے میں پھنسائی ہوئی تھیں۔ وہ تاریخ کی سب سے طاقتور سلطنت کے سامنے سینہ سپر تھے جو ان کی اپنی ہی حکومت بھی تھی۔ وہ غدار پکارے جاتے تھے بادشاہ انہیں دہشت گرد کہتا تھا انہیں پھانسی کی سزائیں سنائی جاتی تھیں۔ آج ہم ان کی شجاعت کو سلام کرنے میں بالکل ایسے ہی جیسے ہم ان افراد کی عزت کرتے ہیں جنہوں نے ہٹلر کی بربریت کو روکا تھا ہم ان کی فیاضی اور خواہش کو سلام کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ قربانیاں دینے کو تیار تھے۔

ہمیں بھی ہمت باندھنا ہو گی اور بڑے دل کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ ہمیں ہیرے، سونے، لیپ ٹاپ اور موبائل فون کی زیادہ قیمت ادا کر کے اس بات کو یقینی بنانا ہو گا کہ کان کنوں کو معقول تنخواہیں صحت اور حفاظت کی بہتر سہولیات میسر آ سکیں اور ہمیں ان مصنوعات کی بھی معقول قیمت ادا کرنی ہو گی جو سویٹ شاپس میں نہ تیار کی گئی ہوں اور ایسے اداروں کی تیار کردہ ہوں جو اپنے ملازمین سے اچھا رویہ روا رکھیں، ہمیں زیادہ چھوٹی اور پیٹرول کی بچت کرنے والی گاڑیاں چلانی چاہئے تاکہ توانائی اور اس کا استعمال دونوں کی بچت ہو اور فطری ماحول اور انواع واقسام کے جانداروں کے تحفظ کے لئے کام کرنا چاہئے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم شعور پیدا کر سکیں کہ جو کام ہم کرتے ہیں اور جو چیز ہم خریدتے ہیں اس سے کہیں نہ کہیں کے علاقے اور لوگوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ہمارا مشترکہ طرز زندگی کل ہماری اولادوں اور اولادوں کی اولادوں کا مستقبل طے کرے گا۔ جیسے ہم سے پہلے کے انسان قربانیاں دیتے آئے تھے اسی طرح ہمیں بھی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہنا

ہوگا اور اگر ضرورت پڑے تو انتہائی قربانی دینے سے بھی پیچھے نہ ہٹیں تا کہ ہم اپنے بچوں کے لئے ایک ایسی دنیا چھوڑ کر جاسکیں جیسی ہمارے والدین نے ہمارے لئے چھوڑی تھی۔

افراد کی سوچ سے فرق پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ کارپریٹو کریسی ہمیں یہ یقین دلانے کے لئے کہ ہم کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے کروڑوں ڈالر خرچ کر دیتی ہے سوائے تب جب ہم ایک شے خریدتے ہیں یا دوسری مگر ہم سب جانتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ذرا ایمنسٹی، رین، پاچاماما الائنس، موو آن اور ایسی دیگر تنظیموں کے بارے میں سوچیں یا ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو آپ پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتے ہوں۔

نیو ہمپشائر کا دیہی علاقے میں پرورش پاتے ہوئے مجھے کبھی یہ خیال نہ گزرا تھا کہ کچھ جنوبی علاقوں میں افریقی امریکی باشندوں کو بس پر لفٹ کر سفر کرنے کے لئے جانا تھا جب تک کہ ایک روز اپارکس نامی ایک خاتون نے احتجاج نہ کیا۔ ہمارے گھر کے اردگرد عشق ہیجان کے زہریلے پودے اگتے تھے ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ان زہریلے پودوں کو ختم کرنے کے لئے ہم جو دوا چھڑکتے ہیں اس سے ان پودوں کے ساتھ ساتھ مچھلیاں، پرندے، گلہریاں اور کئی اور طرح کے جانور مرجاتے ہیں جب تک ریشیل کارسن نے ''خاموش بہار'' کے نام سے کتاب نہ لکھی تھی جو عالمی ماحولیاتی تحفظ کی تحریک کی بنیاد بن گئی تھی۔ یوگیں میک کارتھی نے ایک سیاسی مہم شروع کی تھی جس نے قوم کی دو چند طاقتور ترین صدور میں سے ایک لنڈن جانسن کا اقتدار ختم کر دیا تھا۔ میک کارتھی کو صدارت تو نہ مل سکی مگر ویتنام جنگ ضرور ختم ہوگئی تھی۔ کوریٹا اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے ہمیں خوابوں کی طاقت سے آگاہ کیا تھا۔ انہوں نے نسلی امتیاز کی نہ صرف یہاں امریکہ میں بلکہ جنوبی افریقہ اور کئی دیگر ممالک میں بھی ختم کرا دیا تھا۔ میرے والد نے مجھ میں ''اعلامیہ آزادی'' میں وضع کردہ اصولوں کی بے تحاشہ عزت پیدا کر دی تھی۔ میری والدہ نے ہائی اسکول کے اخبار میں مدیر کو خطوط لکھنے کے لئے میری کافی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں اور گھنٹوں میری تقریر سنا کرتی تھیں جب میں تقریری مقابلے میں حصہ لیا کرتا تھا میرے والدین کی حوصلہ افزائی کے بغیر میں یہ کتاب کبھی بھی نہ لکھ پاتا۔

میں نے یہ تمام باتیں اس رات سامعین کو بیان کیں، پھر میں نے اس خاتون کی طرف دیکھا جو مائیکروفون کے پاس کھڑی تھی اور اب وہ اپنی نشست پر بیٹھ چکی تھی میں نے اس سے پوچھا

''کیا آپ ملازمت کرتی ہیں؟'' اس نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا ''کیا آپ ہمیں بتانا پسند کریں گی'' تو وہ بولی ''میں استاد ہوں۔''

پھر میں نے کہا'' کافی مواقعوں سے بھرپور کام ہے۔ میری تیسری جماعت کی استاد تھیں مس شنارے جنہوں نے مجھے اسکول کے ہی ایک خطرناک لڑکے کے سامنے ڈٹ جانے کا طریقہ بتایا تھا اور پھر انہوں نے مجھے اپنے عقائد اور اپنے جسم کا تحفظ کرنے کے مختلف طریقے بتائے تھے۔ میرے ہائی اسکول کے دوسرے سال میرے انگریزی کے استاد رچرڈ ڈیوس نے مجھ میں یہ خیال پختہ کر دیا تھا کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور ایک سال بعد میری تاریخ کے استاد جیک وڈبرے نے مجھے وہ کتابیں پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ طاقتور بھی کمزور ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ یہاں تک کہ بادشاہ بھی تمام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے دل بھی میرے اور آپ کی طرح ٹوٹتے ہیں، ان کا بھی خون بہتا ہے، انہیں بھی راضی کیا جاسکتا ہے، دوست بنایا جاسکتا ہے یا پھر شکست دی جاسکتی ہے۔''

یہ سن کر وہ خاتون دوبارہ مائیکروفون پر آئیں۔ ان کے آگے کھڑا شخص احتراماً مائیکروفون سے ہٹ گیا اور اس نے کہا ''میرا خیال ہے کہ مجھے معلوم تھا مگر بعض اوقات آپ ان چیزوں کو بھول جایا کرتے ہیں مگر اب نہیں۔ میں ایک استاد ہوں اور اب میں پوری لگن، محنت اور سچائی پڑھاؤں گی۔''

باب نمبر:۶۵

یہی بہترین وقت ہے

آج کل ہم لوگ دستور العمل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں کارپریٹوکریسی نے ہی سکھایا ہے۔ نقطوں کو ملایئے اور تصویر بن گئی۔ اگر آپ کو سر درد ہے تو سفید گولی کھایئے، سینے میں جلن ہے تو لال گولی کھایئے، کبھی اس سے ہٹ کر نہ سوچئے۔ استاد کے پاس تمام سوالات کا جواب ہوتا ہے۔ یا پھر مذہبی عالم کے پاس، سیاستدان، مالک، چیف ایگزیکٹو، یا صدران کے پاس آپ کے تمام سوالات کے جوابات موجود ہیں۔

فارمولا لگائیں اور جواب آپ کی مٹھی میں موجود ہوگا۔ جو نسخہ بتا دیا ہے صرف اسی پر عمل کرنا ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر چلیں گے تو پریشان ہو جائیں گے۔ یہ پہلے سے طے شدہ جوابات نے ہمیں پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو خوش کر سکتے ہیں کہ آپ معروضیت پر یقین رکھتے ہیں یا ہم سائنس کے اصولوں کو ماننے والا معاشرہ ہیں جبکہ اس غم کا پہلو یہ ہے کہ ہم نے یہ بات مان لی ہے کہ بادشاہ ہی کے پاس تمام سوالات کے جواب ہیں جبکہ یہ ایک جھوٹ ہے۔

میرے ایک قریبی دوست کو کچھ عرصے پہلے ہی دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ تین بائی پاس کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے کہا کہ طبی سائنس کے مطابق یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ آپ کی خوراک اس دورہ کی وجہ بنی تھیں مگر وہ یہی ایک ممکنہ وجہ ہو سکتی ہے اسی لئے میں نے آپ کی خوراک میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ ہم عالمی مسائل کے حل میں ایسے ہی ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ یہ ہمارے دور کی علامتوں میں سے ایک ہے کہ ہماری حکومت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ ماحولیاتی قوانین کو از سر نو تجدید کر سکیں انہیں اسے اس بات کا ثبوت چاہئے کہ موسم میں یہ تبدیلیاں انسان کی پیدا کردہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی وجہ سے رونما ہو رہی ہیں۔ ٹھوس ثبوت مگر کس سے چاہئے ان کو یہ ثبوت؟

تاریخ میں ہر دور میں ہی مردوں اور عورتوں نے رائج قوانین کی افادیت پر سوال اٹھائے ہیں اور ہم ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم گلیلیو، جون آف آرک، مولی اسٹارک، تھامس ایڈیسن، جوناس سالک، ہیلن کیلر، گاندھی اور دلائی لامہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا نہایت ضروری ہے کہ وہ بھی ہماری طرح انسان ہی تھے۔ میری اور آپ کی طرح انسان انہیں وہی خوف محسوس ہوتا ہوگا۔ وہ بھی ہمیں کرنے ہوں گے۔ وہ بھی ہنستے روتے ہوں گے۔ انہوں نے یقیناً غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں مگر ان میں سے سب کے راستے میں رکاوٹیں حائل تھیں جو اس وقت انہیں پہاڑ جیسی محسوس ہوتی ہوں گی۔ انہوں نے بھی تجربے کئے، ہارے رہے اور آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ کامیاب بھی ہو گئے۔

ہمارے پاس کوئی ایک نکاتی حل نہیں ہے لیکن بہت سے ایسے تاریخی کردار ہیں جو ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ اس کتاب کے صفحات ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جیسے کہ ان سوڈانی بہن بھائی کی کہانی یا پھر اس مقامی باشندے کا قصہ جو اپنے ملک کا صدر بن گیا یا پھر تعلیمی مشن سے وابستہ رضا کار جو این جی اوز کے بانی بنے یا ہائی اسکول کے طالب علم سے لے کر یونیورسٹی پروفیسرز، ادیبوں سے لے کر فلم بنانے والوں تک، اس میں وہ تمام لوگ نظر آئیں گے جو اپنے پڑوسیوں سے تبادلہ خیال کرتے ہیں یا پھر مقامی این پی آر اسٹیشن کی حمایت کرتے ہیں۔ آپ ادھر ادھر دیکھیں وہ ہر جگہ موجود ہیں۔

اور آئینہ دیکھئے آپ بھی ان میں سے ایک ہیں۔

آپ بھی اس عمل میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں ہر دن اس طرح یا اس طرح آپ اپنے دوستوں کو راستے سمجھا سکتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اس کا شعور ہو اور پھر کچھ کرنے میں مصروف ہو جائیں کسی بھی مثبت قدم سے دنیا ایک بہتر جگہ بن سکتی ہے۔ دنیا کے تمام باشندوں کے لئے یہ جگہ ہر دن ایک مستحکم، دیرپا اور پرامن دنیا تخلیق کرنے کی کوشش میں لگے رہنے۔

میں اپنے سامعین کو اکثر کہا کرتا ہوں ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو حکمت عملی بنا کر دے دوں تو پھر آپ مجھ سے کارپریٹوکریسی کے طریقے پر چلنے کو کہہ رہے ہیں اور آپ یقیناً ایسا نہیں چاہتے ہوں گے۔ آپ اپنے شوق میں اور صلاحیتیں جو مجھ سے قطعی مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ہاں ہم کچھ محسوس اقدام کر سکتے ہیں۔ وہ سادی چیزیں جو ہم سب جانتے ہیں یہ کام جتنی زیادہ مقدار میں کریں اتنا ہی آپ اچھا محسوس کریں گے اور ہم ایک بہتر مستقبل کی طرف تیزی سے

بڑھیں گے۔" کچھ مثالیں یہ ہیں

کرنے کے کام:

☆ جب آپ کا "ریٹیل تھراپی" کرنے کو دل چاہے تو اس کے بجائے جاگنگ کریں، کسی چیز کا مطالعہ کریں، مراقبہ کریں یا کوئی اور حل تلاش کریں۔

☆ خریداری تب کریں جب آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو: ایسی چیزیں خریدیں جو پیکٹ میں بند کرنے کے عمل، اجزاء اور تیاری کے عمل میں کسی بھی طرح کی زندگی کے لئے خطرہ نہ بنی ہوں۔

☆ اپنی ملکیت شدہ اشیاء کو اس وقت تک استعمال کریں جب تک ممکن ہو۔

☆ ایسی دکانوں سے اشیاء خریدیں جہاں کی ہر بے کار چیز سے کوئی اور کارآمد چیز بنائی جاسکتی ہو۔

☆ آزاد تجارت کے معاہدوں اور سویٹ شاپس کے خلاف احتجاج کریں۔

☆ مونسانٹو، ڈی بیئرز، ایکسون موبل، ایڈیڈاس، فورڈ، جنرل الیکٹرک، کوکاکولا، وال مارٹ اور دیگر ایسے ادارے جو مزدوروں کے استحصال میں ملوث ہیں اور ماحول کو برباد کرتے ہیں انہیں خطوط لکھ کر بتائیں کہ آپ ان کی اشیاء کیوں نہیں خریدتے۔

☆ ہوم ڈیپو، کنکو، سٹی کارپ، اسٹاربکس، ہول فوڈز اور دیگر ایسے اداروں کو تعریفی خطوط لکھیں جو رین، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر این جی اوز کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہوں۔

☆ تیل اور گیس کا استعمال کم سے کم رکھیں۔

☆ اپنی گاڑی، گھر اور پہننے کے کپڑے سے لے کر زندگی میں ہر چیز محدود رکھیں۔

☆ ایسی غیر منافع بخش تنظیموں، ریڈیو اسٹیشنز اور دیگر اداروں کو رقوم فراہم کریں جو اچھے نیک مقاصد کے لئے کام کر رہے ہوں۔

☆ ایسے ادارہ کے لئے اپنا وقت اور توانائیاں دونوں صرف کریں۔

☆ مقامی تاجروں کی حمایت کریں۔

☆ دکانداروں کو مقامی ٹھیکیداروں، تیار کرنے والوں اور پیدا کرنے والوں سے خریدنے کی تاکید کریں۔

☆ اپنی مقامی کسان کی مارکیٹ سے خریداری کریں۔

☆ نلکے کا پانی استعمال کریں (پانی فراہم کرنے والے ادارے پر بہتر پانی کے لئے دباؤ ڈالیں لیکن بوتلوں بھرا پانی پینے سے اجتناب کریں)

☆ باشعور سیاستدان، اسکول، بورڈز، کمیشنز اور قوانین کی حمایت کریں۔

☆ سیاست میں حصہ لیں۔

☆ جو ادارے آپ کا پیسہ استعمال کرتے ہیں جیسے کہ بینک، پنشنز، میوچل فنڈز یا دیگر ادارے ان پر دباؤ بڑھائیں کہ وہ اس پیسے کو سماجی اور ماحولیاتی ذمہ داری کے ساتھ استعمال کریں۔

☆ ہر معاشی سماجی بات کرنے کے پلیٹ فارم میں بھرپور شرکت کریں۔

☆ اپنے مقامی اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں اپنے پسندیدہ مضامین پر تقریر کریں جیسے کہ شہد کی مکھیاں پالنا، سلائی کڑھائی یا کوئی کھیل اور انہیں طالب علموں کی بیداری اور شعور کے لئے استعمال کریں۔

☆ ماحول کی خرابی سے پیدا ہونے والے اخراجات، خراب کام کرنے کی جگہ، حکومتی اخراجات، کارپوریٹ مستثنیات اور دیگر کئی ایسے ماحولیاتی، سماجی اور سیاسی عوامل ہیں جنہیں ان تمام اشیاء اور خدمات کی قیمت میں شامل ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ (باب ۵۴ میں ان پر بحث کی گئی ہے۔ لوگوں کو آگاہ کریں کہ جب ہم ان اخراجات کا بار نہیں اٹھاتے ہیں تو اس کا اثر ہماری آنے والی نسلوں پر پڑے گا۔

☆ ان تمام خارجی اخراجات پر ٹیکسز عائد کرنے کی حوصلہ افزائی کریں جیسے کہ گیس، ملبوسات اور بجلی پیدا کرنے کے عمل میں ہونے والے اثرات پر ٹیکس لگائے جائیں تاکہ ان رقوم کو ماحولیاتی اور سماجی خرابیوں کو ٹھیک کرنے کے لئے خرچ کیا جائے۔

☆ مقامی لائبریریوں، کتاب گھروں اور مذہبی عبادت گاہوں میں آنے والوں کو تعلیمی دوروں کی دعوت دی جائے اور اس فہرست میں مزید ضروری عوامل شامل کریں اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو اس سے آگاہ کریں۔

فہرست میں موجود تمام عناصر کسی نہ کسی طرح کارپوریٹ اور سیاسی حکمرانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہماری زمین پر اس غاصب سلطنت کے شکنجے کو کمزور کرنے کے لئے ہمیں سلطنت کی ساتویں عنصر یعنی بادشاہ۔ اس معاملے میں کارپریٹوکریسی کو طاقت [illegible]

کے تسلط کے طریقوں میں تبدیلی لا کر جو کارپوریشنز کی صورت میں آج کی دنیا میں موجود ہیں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں ایسی دنیا تعمیر کرنے میں جو ہم اپنے بچوں کے لئے چھوڑنا چاہتے ہیں یہ ہمارا حق اور ہماری ذمہ داری دونوں ہے کہ ہم مطالبہ کریں کہ کارپوریشنز بہتر شہریوں کی طرح پیش آئیں اور اپنی شاہانہ عادات کو ترک کردیں اور ان کی جگہ جمہوری اقدار و روایات کو اپنے طور طریقوں میں شامل کرلیں۔

ہمیں اپنے رویوں کے ذریعے جیسے کہ پیسے خرچ کرنے کا طریقہ اور ووٹ ڈالنے کے عمل سے ان لوگوں تک جو ہمارے ادارے چلانے کے ذمہ دار ہیں یہ پیغام پہنچا سکتے ہیں کہ انہیں پرامن، مستحکم اور دیرپا دنیا قائم کرنے کے لئے ہمارا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ میں اکثر ایسے الفاظ سنتا ہوں ''آپ مجھے ان ٹی شرٹس کے لئے زیادہ قیمت ادا کرنے کو کہہ رہے ہیں یا یہ کہ میں وال مارٹ سے خریداری کرنا چھوڑ دوں؟ ایسی جگہ سے اشیاء خریدوں جہاں سے مزدور تنظیمیں اپنے مطالبات منوانے کے لئے زیادہ قیمت پر اشیاء تیار کرواتی ہیں؟ میں محنت کرتا ہوں، میرے بچے ہیں میں اس طرح کی قربانیاں نہیں دے سکتا۔''

جس کا جواب میں اس طرح دیتا تھا کہ ''میں آپ سے آپ کے بچوں کے مستقبل کی قربانی نہیں مانگ رہا ہوں۔ بس صرف اس بات کو یقینی بنائیں کہ جو اشیاء آپ خریدتے ہیں وہ ماحولیاتی اور سماجی ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ادارے تیار کرتے ہوں۔ وال مارٹ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا ہے کم از کم ابھی تو نہیں یا پھر کم ٹی شرٹس خریدیں۔ انہیں زیادہ عرصے تک استعمال کریں۔ یہ یاد رکھیں کہ سویٹ شاپس میں بننے والی مصنوعات کے لئے بعض اوقات آپ کو زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے نا کہ کی مصنوعات سستی نہیں ہیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ جن اداروں کی چیزیں آپ خریدتے ہیں تو اس کی کیا وجوہات ہیں اور ان اداروں کو ان وجوہات سے آگاہ کریں اور جن اداروں سے خریداری سے اجتناب برتتے ہیں تو اس کی وجوہات کیا ہیں اور ان اداروں کو بھی ان وجوہات سے آگاہ کریں۔

یہ آخری جملہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں اپنے پیغام کو پورے کرۂ ارض پر پھیلانا ہوگا۔ جن پر ہمارے رویوں کا اثر پڑتا ہے انہیں اس کی وجوہات کا بھی علم ہونا چاہئے اور ہمارے جذبات کو محسوس کرنا چاہئے۔ کارپوریٹوکریسی نے دھوکے اور خفیہ ہتھکنڈوں کے ذریعے اتنی ترقی کی ہے اور ہمیں ان تمام فریب کاریوں کو بے نقاب کرنا ہوگا۔

ذرا ان تمام قتل اور بدعنوانی کی وارداتوں کے بارے میں سوچیں جو آپ نے اس کتاب میں پڑھی ہیں جنہیں پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہوں گے۔ اگر آپ نے اپنی زندگی اور خریداری میں احتیاط نہ برتی تو پھر آپ یقیناً ایسی کہانیاں اکثر سنتے رہیں گے اور آپ ایک طرح سے معاشی تباہ کاروں اور کرائے کے قاتلوں کے معاون ہوں گے۔

جب میں نے نیو ہمپشائر میں ہوش سنبھالا تو میری خواہش تھی کہ میں ۱۷۰۰ء کے دور میں پیدا ہوتا تا کہ انقلاب میں حصہ لے سکتا۔ لیکن اب میں شکر ادا کرتا ہوں کہ میں آج کی دنیا میں زندہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اور آپ اس مہم پر روانہ ہو گئے ہیں جو ہماری ملکی تاریخ میں بالکل منفرد ہے اور دنیا کی تاریخ کے تناظر میں بھی الگ دکھائی دیتی ہے۔

میں پچاس برس سے زائد عمر کے شہریوں سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ''آپ میں سے بہت سوں کو اپنی ملازمتیں کھونے کا خوف نہیں ہے۔ آپ کے بچے بھی اب اپنے ٹھکانوں میں آباد ہیں تو اب یہ آپ کی باری ہے کہ آپ کچھ کر دکھائیں۔ ذرا موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ جوان لوگوں کی رہنمائی کریں، فیصلہ سازوں کو ایک جھٹکا دیں۔ ایک فیصلہ کریں اور پھر اس کے اثرات سے لطف اندوز ہوں۔''

اور نوجوانوں کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ ''آپ میں سے کئی لوگ کارپوریشنز کے لئے کام کر سکتے ہیں اور اندر سے تبدیلی کے موجب بن سکتے ہیں۔ دیگر لوگ اس عمل سے خراب ہو سکتے ہیں تو پھر آپ باہر رہ کر این جی اوز کے ساتھ مل کر کام کریں۔ آپ اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں یا سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ کامیابی کا معیار یہ نہیں ہے کہ آپ کا گھر کتنا بڑا ہے یا آپ کے پاس کتنی گاڑیاں اور کشتیاں ہیں۔ کامیابی کا احساس تب ہوتا ہے جب آپ اندر سے مطمئن ہوں۔''

میں ہر ایک کو سرگرم تنظیموں میں شمولیت کا مشورہ دیا کرتا ہوں۔ ہماری تاریخ کے دوران سول تحریکیں جیسے کہ امریکی انقلاب کے دوران سنز آف لبرٹی کی تحریک ہماری جمہوریت کے لئے لازم تھیں اور اسی لئے آج ان کی جتنی ضرورت ہے اتنی پہلے بھی نہ تھی۔ آپ انٹرنیٹ پر ایسی بہت سی تنظیموں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں جو آپ کی صلاحیتوں اور شوق کے شعبے میں کام کر رہی ہوں۔ ان کی ای میل مہموں، ریلیوں اور مظاہروں میں شریک ہوں، ان کو دس ڈالر سے لے کر دس ہزار ڈالر تک چندہ دیں یا ان کے فون سننے کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر

پیش کریں یا بس اپنا نام لکھوالیں اوران کے ساتھ رہ کر کئی چیزیں سیکھیں۔

ہمارے پاس وہ تمام وسائل موجود ہیں جواس دنیا کوایک مستحکم، دیرپا اور پرامن جگہ بناسکتے ہیں۔کارپریٹوکریسی نے ان تمام سہولتوں کا انتظام ہمارے لئے کر دیا ہے۔تعلیم،مواصلات، مالیاتی اورنقل وحمل کے ذرائع سے لے کر معدنی اور دیگر ذخائر، سائنسی معلومات اور ٹیکنالوجی کے جدید طریقے ہماری مدد کے لئے موجود ہیں۔ہم مستقبل کے بچوں کو بھوک اور بیماری سے مرنے سے بچاسکتے ہیں انہیں بنیادی ضروریات فراہم کرسکتے ہیں۔امیر اور غریب کے درمیان تفاوت کر سکتے ہیں اور ہم اس بات کو یقینی بناسکتے ہیں کہ کارپوریشنز ان آبادیوں کا جائز حصہ انہیں ادا کریں جہاں وہ کام کرتی ہیں مگر بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہمیں کھڑے ہونا ہے اوراپنی اہمیت منوانی ہے۔

دھوکے اورخفیہ کارروائیوں کے علاوہ کارپوریٹوکریسی ہماری کاہلی کی وجہ سے بھی کامیاب ہے۔وہ ہماری سردمہری کے رویے سے فائدہ اٹھاتی ہے کہ ہم ان کے اشتہارات کے ذریعے بنائے صحیفوں کواپنالیں اور بے سوچے سمجھے خریداری کرتے رہیں اور انہیں اس کرۂ ارض کو برباد کرنے دیں۔اس سلسلے کو روکنا ہوگا، ہم سب کو بیدار ہونا ہوگا۔اس وقت عمل کر کے ہی ہم اس بات کو یقینی بناسکتے ہیں کہ ہمارے بچے اور بچوں کے بچے ہمارے بھانجے، بھتیجے اوران کی اولادیں ایک ایسی دنیا میں بسیں جونفرت اور مصائب سے دوچار نہ ہو جو جنگ اور دہشت گردی کا شکار نہ ہو۔

آپ سب ذاتی حیثیت میں طاقت کا برتاؤ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے جوش کو بڑھنے دیں اوراسے اس طرح استعمال کریں جو ہماری صلاحیتوں اوررویوں کی عکاسی کریں۔آپ کا طرزِعمل آپ کے دل کا طے کردہ ہونا چاہئے نا کہ کسی کا بتایا ہوا ہم سب کوآگے بڑھنا ہوگا۔

کیامیں پرامید ہوں؟ بالکل۔میں کیسے پرامید نہیں ہوسکتا جبکہ میں ایسی کئی تنظیموں کے بارے میں آگاہی رکھتا ہوں جو تبدیلی کے لئے کوشاں ہیں۔میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو کارپوریشنز میں کام کرتے ہیں لیکن وہ صحیح راستے پر چلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں اور کئی لاکھ ایسے گمنام لوگ موجود ہیں جواپنے وقت اور پیسے کوان نیک مقاصد کے لئے وقف کر رہے ہیں۔تو پھر اس صورتحال میں کیسے ناامید ہوسکتا ہوں جبکہ میں اس طاقت سے آشنا ہوں جو میں اور آپ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

پچھلے سو برس میں ہم امریکیوں نے اپنے آپ کو ترقی کرنے کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ہم ایسے شہروں کے خواب دیکھتے ہیں جن میں گھوڑوں کے بجائے گاڑیاں دوڑیں اور بجلی سے ہمارے

گھر جگمگائیں اور بڑے بڑے کارخانے چلیں اور جہاں ہم شدید سردیوں میں بہترین اشیاء استعمال کر سکیں۔ہم نے اپنا ہر دن ان خوابوں اوران جیسے کئی اور خوابوں کو سچا کرنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ہم نے اپنے خوابوں کے بارے میں بات کی تھی اور انہیں خوبصورتی سے پیش کرنے کے لئے فلمیں بنائیں، کتابیں تحریر کیں اور ٹی وی پروگرام نشر کئے۔ہم نے اس عمل میں حصہ لینے کی سب کو دعوت دی لیکن خوابوں کی تعبیر بنانے میں اتنا کھو گئے کہ کچھ لوگوں نے موقع دے دیا کہ وہ ہمیں اور باقی دنیا کا استحصال کرسکیں۔انہوں نے سلطنت کا خواب دیکھا اوراپنے میڈیا کے ذریعے ہمیں یہ باور کرادیا کہ ان کی یہ سلطنت جمہوریت کی حامی، مفلسوں کی مددگار، صحت مند زمین کی داعی ہے اور نہایت آہستہ آہستہ انہوں نے ہماری محویت کا فائدہ اٹھا کر ہمارے حسین خواب کو بدترین سپنے میں تبدیل کر دیا۔

ہمارا اصل خواب تو یہ تھا کہ ہم غربت کوختم کر سکیں، صحت مند زندگیاں گزار سکیں اور زیادہ باوقار انداز میں رہ سکیں۔ہم گھوڑوں کے سڑکوں پر آنے سے پیدا ہونے والی گندگی کوختم کرنا چاہتے تھے اور ایسی عمارتیں جن میں نکاسی کا نظام ناقص تھا ان کو بہتر روپ دینا چاہتے تھے ہم زیادہ پُرآسائش زندگیاں اور صحت مند خوراک کی آرزو کرتے تھے۔ہم ان آرزوؤں کو پورا کرنا چاہتے تھے جو ہماری ضرورتیں پوری کرسکیں اور کچھ عرصے تک وہ آرزوئیں پوری ہوئیں تھیں اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ کارپریٹوکریسی نے ہمیں بے وقوف بنا کر ایسے طریقے اختیار کروائے جو خودغرضی اور تباہی پر مبنی تھے۔انہوں نے خواب ہم پر تھوپے تھے ان سے کئی لاکھ لوگوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔انہوں نے کئی جانداروں کے مسکن برباد کر دیے تھے۔انہوں نے ہمیں، ہماری اولادوں اور ہمارے سیارے کے مستقبل کو ڈرا دھمکا کر خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔

آج ہمارے ملک میں تمام خوبیاں موجود ہیں جو کسی سلطنت کا حصہ ہوتی ہیں۔یہ وہ خواب نہیں ہے جس کی ہم نے خواہش کی تھی۔یہ وہ ٹھکانہ نہیں ہے جس کو ہم تعمیر کرنا چاہتے تھے بلکہ یہ ہمارے انتہائی اہم اصولوں کے بالکل برعکس ایک حقیقت ہے۔ہم نے مادہ پرستی کی اس جنت سے کہیں زیادہ اہم چیزوں کی خواہش کی تھی اور نہ ہی ہم نے ان گاڑیوں، جدید شہروں، کارخانوں اور شاپنگ سینٹرز کا سپنا دیکھا تھا۔ہمارے خواب ایک خوبصورت زندگی کے متعلق تھے۔ہمارا خواب امن، استحکام اور دیرپا سیارے کے حوالے سے تھا تا کہ ہم ان اصولوں کو اپنے بچوں کو منتقل کرسکیں جن کی ہم بے حد قدر کرتے ہیں۔

اوران ہی بچوں میں سے ایک نے حال ہی میں ہم انسانوں کے پیدا کردہ مسائل اوران کے حل کی جڑ دریافت کی تھی۔ سائر ایلن ہیرک نے ۲۰۰۶ء میں اپنے ہائی اسکول ہارٹس بروک ہیڈ لے میساچوسٹس میں منعقدہ تقریب تقسیم اسناد میں میرا خطاب سنا تھا۔اس کے اگلے سال اس نے مجھے یہ مضمون لکھا تھا۔

> میں نے پوری دنیا کو اپنی دوسری جماعت میں ایک کاغذ پر بنے نقشے پر دیکھا تھا۔سمندر نیلا تھا اور تمام ممالک پیلے، ہرے اور گلابی رنگ کے تھے۔اس طرح سے اپنی دنیا کو دیکھنے سے لوگوں کا ایک خاص تصور وجود میں آ گیا تھا۔
>
> صرف ایک بار میں دنیا کو کسی کے بھی زاویے سے آزاد ہو کر اپنے انداز میں دیکھنا چاہتی ہوں بالکل اپنے جیسے خلائی سیارے کی کھڑکی سے دیکھنے پر ایک اندھیری خلا میں لٹکتے بیضوی انڈے کی طرح میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ تمام سرحدیں اور نام ہم نے نقشے پر خود تحریر کیے ہیں تاکہ مجھے احساس ہو سکے کہ یہ تمام سرحدیں انسان کی تشکیل کردہ ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں جبکہ ہم یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ اس سیارے پر ہم کتنے متحد ہیں۔
>
> ہمیں جو کچھ بھی سچ بتا کر دکھایا سنایا گیا ہے وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا لیکن اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ دنیا کی مستقل تبدیل ہوتی آبادی ان بنیادی تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ان کو ان کی اصل صورت میں پہچانیں اور ہم پر ان کے مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھیں اور اس کے بعد ہم وہ فیصلے کر سکتے ہیں جو ہماری آنے والی نسلوں کی بقاء کے لئے ضروری ہیں۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم وہ ضروری اقدام کریں۔ ہمارے پاس وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو اس نئے خواب کو سچ میں بدلنے کے لئے ضروری ہیں۔تمام وسائل، رابطے اور نظام وجود میں آ چکے ہیں اور حالیہ چند سال میں ہمیں یہ بھی احساس ہو گیا ہے کہ ہم میں یہ سب بدلنے کی خواہش بھی موجود ہے اور میرے اور آپ کے پاس اس کے لئے ضروری آلات بھی موجود ہیں۔

پور ہمیں آج ہی اس دنیا کو واقعی صحیح معنوں میں بدلنے کا عمل شروع کرنا ہوگا۔

جان پرکنز ایک غریب پر یپ اسکول ٹیچر کے گھر پیدا ہوا۔ جو کہ فطری طور پر ایک غصیلی طبیعت کا فرد ہے اور اُس کا غصہ ہی معاشی غارت گر جیسی سفاک ملازمت کا باعث بنا۔ وہ اپنی تحریر کے آئینے میں اپنے آپ کو ایک سچے اور وفادار امریکی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ جان پرکنز نے اپنی پہلی کتاب ''معاشی تباں کار کے اعترافات'' سے شہرت حاصل کی۔

اُس نے اپنی کتاب میں امریکہ کی کارپریٹوکریسی کی بین الاقوامی سطح پر لوٹ کھسوٹ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کی دوسری کتاب بھی اسی قسم کے واقعات سے مزین ہے۔ ایک معاشی غارت گر کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کرنے کی غلطی کا احساس ہونے کے بعد اس نے Dream Chenge اور The Pachamama Alliance جیسی غیر منافع بخش تنظیموں کی بنیاد رکھی، اور اپنے آپ کو لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کیلئے وقف کیا، تاکہ دنیا میں نئی نسل کا مستقبل تابناک، پرامن اور مستحکم ہو سکے۔ پرکنز اپنی اسی سوچ کو عام کرنے کیلئے چار براعظموں کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں لیکچر دے چکا ہے۔